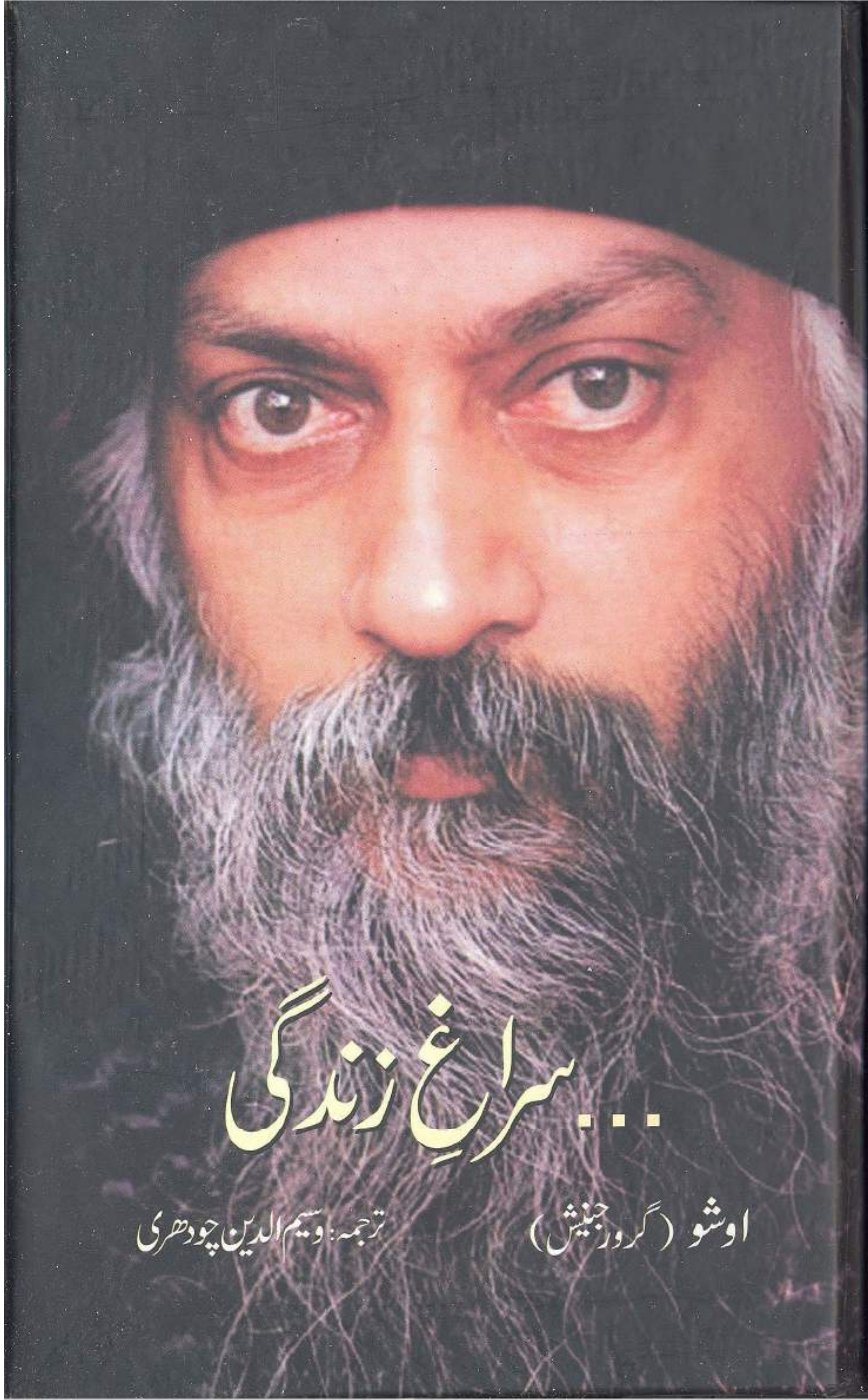


...سراغِ زندگی

اوشو (گرورجنیش)
ترجمہ: وسیم الدین چودھری

...سراغِ زندگی

اوشو (گرورجنیش)

اس کتاب کے بارے میں

☆ جب ہم مرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟

☆ مرنے کے بعد کی زندگی واہمہ ہے یا حقیقت؟

☆ کیا ہماری روحیں دو زندگیوں کے درمیان آوارہ پھرتی ہیں؟

☆ ہم دوسرا جنم کیوں اور کیسے لینا چاہتے ہیں؟

یہ ان چند سوالات میں سے چند ہیں جو استغراق کے ایک عمل کے دوران گجرات' انڈیا کی دور افتادہ چٹانوں میں کیے گئے۔ موضوعِ زیرِ بحث موت ہے' اور انسانی زندگیوں پر اس خوف کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں' ان مشقوں کا منتظم ہمارے وقت کا نہایت بااثر روحانی عامل ہے۔

زیرِ نظر کتاب: *AND NOW, AND HERE* (......سراغِ زندگی) قاری کو اوشو کی عملی سرگرمیوں کے براہِ راست مشاہدہ کا موقعہ دیتی ہے۔ اوشو موت کے بعد اس کے لیے ہمیں اپنے عقائد کا از سرِ نو جائزہ لینے کے لیے کہتا ہے' اور ہمارے تحت الشعور میں دبے ہوئے موت کے خوف کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان صفحات میں وہ ہمیں ارتکازِ توجہ کے اپنے ذاتی تجربے کے ذریعے لافانی زندگی کے حصول کی طرف راغب کرتا ہے۔ تحت الشعور میں چھپے ہوئے اس خوف کا تریاق وہ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے برضا و رغبت موت قبول کرنے کو قرار دیتا ہے۔ اس مشق کے دوران وہ ان سوالوں کے براہِ راست جواب بھی دیتا ہے جو موت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہوتے ہیں۔

"اوشو کے روبرو بیٹھنا یقیناً ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔ دورانِ تقریر اس کا لب ولہجہ اور روح میں اترتی ہوئی اس کی آنکھوں نے لوگوں کو کئی بار یہ تاثر دیا کہ وہ براہِ راست ہمارے اندر دیکھ رہا ہے۔ سوالوں کے جوابات اور ہر قسم کے مسائل پر اس کی رائے زنی بعض اوقات حیرت انگیز حد تک موضوع کا احاطہ کرتی تھی' اور اس میں بلا کا اعتماد ہوتا تھا"

Guy Claxton, author of Noises from the Darkroom.

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور
E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430

......سراغِ زندگی!

اوشو (گرو رجنیش)

ترجمہ: وسیم الدین چودھری

فکشن ہاؤس
بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
Ph: 042- 37249218, 37237430
E-mail:fictionhouse2004@hotmail.com

نام کتاب	:	......سراغِ زندگی
مصنف	:	اوشو (گرور جنیش)
ترجمہ	:	وسیم الدین چودھری
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	عباس
اشاعت	:	2010ء
قیمت	:	-/250 روپے

ہیڈ آفس : بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

سب آفس حیدر آباد: 52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدر آباد

فون: 022-2780608

فہرست

عرضِ مترجم

زیرِ نظر کتاب کا موضوع پاکستان کے مخصوص سماجی حالات سے مطابقت نہ رکھنے کے باوجود بعض مخصوص حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ہندو مذہب کے خصوصی رجحانات میں آواگون کو ایک اہم مقام حاصل ہے، گیان دھیان، استغراق، ارتکازِ توجہ، ہاپناٹزم، خود تنویمی وغیرہ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں شمار کی جاتی ہیں اور ان سب موضوعات پر فاضل مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے جو دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید معلومات اور عملی اقدامات کے لیے رہنمائی کا باعث ہوں گے۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ترجمے میں کسی قسم کی غلطیوں کی موجودگی کو مترجم کی کم علمی پر محمول کیا جائے۔

شکریہ!

وسیم الدین چودھری

کچھ مصنف کے بارے میں

ہم میں سے اکثر لوگ گذرے وقت کی یادوں اور آنے والے وقت سے توقعات کے ساتھ اپنی زندگی گذارتے ہیں..... شاید ہی کبھی ہم میں سے کسی کو لمحۂ موجود کے لامحدود امکانات پر غور کرنے کی مہلت مل پاتی ہو بدلتے ہوئے موسموں کی سحر انگیزی' ناگہانی حادثات' محبوب سے ملاقات یا غیر متوقع تبدیلیوں پر خوش گوار حیرت کے لمحات۔ کم لوگ وقت اور خیالات کی دنیا سے آزاد ہو کر عزم و ہمت کے ساتھ اس لمحے کی وسعتوں سے نبرد آزما ہونے کی جرأت کر پاتے ہیں۔ اور معدودے چند لوگ ہی اپنے تجربات دنیا کے سامنے پیش کر پائے' لاؤزو' گوتم بدھ' بودھی دھرما' اور ماضی قریب کے جارج گردجیف' رمانا مہارشی' جے کرشنا مورتی وغیرہ۔ ان لوگوں کو بھی ان کے ہم عصروں نے کھسکا ہوا یا پاگل قرار دیا' اور اپنی وفات کے بعد یہ لوگ فلسفی کے نام سے جانے گئے' لیکن وقت نے حکایتوں کے روپ میں ان کو لافانی قرار دیا' ان کے تجربات گوشت پوست کے انسانی تصور کے برعکس' ہماری اجتماعی دیومالائی خواہشات کے عین مطابق' ہمیں معمولی حیثیت سے بلند تر اور روزمرہ زندگی کی بے معنویت سے بے بہرہ کرتے ہیں۔

اوشو نے بقول خود وہ دروازہ دریافت کیا ہے جس میں داخل ہو کر حال کی لامحدود وسعتوں میں زندگی گذاری جا سکتی ہے۔ وہ خود کو مکمل وجودیت پرستی کا علمبردار قرار دیتا ہے' اور دوسروں میں بھی اس آگہی کا شعور بیدار کرنے کے لیے خود کو وقف کر چکا ہے تاکہ ماضی اور مستقبل سے لاتعلق ہو کر سب لوگ اپنے لیے لامحدود' لامتناہی زندگی حاصل کر لیں۔

اوشو گیارہ دسمبر 1931ء کو کچواڑہ' مدھیہ پردیش' انڈیا میں پیدا ہوا' وہ اپنے بچپن کے ابتدائی ایام سے ہی انقلابی ذہنیت کا حامل تھا' وہ حقائق کی تلاش میں رائج دوسروں کے نظریات کو

ماننے کے برعکس اپنے تجربات کی روشنی میں نظریات قائم کرنے کا خواہاں رہا۔

اکیس سال کی عمر میں آگہی کی روشنی حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور کئی سال تک جبلپور یونیورسٹی میں فلسفے کی تعلیم دیتا رہا۔ اسی دوران وہ پورے ہندوستان میں گھوم پھر کر اپنے افکار عام کرتا اور بنیاد پرست مذہبی شخصیات کو چیلنج کر کے ان کے ساتھ کھلے مناظرے کرتا رہا، وہ مذہبی عقائد کے بارے میں سوالات کر کے ان کے رد میں تقاریر کرتا، اس سلسلے میں وہ ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی کرتا رہا۔ اپنے ہم عصروں کی نفسیات اور عقائد کے موثر جوابات دینے کے لیے اس نے گہرا مطالعہ کیا۔ 1960ء کے اواخر میں اوشو نے اپنے منفرد نوعیت کے عملِ استغراق کی ابتدا کی۔ اس کا کہنا ہے کہ آج کا انسان دورِ حاضر میں ماضی کے فرسودہ نظریات اور دورِ جدید کی طرزِ زندگی کے باعث ہونے والے ذہنی دباؤ سے آزاد ہو کر خیالات کی پیچیدگیوں سے نجات اور بے فکری کی امید کر سکتا ہے۔

اپنے کام کے دوران اوشو نے انسان میں شعور و آگہی کی بیداری کے تقریباً تمام ہی نکات پر بات کی ہے۔ اس نے نہایت نفاست کے ساتھ اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں عصرِ حاضر کے انسان کے لیے ضروری طرزِ عمل کی نشان دہی کی ہے۔

وہ کسی پرانے طرزِ فکر کے برعکس بالکل نئے مذہبی نظریات کا دعویدار ہونے کے باعث خود کہتا ہے "مجھے ماضی کے کسی دور سے منسوب مت کریں، پرانے دور کی کسی بات کا ذکر کرنا قطعی بے معنی ہے"

پوری دنیا میں اس کی اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں سے گفتگو چھ سو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اور کم و بیش دنیا کی تقریباً 30 زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا پیغام کوئی نظریہ یا فلسفہ نہیں "میرا پیغام ایک کیمیا، تبدیلی کی ایک سائنس ہے، لہٰذا جو لوگ اسی حالت میں مر کر ایک مکمل تبدیل شدہ حالت میں پیدا ہونے کے خواہش مند ہوں، جس کا وہ فی الحال تصور بھی نہیں کر سکتے، صرف وہی باہمت لوگ میری بات سننے پر آمادہ ہو سکیں گے، کیونکہ میری باتیں سننا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔

میری باتیں سننے سے آپ نے حیاتِ نو کے حصول کی طرف پہلا قدم تو اٹھا دیا ہے۔ لیکن یہ کسی فلسفہ کا کوئی ایسا اوور کوٹ نہیں ہے جس کو پہن کر آپ سب سے ممتاز حیثیت حاصل

کر لیں۔ نا ہی یہ کوئی نظریہ ہے جس کے تحت آپ پریشان کن سوالات سے بچ سکیں۔ نہیں! میری باتیں صرف زبانی ہدایتیں نہیں، یہ آپ کے لیے کہیں زیادہ خطرے کا باعث بن سکتی ہیں! یہ مر کر دوبارہ زندہ ہونے سے کسی صورت کم نہیں ہیں"

اوشو کی وفات 19 جنوری 1990ء کو ہوئی، ہندوستان میں اس کی طویل و عریض روحانی تربیت گاہ آج بھی دنیا بھر سے آنے والے ہزاروں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے جہاں لوگ استغراق، مختلف قسم کی مشقوں اور عملی پروگراموں میں حصہ لینے یا محض گوتم بدھ کی طرزِ تعلیم کا مشاہدہ کرنے کے لیے مستقل طور پر آتے رہتے ہیں۔

☆

......سراغِ زندگی!

پہلا باب

موت سے بڑا کوئی جھوٹ نہیں

میرے عزیزو!

انسان کو اپنی کھوج کے نتیجے میں کچھ جان کر تسلی ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح جو آگہی اسے حاصل ہوتی ہے اس کی بنیاد پر وہ اس کے در پردہ اسرار و رموز جان لیتا ہے اور نتیجتاً اس پر اسے دستگاہ حاصل ہو جاتی ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ناواقفیت پر ہوتا ہے' ناکامی اندھیرے کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن جب روشنی ہو تو ناکامی ممکن نہیں ہوتی ہے۔ روشنی خود کامیابی کی علامت بن جاتی ہے۔

موت کے بارے میں ایک بات جو میں بطورِ خاص بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ موت سے بڑا کوئی فریب نہیں' اس کے باوجود موت ایک ازلی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ ایک حقیقت محسوس ہوتی ہے ...... بظاہر یہ زندگی کا بنیادی سچ ہے...... لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمام زندگی بحیثیت مجموعی موت کے گھیرے میں ہے۔ ہم خواہ اس کو فراموش کر دیں یا ہر وقت ذہن پر مسلط رکھیں' ہر حال میں موت ہمارے بہت نزدیک رہتی ہے۔ یہ ہمارے اتنے نزدیک رہتی ہے جتنا نزدیک ہم سے ہمارا سایہ' بلکہ سائے سے بھی نزدیک تر۔

خواہ ہم نے اپنی زندگی کی ترتیب موت کے خوف سے آزاد رہ کر ہی کیوں نہ بنائی ہو لیکن یہ موت کا خوف ہی ہے جو ہمارے معاشرے' وطن' خاندان اور دوستوں کے قیام کا سبب ہوتا ہے۔ یہ موت کا ہی خوف ہے جو ہمیں حصولِ زر کے لیے اکساتا ہے اور جو معاشرے میں ہمیں اعلیٰ رتبہ حاصل کرنے کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تعجب خیز حقیقت یہ ہے

کہ ہمارے دیوتا اور ہماری عبادت گاہ و معبد کے قیام کا سبب بھی یہی موت کا خوف ہے۔ یہ موت ہی ہے جس کی وجہ سے لوگ گھٹنوں کے بل جھک کر دعائیں مانگتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر آسمان کی طرف پھیلا دینے والے بھی تو آخر موت سے ہی ڈرتے ہیں' جبکہ موت سے زیادہ جھوٹی بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے موت کو صحیح سمجھتے ہوئے جو بھی نظام حیات بنایا ہے وہ غلط ثابت ہو گیا ہے۔

ہمارے پاس کونسی کسوٹی ہے جس سے ہم معلوم کریں کہ موت کا تصور غلط کیوں ہے؟ ہم کو کیسے علم ہو کہ موت کا کوئی وجود نہیں ہے' یہ جاننا اس لیے بہت ضروری ہے کہ جب تک ہم اس کی حقیقت تک نہیں پہنچیں گے ہمارے اوپر سے موت کا خوف زائل نہیں ہوگا۔ جب تک ہمیں موت کے مفروضے کا صحیح علم نہیں ہوگا تب تک ہماری زندگیاں بھی غلط اور غیر حقیقی ہی رہیں گی۔ جب تک موت کا خوف غالب رہے گا ہماری زندگیاں حقیقت کا روپ نہیں دھار سکیں گی۔ جب تک ہم موت کے خوف سے کانپتے لرزتے رہیں گے اُس وقت تک ممکن نہیں کہ ہم اپنی حقیقی زندگی کا ادراک کر سکیں۔ صرف وہی لوگ زندہ رہنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں جن کے ذہنوں سے موت کے سائے ہمیشہ کے لیے محو ہو چکے ہوں۔ ایک خوفزدہ اور لرزیدہ ذہن کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ جب موت کا سایہ ہر لحظہ ہماری طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوگا تو ہماری زندگی کا وجود کیا معنی؟ ہم کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟

اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم موت سے کس درجہ بے خبر ہیں کیونکہ اسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے مُردوں کے مدفن خواہ اپنی آبادیوں سے کتنے ہی فاصلے پر بنالیں اس کے باوجود موت اپنے درشن کراتی ہی رہے گی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی موت سے ہمکنار ہوتا ہے' ہر روز کہیں نہ کہیں موت واقع ہوتی ہے اور ہماری زندگی کی بنیادوں کو ہلاتی رہتی ہے۔

جب ہم کہیں موت واقع ہوتے دیکھ پاتے ہیں تو ہمیں اپنی موت کا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ جب ہم کسی کی موت پر آنسو بہاتے ہیں تو وہ آنسو صرف اس شخص کی موت پر نہیں بہہ رہے ہوتے بلکہ اُس پیغام کے نتیجے میں بہتے ہیں جو ہم کو ہمارے انجام سے باخبر کرتا ہے۔ ہمارے صدمات کسی کی موت کی تکلیف کے سبب نہیں بلکہ خود ہماری موت کے واضح امکان کے سبب سے ہوتے ہیں۔ کسی کی موت بیک وقت خود ہماری موت بھی ہوتی ہے۔ اور جب تک ہم

چاروں طرف سے موت کے تصور میں گھرے رہیں گے' ہم زندہ کیسے رہ سکتے ہیں؟ اس طرح زندہ رہنا ناممکن رہے گا۔ اس طرح ہم زندگی کا نہ صرف ادراک نہیں کر سکیں گے بلکہ اس سے وابستہ خوشیاں' اس کی خوبصورتی حتیٰ کہ اس کی بخششوں اور عطیات تک سے لاعلم رہیں گے۔ ہم خدا کے آشرم تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے جو کہ زندگی کا سب سے عظیم سچ ہے۔

وہ معابد جو موت کے خوف کے نتیجے میں تعمیر ہوئے ہیں وہ خدا کے معابد نہیں۔ وہ دعائیں جو اس خوف کے سبب مانگی جاتی ہیں ان کی نسبت بھی خدا کی طرف نہیں ہوتی۔ صرف وہی ان معابد میں جانے کے حقدار ہیں جو زندگی کی حقیقی مسرتوں سے آگاہ ہیں۔ خدا کی کائنات خوشیوں مسرتوں اور دلکشی سے لبریز ہے اور اس کے معبد کی گھنٹیاں صرف ان لوگوں کے لیے بجتی ہیں جو ہر قسم کے خوف سے آزاد ہوں' ان لوگوں کے لیے جن پر خوف اپنا کوئی اثر نہیں رکھتا۔

چونکہ ہم خوف میں مبتلا رہنا پسند کرتے ہیں اس لیے یہ ہم کو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ ممکن نہیں: دونوں میں سے صرف ایک ہی ازلی حقیقت ہو سکتی ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اگر زندگی سچ ہے تو یقیناً موت اس کے برعکس ہوگی' لیکن اگر موت حق ہے تو پھر زندگی سوائے ایک خواب' ایک فریب کے علاوہ کچھ نہیں۔ دو متضاد کیفیات یقیناً یکجا نہیں ہو سکتیں اور ہم ہیں کہ دونوں کو ایک ساتھ رکھنے پر بضد رہتے ہیں۔ ایک طرف ہم اس احساس میں مبتلا ہیں کہ ہم زندہ ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہ ہم مردہ ہیں۔

ایک درویش کے بارے میں میں نے سنا جو ایک دور دراز وادی میں رہتا تھا۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس اپنی الجھنیں لے کر آتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے اس سے سوال کیا کہ موت اور زندگی کے بارے میں کچھ فرمائیں۔ درویش کا جواب کچھ یوں تھا: "اگر تم زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہو تو میرے دروازے تم پر کھلے ہوئے ہیں' اور اگر تم کو موت کے بارے میں کچھ جاننا ہے تو کہیں اور جاؤ کیونکہ میں نہ کبھی مرا ہوں اور نہ ہی مروں گا۔ مجھے موت کا کوئی تجربہ نہیں۔ اگر تم کو موت کے بارے میں آگہی درکار ہے تو کسی ایسے کے پاس جاؤ جو پہلے مر چکا ہو" پھر ہنستے ہوئے کہا" مگر جو لوگ مر چکے ہوں ان سے تم کیسے معلوم کر سکو گے؟ اور اگر تم مجھ سے کسی مرے ہوئے کا پتہ معلوم کرنا چاہو تو یہ میں نہیں کر سکتا' کیونکہ جب سے مجھے آگہی ملی ہے کہ میں مر نہیں سکتا تب ہی سے مجھے یہ علم بھی ہو گیا کہ نہ صرف کوئی مر نہیں سکتا بلکہ کبھی کوئی مرا ہی نہیں"

مگر ہم اس درویش کا یقین کیسے کریں؟ ہم ہر روز کسی نہ کسی کو مرتا ہوئے دیکھتے ہیں' روزانہ ہی موت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ موت ایک ازلی حقیقت ہے اور واضح طور پر ہمارے وجود کے مرکز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آپ اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہیں' خواہ موت آپ سے سنی ہی دور کیوں نہ ہو اس کے باوجود یہ بہت واضح ہوتی ہے۔ ہم اس سے کتنا ہی فرار حاصل کرنا چاہیں' اس سے کتنا ہی دور بھاگیں اس کے باوجود یہ ہم کو گھیرے رہتی ہے۔ اس روشن حقیقت کو آپ کیسے جھٹلا سکتے ہیں؟

کچھ لوگ یقیناً اس کو جھٹلانے کی کوشش بھی کرتے ہیں' موت کے خوف کی وجہ سے وہ روح کو زندہ و جاوید تسلیم کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں...... صرف خوف کے سبب! وہ جانتے یقیناً نہیں ہیں لیکن یقین رکھتے ہیں۔ ہر روز صبح سویرے لوگ عبادت گاہوں میں بیٹھ کر دہراتے رہتے ہیں "فنا کسی کو نہیں' روح دائمی ہے" اس نوع کا عقیدہ رکھنے والے غلطی پر ہیں کہ محض یہ دہراتے رہنے سے ان کی روح حیاتِ دائمی کی حامل ہو جائے گی۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ الفاظ دہراتے رہنے سے وہ موت کی حقیقت کو غلط ثابت کر دیں گے۔ اس نوع کی تکرار کبھی موت کو جھٹلا نہیں سکتی۔ البتہ صرف آگہی کے ذریعے یہ ممکن ہے۔

موت کو بالتکرار جھٹلاتے رہنے سے ہم موت سے بچ نہیں سکتے۔ موت اپنی پہچان کراتی رہے گی' وہ اپنا حملہ جاری رکھے گی' وہ بہر حال باقی رہے گی۔ ہمیں اپنے آپ کو اس کی عادت ڈالنی ہوگی۔ اس کے برعکس ہم اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس کو کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ جب ہم موت کو دیکھتے ہیں تو ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جب کوئی جنازہ گذر رہا ہوتا ہے تو ایک ماں اپنے بچے کو گھر میں بند کر لیتی ہے اور کہتی ہے "باہر مت جاؤ' کوئی مر گیا ہے" قبرستان قصبات سے اتنے فاصلے پر بنائے جاتے ہیں کہ وہ ہماری نظروں کے سامنے نہ رہیں اور موت ہمیں ہر دم خوف میں مبتلا نہ رکھ سکے۔ یہاں تک کہ اگر آپ کسی کے سامنے موت کا ذکر بھی کریں گے تو وہ آپ کو اس بارے میں زبان کھولنے سے منع کرے گا۔

ایک بار میں ایک سنیاسی کے یہاں ٹھہرا۔ وہ روزانہ ہی روح کے لافانی ہونے پر گفتگو کرتا رہتا تھا۔ آخر کار ایک روز میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم کو احساس ہے کہ تم ہر لحظہ موت

کے نزدیک تر ہوتے جا رہے ہو؟

اس نے کہا: "ایسی خوفناک بات مت کریں۔ ایسے موضوع پر بات کرنا ٹھیک نہیں ہے

میں نے کہا کہ جب ایک آدمی ایک طرف تو یہ کہتا ہو کہ روح لافانی ہے اور ساتھ ہی موت کے تذکرے کو خوفناک بھی کہتا ہو تو یہ صورت تو تمام دعووں کی نفی کرے گی۔ اس پر تو لازم ہوگا کہ وہ ہر خطرے سے بے خوف ہو' کسی قسم کے آسیب وغیرہ کے دباؤ سے آزاد ہو' موت کے بارے میں بات کرنے میں آخر کیا خطرہ ہے؟...... جبکہ اس کے نزدیک موت کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ کہنے لگا کہ بیشک روح لازوال ہے پھر بھی میں موت کے بارے میں ہرگز بات نہیں کرنا چاہتا۔ کسی کو ایسی بے معنی اور خوفزدہ کرنے والی گفتگو نہیں کرنی چاہئے" اور ہم سب یہی کر رہے ہیں' موت سے منہ موڑے اس سے فرار حاصل کرنے کی خواہش ہمارے دل میں ہوتی ہے۔

میں نے سنا ہے کہ ایک بار ایک شخص ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔ وہ گاؤں کے ایک ویران راستے پر تنہا جا رہا تھا۔ وہ خوف سے بچنے کے لیے قدرے تیز چل رہا تھا۔ اگر کوئی دوسرا وہاں موجود ہوتو بھی اس کا خوفزدہ ہونا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کوئی اور وہاں موجود نہ ہوتو ڈر کی کیا بات ہو سکتی ہے؟ لیکن ہم تنہائی میں خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ دراصل ہم خود اپنے آپ سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور جب ہم تنہا ہوں تو یہ خوف مزید بڑھ جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس سے ہم خود سے بڑھ کر خوفزدہ ہوں۔ ہم دوسروں کے درمیان رہ کر نسبتاً کم خوفزدہ ہوتے ہیں اور جب تنہا رہ جاتے ہیں تو ہم پر خوف غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

وہ شخص تنہا تھا۔ وہ ڈر کی وجہ سے بھاگنے لگا۔ شام کا وقت تھا ...... ہر چیز ساکن اور خاموش تھی...... دور دور تک کوئی اور موجود نہیں تھا۔ جب اس نے تیز دوڑنا شروع کیا تو اسے محسوس ہوا کا کوئی تیز قدموں اس کے پیچھے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے...... اس کا خوف مزید بڑھ گیا۔ خوف کے اس عالم میں اس نے کن انکھیوں سے پیچھے کی طرف جھانکا۔ اس نے ایک سایہ اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ سایہ خود اس کا اپنا تھا۔ مگر یہ سوچ کر کہ ایک سایہ اس کے تعاقب میں ہے اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اس کے بعد وہ شخص کہیں رک نہ سکا۔ وہ اپنی رفتار جتنی تیز کرتا' اس کا سایہ اسی رفتار سے اس کے پیچھے آتا ہوا محسوس ہوتا یہاں تک کہ وہ پاگل ہو گیا۔ مگر ایسے لوگ بھی ہیں جو پاگلوں کو احتراماً پوجتے ہیں۔

جب گاؤں والوں نے اس کو اس طرح دوڑتے دیکھا تو باور کیا کہ وہ کسی سخت تپسیا میں مصروف ہے۔ حالانکہ رات کی تاریکی میں اس کا سایہ غائب ہو جاتا مگر وہ رکتا نہیں' دن کا اجالا پھیلتے ہی پھر دوڑنا شروع کر دیتا۔ اس کے حساب سے رات کے آرام کے دوران اس سائے نے وہ فاصلہ طے کر کے اس کو دوبارہ پکڑ لیا ہے' یہ خیال آنے کے بعد اس نے رات میں آرام کرنا بھی چھوڑ دیا۔

پھر وہ مکمل طور پر پاگل ہو گیا؛ کھانا پینا بھی ترک کر دیا۔ ہزاروں لوگ اسے دیکھتے اور اس پر پھول نچھاور کرتے' کوئی اسے روٹی پیش کرتا کوئی پانی۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے احترام اور عقیدت بڑھتی گئی۔ لیکن وہ شخص دن بہ دن اپنی ذہنی اور جسمانی حالت میں خراب اور خستہ ہوتا گیا آخر کار ایک دن جان سے گذر گیا۔ جس جگہ وہ مرا تھا گاؤں کے لوگوں نے اسی جگہ ایک درخت کے سائے تلے اس کی قبر بنا دی اور ایک درویش سے دریافت کیا کہ وہ اس کی قبر کے کتبے پر کیا لکھوائیں؟ اس درویش نے اس پر لکھنے کے لیے ایک جملہ تجویز کیا۔

کسی جگہ...... کسی گاؤں میں وہ قبر اب بھی موجود ہے۔ ممکن ہے آپ کا گذر بھی اس پر سے ہوا ہو...... اس کے کتبے کے لیے درویش کی تجویز کردہ تحریر آپ بھی پڑھیے:

"یہاں وہ شخص آرام کر رہا ہے جو اپنے سائے سے جدا ہو گیا۔ اس نے اپنی تمام زندگی ایک سائے سے فرار حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ اس کو اتنا بھی علم نہیں تھا جتنا اس کے قبر کے پتھر کو ہے۔ وہ چونکہ خود سائے میں ہے اور اس کا کوئی سایہ نہیں اس لیے وہ بھاگ بھی نہیں رہا"

بھاگتے تو ہم بھی ہیں۔ اور ہم کو سوچنا چاہئے کہ کوئی اپنے سائے سے کہاں اور کیسے بھاگ سکتا ہے' اس کے باوجود ہم سایوں سے بھاگتے ہیں۔ اور جس سے ہم بھاگتے ہیں وہ فوراً ہمارا تعاقب شروع کر دیتا ہے۔ ہم جتنا تیز دوڑتے ہیں وہ بھی اپنی رفتار اتنی ہی تیز کر دیتا ہے...... کیونکہ وہ ہمارا ہی سایہ ہے۔

موت بھی ہمارا سایہ ہے۔ اگر ہم اس سے بھاگتے رہیں گے تو اس کے آگے نہ صرف ڈٹ کر کھڑے نہیں ہو سکیں گے بلکہ یہ بھی نہیں جان سکیں گے کہ وہ ہے کیا؟ اگر وہ شخص بھی رک کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ وہ کس سے بھاگ رہا ہے تو شاید خود پر ہی ہنستا اور کہتا کہ میں بھی کیسا آدمی ہوں کہ محض ایک سائے سے ڈر کر بھاگ رہا ہوں؟ نہ کوئی شخص اپنے سائے سے فرار حاصل کر سکتا

ہے اور نہ اس پر قابو پا سکتا ہے۔ بہر حال اس کا مطلب یہ نہیں کہ سایہ ہم سے زیادہ قوی ہے' اور یہ کہ ہم اس پر قابو پا ہی نہیں سکتے بلکہ اس بات کا واضح الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ جب سائے کا اپنا کوئی وجود نہیں تو فتح و شکست کا کیا سوال؟ یہ سبب ہے کہ لوگ موت سے شکست کھا جاتے ہیں...... یہ حقیقت ہے کہ موت زندگی کا سایہ ہے۔

زندگی جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے' سایہ بھی اس کے ساتھ ہی بڑھتا جاتا ہے۔ موت دراصل زندگی کی پرچھائیں ہے جو ہمیشہ زندگی کے پیچھے رہتی ہے۔ اور ہم کبھی مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ وہ کیا ہے۔ اس دوڑ میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بھاگتے بھاگتے اکثر تھک کر گر جاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اس جگہ ہم پہلی بار پہنچے ہوں' آپ پہلے بھی اس مقام پر آ چکے ہوں گے' اس مخصوص جگہ نہ سہی اس جیسی کسی اور جگہ کسی اور ساحل پر۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جسم کے ساتھ نہ ہوں کسی اور جسم میں ہوں' بہر حال مقابلہ اسی دوڑ کا ایک تسلسل ہے۔

موت کے اسی خوف میں مبتلا رہتے ہوئے ہم نے کتنی ہی زندگیاں گذار دیں' لیکن نہ صرف ہم اس کو دیکھ نہیں پائے بلکہ پہچانتے بھی نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ خوف میں مبتلا رہنے کی وجہ سے جب ہمارا سامنا موت سے ہوتا ہے تو ہم حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ عموماً جب وہ لمحہ آتا ہے تو کوئی بھی اپنے حواس میں نہیں رہ پاتا۔ اگر صرف ایک بار کوئی موت کے لمحے میں اپنے حواس بحال رکھ سکے تو اس پر سے موت کا خوف ہمیشہ کے لیے رفع ہو جائے۔ اگر کوئی صرف ایک بار یہ دیکھ سکے کہ اصل میں موت کیا ہے' موت میں کیا ہوتا ہے؟ اس کے بعد آئندہ کے لیے اس پر موت کا خوف باقی نہیں رہے گا' کیونکہ پھر ڈرنے کے لیے موت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ یہ نہیں کہ اس طرح ہم موت پر فتح حاصل کر لیں گے...... نہیں بلکہ ہم انہی اشیاء پر قابو پا سکتے ہیں' جو حقیقت میں وجود رکھتی ہوں۔ صرف موت سے آگہی اس کی فنا کا باعث بن جائے گی۔ پھر کیا بچے گا جس پر فتح پانا ممکن ہو سکے؟

ہم اس سے پہلے بھی کئی بار موت سے دوچار ہو چکے ہیں' لیکن ہوا یہ ہے کہ جب بھی وہ ہم پر حاوی ہوتی ہے ہم اپنے حواس میں نہیں رہ پاتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی آپریشن سے قبل ہمیں بے ہوش کر دیا جاتا ہے اور ہم کو آپریشن سے ہونے والی تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہم موت سے اس قدر خائف رہتے ہیں کہ جب اس سے سامنا ہوتا ہے تو ہم دانستہ بے ہوش

ہو جاتے ہیں۔ موت سے چند لمحات پہلے ہم پر بیہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ ہم بے ہوشی کی حالت میں مر جاتے ہیں اور پھر بے ہوشی کی حالت میں ہی دوبارہ پیدا ہوتے ہیں۔ نہ ہم موت کو دیکھ پاتے ہیں اور نا ہی دوبارہ اپنی پیدائش کو۔ نتیجے کے طور پر ہم نہیں جان پاتے کہ زندگی دائمی ہے۔ موت وحیات اس لحظہ کے مثل ہے جب ہم دورانِ سفر اپنا لباس اور گھوڑے تبدیل کرنے کے لیے کہیں رک جاتے ہیں۔

پرانے زمانے میں جب سفری سہولیات کے لیے ریل گاڑیاں میسر نہیں تھیں' اس وقت لوگ گھوڑا گاڑیوں میں سفر کیا کرتے تھے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ہوئے جب گھوڑے تھک جاتے تو کچھ مخصوص مقامات پر ان کو تازہ دم گھوڑوں سے تبدیل کر لیا جاتا تھا اسی طرح ہر اگلے پڑاؤ پر یہ تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ بہر نوع ایسا کرتے وقت لوگوں کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ بعینہٖ موت وحیات کے چکر کی طرح ہے کیونکہ اس طرح گھوڑے تبدیل کرتے وقت وہ مکمل ہوش وحواس میں ہوتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گھوڑ سوار نشہ کی حالت میں سفر کرتا' اس حالت میں جب وہ اپنے اطراف میں نظر ڈالتا اس کو ہر منظر حیرت میں مبتلا کر دیتا کہ اسے ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی۔ میں نے سنا ہے کہ ایک مرتبہ نشے کی حالت میں ایک گھڑ سوار نے کہا" کہیں ایسا تو نہیں کہ میں خود بھی تبدیل ہو گیا ہوں۔ ایسا لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی گھوڑا ہے جس کی پیٹھ پر بیٹھ کر میں نے سفر شروع کیا تھا۔ یا ایسا ہوا ہے کہ میں ایک مختلف آدمی ہو گیا ہوں؟

موت وحیات محض ایسے مقامات کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں گاڑیاں تبدیل کی جاتی ہیں۔ جہاں پرانی گاڑی چھوڑ دی جاتی ہے' جہاں تھکے ہوئے گھوڑے چھوڑ کر تازہ دم گھوڑے لیے جاتے ہیں۔ جب حیات وموت کی تمام کارروائی بے ہوشی کی حالت میں وقوع پذیر ہوتی ہو تو کوئی زندگی کو ہوش مندی سے کیسے گذار سکتا ہے۔ اس کا ہر عمل نیم بیہوشی' یا نیم خوابیدہ حالت میں ہوگا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ مختصراً یہ ہے کہ موت کو سمجھنے اور اس سے آگہی کے لیے' اس سے سامنا کرنا ضروری ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم موت سے ہم کنار ہوں' کوئی اس کو اسی وقت دیکھ سکتا ہے جب وہ مر رہا ہو۔ پھر کونسا راستہ باقی رہتا ہے؟ اگر کوئی موت کو اپنے مرنے کے وقت دیکھے گا تو اس کو سمجھنے کی مہلت اسے کیسے ملے گی؟' اس لیے کہ موت کے وقت انسان

پر سکرات کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

ہاں! البتہ ایک راستا ہے۔ ہم اپنی آزاد مرضی سے ارادتاً اپنی موت کا تجربہ کر سکتے ہیں اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ استغراق یا سمادھی اس تجربے کا ہی نام ہے۔ یوں رضا کارانہ طور پر موت اختیار کر لینے کو سمادھی' استغراق یا مراقبہ کہتے ہیں۔ ہمارے ڈھے جانے کی شکل میں یہ صورت ایک روز رونما ہونے والی ہی ہے...... ہم اپنی مرضی سے بھی ایسا کر سکتے ہیں اگر ہم اپنے اندر اپنے جسم اور اپنے آپ میں ایک فاصلہ قائم کر لیں۔ اس طرح اپنے اندر سے اپنے جسم کو علیحدہ کر کے موت واقع ہونے کا یہ تجربہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ ہم آج اور اسی شام بھی یہ تجربہ کر سکتے ہیں۔ موت واقع ہونے کے اس تجرباتی سفر کے ذریعے ہمارا جسم اور ہماری روح اس کیفیت سے آگاہ ہو سکیں گے جب کوئی سوار پرانی گاڑی چھوڑ کر دوسری گاڑی میں آگے روانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے سنا ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی مسلمان درویش شیخ فرید کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ: "سنا ہے کہ منصور کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے تو اس کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی یہ نا قابلِ یقین لگتا ہے' جبکہ ایک کانٹا بھی پاؤں میں چبھتا ہے تو تکلیف دیتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کٹنے سے تکلیف کیوں نہیں محسوس ہوگی؟ ایسا لگتا ہے کہ یہ سب مفروضہ حکایتیں ہیں۔ اس شخص نے مزید کہا کہ "یہ بھی سنتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا گیا تو انہیں بھی کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔ اور انہیں آخری دعائیہ کلمات ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔ خون میں نہائے ہوئے عریاں حالت میں' کیلوں سے بھری صلیب پر' ہاتھوں میں میخوں کے ذریعے ٹکے ہوئے حضرت عیسیٰ نے جو کچھ کہا وہ نا قابلِ یقین ہے"

حضرت عیسیٰ نے کہا: "ان لوگوں کو معاف کر دینا' انہیں نہیں معلوم یہ کیا کر رہے ہیں" یہ جملہ آپ نے بھی سنا ہوگا اور دنیا میں موجود عیسائیت پر یقین رکھنے والا ہر شخص اس کو بار بار دہراتا ہے۔ جملہ نہایت سادہ اور سلیس ہے: حضرت عیسیٰ نے کہا: "اے خدا ان لوگوں کو معاف کر دینا' انہیں نہیں معلوم کہ یہ کیا کر رہے ہیں" یہ جملہ پڑھتے ہوئے ہر آدمی بآسانی سمجھ لیتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا مطلب یہ تھا کہ وہ قابلِ رحم افراد نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک نا قابلِ یقین اوصاف کے حامل انسان کو قتل کرنے لگے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کا ہرگز یہ مطمحِ نظر نہیں تھا بلکہ وہ اصل میں کہہ رہے تھے کہ یہ ایک ایسے انسان کو قتل کر رہے ہیں جو مر نہیں سکتا۔ ان کو معاف کر دینا کہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا

کرر ہے ہیں۔ یہ ایک نا قابلِ عمل کوشش کر رہے ہیں۔ یہ قتل کرنا چاہتے ہیں جو قطعاً ممکن نہیں"

وہ شخص کہنے لگا: یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ ایک ایسا شخص جس کو قتل کیا جا رہا ہو وہ رحم دلی کا ایسا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ عملاً تو اس کو غصے میں بھر جانا چاہئے۔

شیخ فرید نے تحمل سے ایک قہقہہ لگایا اور کہا: "تم نے ایک اچھا سوال اٹھایا ہے' مگر میں اس کا جواب بعد میں دوں گا' پہلے مجھ پر ایک عنایت کریں" انہوں نے نزدیک پڑا ہوا ایک ناریل اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا اس کو ذرا احتیاط کے ساتھ اس طرح توڑ دیں کہ اس کی گری نہ ٹوٹنے پائے۔ چونکہ ناریل ابھی کچا تھا اس لیے اس نے کہا" معاف کیجئے' میں ایسا نہیں کرسکتا۔ ناریل بالکل کچا ہے اور میں اس کو توڑنا چاہوں تو لازم ہے کہ اس کی گری ٹوٹے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ شیخ نے پھر دوسرا ناریل دیا جو اچھی طرح پک چکا تھا' اور اس کو توڑنے کے لیے کہا؛" کیا تم اس کی گری سالم نکال سکتے ہو؟ وہ شخص بولا کہ ہاں اس کی گری ثابت نکالی جاسکتی ہے۔ شیخ نے کہا یہی تمھارے استفسار کا جواب ہے' کیا تم سمجھے؟

وہ شخص متحیر ہو کر کہنے لگا: میں کچھ نہیں سمجھ سکا کہ آپ کے جواب میں اور ناریل میں کیا ربط ہے۔ میرے سوال کا ناریل سے کیا رشتہ ہے؟ شیخ فرید نے کہا اچھا چلو اس ناریل کو بھی ایک طرف رکھو' اسے یا کسی اور چیز کو توڑنے کی ضرورت نہیں۔ میرا اشارہ اس طرف ہے کہ ایک ناریل میں گری اور چھلکا آپس میں جڑے ہوئے ہیں' اگر تم چھلکے پر ضرب لگاؤ گے تو لازماً گری بھی ٹوٹے گی۔ اس کے علاوہ ایک پکا ناریل ہے' اب تم بتاؤ کہ خشک ناریل اور کچے ناریل میں کیا فرق ہے؟ دونوں کے مابین ایک نہایت خفیف سا فرق ہے...... خشک ناریل کی گری سوکھ کر چھلکے سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ چھلکے اور گری کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب تم بھی جانتے ہو کہ چھلکا توڑنے کے باوجود اس کی گری سالم نکالی جاسکتی ہے۔ اسی میں تمھارے سوال کا جواب ہے۔

وہ شخص پھر بھی کچھ سمجھنے سے عاجز رہا تو شیخ فرید نے کہا کہ جاؤ...... مر جاؤ تا کہ تم سمجھ سکو...... اس کے بغیر تم میری بات نہیں سمجھ سکتے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس کے باوجود تم نہیں سمجھ سکو گے' اس لیے کہ مرتے وقت تم حواس کھو بیٹھو گے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ چھلکا اور گری ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں' مگر اس ساعت میں تم ہوش میں نہیں رہو گے۔ اگر تم کچھ سمجھنا چاہتے ہو تو ابھی سے سیکھنا شروع کردو کہ گری کو چھلکے سے علیحدہ کیسے کیا جائے؟ ابھی...... جب تک

کہ تم زندہ ہو"

اگر جسم کا چھلکا' اور ہوش مندی کی گری کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے تو اسی لمحے موت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ دونوں کے مابین فاصلہ پیدا کرنے سے تم یہ جان لو گے کہ چھلکا اور گری دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور یہ کہ چھلکا ٹوٹنے کے باوجود تم سلامت رہو گے...... اور یہ کہ تمھارے ٹوٹنے یا تمھارے مفقود ہو جانے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس حالت میں اگر موت بھی آ لے تو تمھارے اندر کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوگی۔ یہ تمھارے باہر نمودار ہوگی جس کا مطلب یہ ہے کہ 'تم نہیں ہو' والی کیفیت فنا ہو جائے گی اور یہ کہ 'تم ہو' والی کیفیت باقی رہ جائے گی۔

استغراق' مراقبہ' ارتکازِ توجہ یا سمادھی کا یہی آسان مفہوم ہے: اس طریقہ کار سے آگہی کی گری اور وجود کے چھلکے کو علیحدہ کیسے کیا جائے؟ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کا تصور اس لیے ممکن ہے کہ وہ دونوں درحقیقت ہیں بھی دو علیحدہ وجود۔ دونوں کو الگ الگ اسی لیے شناخت کیا جاسکتا ہے کہ وہ دونوں بہرحال علیحدہ حقیقتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ارتکاز کو رضا کارانہ طور پر فنا ہو جانے کا نام دیتا ہوں۔ اور جو انسان رضا کارانہ' حملہ آور اجل کو گلے لگاتا ہے اس پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا بھی ہے اور خود بھی فی نفسہٖ موجود ہوتا ہے۔

سقراط موت کے نزدیک تھا؛ آخری لمحات باقی تھے' اس کو ہلاک کرنے والا زہر تیار کیا جا رہا تھا اور وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ زہر تیار ہونے میں کتنا وقت باقی ہے' اتنی تاخیر کس لیے ہو رہی ہے؟ اس کے دوستوں کا احتجاج بھی جاری تھا جو اس پر ناراض ہو رہے تھے کہ وہ اسے امکانی تاخیر کر کے کچھ مزید وقت زندہ رکھنے کے خواہشمند تھے۔ اس دانستہ تاخیر کے لیے ان لوگوں نے زہر کا پیالہ تیار کرنے والے کو رشوت دے کر آمادہ کیا تھا۔

سقراط باہر نکلا اور زہر تیار کرنے والے سے گویا ہوا: " کیا تم اس کام پر پہلی بار مامور کیے گئے ہو؟ کیا اس سے قبل تم نے زہر کی رگڑائی نہیں کی؟ تم جتنی دیر کر رہے ہو اس سے بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کیا تم نے اس سے قبل کسی مجرم کو زہر نہیں دیا؟

وہ کارندہ بولا: " میری پوری زندگی مجرموں کو زہر دیتے ہوئے گذر گئی لیکن اس سے پہلے میں نے کبھی تم جیسا خبط الحواس نہیں دیکھا۔ آخر تم کو کس بات کی جلدی ہے؟ میں تو جان بوجھ کر ان دواؤں کی رگڑ گھس میں دیر کر رہا ہوں تا کہ تم مزید کچھ دیر زندہ رہ سکو' کچھ اور سانسوں کا مزا

لے سکو، اور تم ہو کہ پاگلوں کی طرح اس بات پر مصر ہو کہ دیر ہو رہی ہے۔ آخر تم مرنے کے لیے کیوں اتنے بے چین ہو؟

سقراط نے کہا: "میں اس لیے بہت زیادہ عجلت میں ہوں کہ میں موت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ موت آخر کیسی ہوتی ہے؟ اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ بالآخر جب موت آ لیگی تو میں بچ سکوں گا یا نہیں؟ اگر میں نہیں بچ سکا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا......اور اگر میں بچ گیا تو پھر موت کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل میں میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس معرکے میں کون فنا ہوگا......خود موت فنا ہوگی یا میں؟ میری خواہش ہے کہ میں دیکھ سکوں کہ موت باقی رہتی ہے یا میں۔ مگر یہ سب میں کیسے دیکھ پاؤں گا اگر میں زندہ نہ رہا؟

سقراط کو زہر دے دیا گیا۔ اس کے دوستوں نے آہ و زاری شروع کر دی۔ وہ لوگ صدمے سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ مگر کیا تمھیں علم ہے کہ اس دوران خود سقراط کیا کر رہا تھا؟ وہ ان بتا رہا تھا کہ زہراب میرے گھٹنوں پر اثر انداز ہو گیا ہے......اب گھٹنوں سے اوپر میری پوری ٹانگ بے جان ہو گئی ہے......اگر اس وقت تم میری ٹانگیں کاٹ بھی ڈالو تو مجھے پتہ نہیں چلے گا مگر میرے دوستو! مجھے کہنے دو کہ گو میری ٹانگیں مکمل طور پر بے جان ہو چکی ہیں اس کے باوجود میں ہنوز زندہ ہوں۔ لہٰذا ایک بات یقینی ہے کہ میں صرف ٹانگوں پر ہی مشتمل نہیں تھا' کیونکہ میں تو ابھی موجود ہوں۔ میں تمام کا تمام جوں کا توں یہاں موجود ہوں۔ میرے اندر کی کوئی چیز فنا نہیں ہوئی ہے۔ سقراط کہتا رہا: اب میری دونوں ٹانگیں بے حس ہو چکی ہیں' ران تک ہر چیز ختم ہو چکی ہے مجھے کوئی احساس نہیں ہوگا اگر تم ران تک میری دونوں ٹانگیں کاٹ بھی ڈالو۔ پھر بھی میں تمھارے سامنے ہوں۔ اور میرے دوست ہیں کہ آہ و بکا میں مصروف ہیں۔

سقراط کہہ رہا ہے کہ روؤ دھوؤ مت' دیکھو کہ تم کو ایک موقعہ نصیب ہو رہا ہے: ایک انسان مر رہا ہے اور تم کو آگاہ کر رہا ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ تم میری ٹانگ جڑ سے کاٹ بھی ڈالو تب بھی میں فنا نہیں ہونگا۔ اس کے بعد بھی باقی رہوں گا۔ میرے دونوں ہاتھ بھی میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں اور یہ بھی مر جائیں گے۔ افسوس کہ میں نے کتنی بار ان ہاتھوں سے اپنی شناخت کرائی......اور اب یہی ہاتھ میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں......پھر بھی میں البتہ موجود ہوں۔

اپنے مرنے تک سقراط اسی طرح بولتا رہا۔ اس نے کہا آہستہ آہستہ ہر چیز پر سکون ہوتی

جا رہی ہے' ہر چیز ڈوب رہی ہے مگر 'میں' بہر حال ثابت و سالم موجود ہوں۔ چند ثانیوں میں شاید تم کو مزید کچھ نہ بتا سکوں' مگر اس سے تم یہ مت سمجھ لینا کہ اب میں نہیں رہا کیونکہ جب میں اپنے جسم کے بیشتر اعضا کے مر جانے کے باوجود تمھارے سامنے موجود رہا تو یہ کہاں ممکن ہے کہ اپنے جسم کا مزید تھوڑا حصہ بے حس ہونے کے نتیجے میں مر جاؤنگا؟ ہوسکتا ہے کہ میں تم کو مزید کچھ نہ بتا سکوں ' کیونکہ ایسا کرنا تو صرف جسم کے ذریعے ہی ممکن ہے......مگر میں پھر بھی موجود رہونگا۔ عین آخری لمحات میں اس نے کہا: اب شاید میں اپنی آخری بات کہہ رہا ہوں؛ میری زبان بھی جواب دے رہی ہے' اس کے بعد میں ایک لفظ نہ کہہ سکوں گا' پھر بھی میں کہہ رہا ہوں: کہ میں موجود ہوں۔ یہاں تک کہ موت کے بالکل انتہائی لمحے میں میں بھی اس نے کہا کہ میں اب بھی زندہ ہوں"

ارتکازِ توجہ اور انہماک میں بھی انسان بتدریج داخل ہوتا ہے' اور اس کے سامنے سے رفتہ رفتہ ایک کے بعد ایک چیزیں گذرتی جاتی ہیں۔ ہر چیز سے ایک خاص فاصلہ قائم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک لمحہ ایسا آ جاتا ہے جب لگتا ہے کہ سب کچھ دور بہت دور ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خود کے بجائے کسی اور کی لاش عبادت گاہ کے کنارے پر پڑی ہوئی ہے اور انسان بذاتِ خود بھی موجود ہے۔ گویا تمھارا جسم وہاں پڑا ہوا ہے اور تم موجود ہو......اُس سے بالکل جدا' مکمل تبدیل شدہ اور مختلف۔

اگر ہم دورانِ حیات' موت کو صرف ایک بار دوبدو دیکھ لیں تو اس کے بعد کبھی ہمیں موت سے سابقہ نہیں پڑے گا۔ موت آتی رہے گی مگر صرف اس طرح جیسے چند ساعات کے لیے پڑاؤ کیا اور آگے کے لیے سفر بدستور جاری۔ ایسے جیسے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے رکے' یا دورانِ سفر نئے گھوڑے لینے کے لیے رکے' یا پھر نئے جسم کے ساتھ نئی دنیاؤں میں' نئے راستوں اور نئے سفر پر گامزن ہو گئے لیکن موت کبھی بھی ہم کو فنا نہیں کر سکے گی۔ اس کیفیت کو ہم تب ہی سمجھ سکیں گے جب ہم موت پر قابو پا لیں۔ اور یقیناً ہم کو جاننا ہوگا' ہمیں ان مراحل سے گذرنا ہوگا۔

ہم چونکہ موت سے بے حد خوفزدہ رہتے ہیں اس لیے ہم ارتکازِ توجہ کے اہل نہیں۔ میرے پاس اکثر لوگ آ کر اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ارتکاز میں کامیاب نہیں ہوتے۔ میں ان کو کیسے بتاؤں کہ ان کا اصل مسئلہ کچھ اور ہے؟ ان کا اصل مسئلہ یہی موت کا خوف ہے......اور ارتکازِ توجہ بھی کم و بیش موت کے ہم معنی ہے۔ مکمل ارتکاز کا عامل اس نکتے پر پہنچ جاتا ہے جیسے اس پر موت

مسلط ہوگئی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مرنے والا اُس نکتے پر اپنی بے ہوشی کی حالت میں موت واقع ہونے سے پہنچتا ہے جبکہ ہم اس نکتے پر اپنے ہوش وحواس میں پہنچتے ہیں۔ محض ایک یہی فرق ہے' مرنے والے کو کوئی علم نہیں ہوتا کہ اس پر کیا گذری؟ چھلکا کس طرح ٹوٹا اور اندر کی گری کیسے سلامت رہ گئی؟ مگر ارتکاز کا عامل بخوبی جانتا ہے کہ چھلکے سے گری کب علیحدہ ہوئی؟

یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اپنی کامل توجہ منعطف نہیں کر پاتے اس کے پیچھے ان کے خیالات میں موت کے خوف کا راسخ رہنا ہے...... اس کے علاوہ کچھ اور وجہ ممکن نہیں۔ وہ لوگ جو موت سے ڈرتے ہیں وہ سمادھی میں داخل ہونے کے قابل نہیں۔ سمادھی کیا ہے؟ رضا کارانہ موت کا استقبال۔ موت کو مدعو کیا جاتا ہے کہ آ! میں مرنے کے لیے تیار ہوں! میں جاننا چاہتا ہوں کہ موت کے بعد میں بچ پاؤں گا یا نہیں۔ اور یہ بہتر ہے کہ اس حال کو اپنے ہوش وحواس میں پہنچوں' کیونکہ بے ہوشی کے عالم میں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جان سکوں گا۔

لہٰذا میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ جب تک موت سے بھاگتے رہو گے یہ آپ پر غالب آتی رہے گی' اور جس روز بھی موت کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاؤ گے' وہ آخری دن ہوگا جب موت آپ کا پیچھا چھوڑ دیگی' اور آپ باقی رہ جائیں گے۔

اِن تین دنوں میں میری تمام تر گفتگو موت پر حملہ آور ہونے کے طریقوں پر مشتمل ہوگی۔ مجھے امید ہے ان تین دنوں میں کئی لوگ یہ جان لیں گے کہ کیسے مرا جائے' اور اس پر قدرت بھی حاصل کر لیں گے۔ اور اگر آپ اس ساحل پر مر سکتے ہیں ...... یہ ساحل ایک خاص اہمیت کا حامل ساحلِ عبادت گاہ ہے ...... اس ساحل کی اسی ریت پر کبھی کرشن جی محوِ خرام رہے ہیں...... جی ہاں وہی کرشن جی جنھوں نے ایک لڑائی میں ارجن سے کہا تھا: بے فکر رہو' خوف زدہ مت ہو۔ مرنے یا مارنے سے مت ڈرو' میں تم کو بتاتا ہوں کہ نہ تو کوئی مرتا ہے اور نا ہی کوئی مار سکتا ہے۔ نہ تو کبھی کوئی مرا ہے اور نا ہی کبھی کوئی مر سکتا ہے...... اور یہ کہ جو کوئی مرتا ہے' وہ جو مر سکتا ہے؛ وہ پہلے ہی مر چکا ہے...... وہ جو مرتا ہے' وہ جو مر سکتا ہے وہ پہلے ہی مر چکا ہے۔ اور وہ جو نہیں مرتا اور نہ مارا جا سکتا ہے' اس کے مرنے کی کوئی صورت نہیں' اور یہی در حقیقت زندگی ہے۔

آج رات' اتفاقی طور پر ہم سب اس ساحلِ عبادت گاہ پر جمع ہو گئے ہیں جہاں کبھی کرشن جی چلا کرتے تھے۔ اس ریت نے کرشن جی کا چلتے پھرتے درشن کیا ہے۔ عام لوگ یقیناً

یہی نظریہ رکھتے ہیں کہ کرشن جی مر چکے ہیں...... ہم کیونکہ موت کو سچ سمجھتے ہیں' ہمارے نزدیک چونکہ سب کو مرنا ہے...... اس عبادت گاہ نے اور اس کے ساحل پر پھیلی ہوئی ریت نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ کرشن جی مر چکے ہیں۔ اس آسمان کو' ان ستاروں کو اور اس چاند کو کبھی کرشن جی کی موت کا یقین نہیں آیا ہے۔

اصل میں' زندگی کے کسی بھی حصے میں موت کی کوئی گنجائش موجود نہیں مگر ہم سب یہ باور کر چکے ہیں کہ کرشن جی مر چکے ہیں۔ ہمارا یہ عقیدہ اس لیے ہے کہ ہم پر ہر دم خود اپنی موت کے خوف کا سایہ منڈلاتا رہتا ہے۔ ہم نے اپنے ذہن پر اپنی موت کا خیال کیوں مسلط کیا ہوا ہے؟ لمحۂ موجود میں جب کہ ہم جی رہے ہیں' سانس لے رہے ہیں پھر بھی موت کے خوف میں مبتلا ہیں؟ ہم کیوں موت سے اس قدر ڈرتے ہیں؟ در حقیقت اس خوف کے پیچھے ایک راز پوشیدہ ہے' ایک ایسا راز جس کو ہمیں سمجھنا چاہئے۔

اس سب کے در پردہ ایک نہایت دلچسپ حسابی عمل ہے۔ ہم نے خود اپنے آپ کو کبھی مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ دوسروں کو ہی مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور یہ واقعہ ہمارے موت کے خوف کو پختہ تر کرتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر: بارش کا ایک قطرہ ہزاروں دوسرے قطروں کے ساتھ بادلوں میں رہتا ہے حتیٰ کہ ایک دن سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں اور وہ اسٹیم کی شکل میں غائب ہو جاتا ہے۔ یوں دوسرے قطروں کے خیال میں وہ قطرہ مر گیا...... یہ غلط بھی نہیں' کیونکہ ایک لمحہ پہلے انھوں نے اس کو اپنے درمیان حاضر دیکھا تھا جو' اب نہیں ہے۔ مگر وہی قطرہ اب بھی بادلوں میں موجود ہے۔ لہٰذا جب تک دوسرے قطرے خود بھی بادلوں میں اس سے نہ جا ملیں ان کو اس حقیقت کا علم کیسے ہوگا؟ جبکہ وہ قطرہ اب تک دوبارہ سمندر میں گر کر قطرے کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ دوسرے قطروں کو اس کا ادراک اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ خود بھی ان مراحل سے نہ گذریں۔

جب ہم اپنے اطراف کسی کو مرتا ہوا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اب وہ نہیں رہا' محض اسی طرح جیسے ایک اور انسان مر گیا۔ ہم یہ نہیں تسلیم کرتے کہ وہ فضا میں تحلیل ہو گیا ہے...... خاموشی کے ایک ایسے دورانئے میں منتقل ہو گیا ہے جہاں سے وہ دوبارہ نئے سفر کی شروعات کرے گا۔ یا جیسے کہ وہ ایک قطرہ تھا جو اسٹیم کی شکل اختیار کر گیا تا کہ وہ دوبارہ قطرے کی صورت میں جلوہ گر

ہو سکے۔ ہم یہ سب کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ ہم صرف یہ باور کرتے ہیں کہ ایک اور آدمی مر گیا ہے۔ پس روزانہ کوئی نہ کوئی مرتا ہی ہے' روزانہ ہی کوئی نہ کوئی قطرہ غائب ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم کو یقین واثق ہوتا جاتا ہے کہ ہم کو خود بھی مر جانا ہے۔ یہ کہ میں خود بھی مرنے والا ہوں۔ بس پھر ایک خوف طاری ہو جاتا ہے "میں مر جاؤں گا" یہ خوف ہم کو جکڑ لیتا ہے' کیونکہ ہم دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھ ہی رہے ہیں۔ ہم دوسروں کو مرتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں اور یہی ہمارا مسئلہ ہے۔

گذشتہ رات میں کچھ دوستوں کو ایک کہانی سنا رہا تھا: ایک بار ایک یہودی فقیر اپنے مسائل سے بیحد گھبرا گیا...... کون نہیں گھبراتا؟ ہم سب اپنی اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں' اور ہماری سب سے بڑی پریشانی دوسروں کی خوشیاں ہوتی ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ دوسرے خوش اور شادمان ہیں ہم خود پریشان اور غمزدہ ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی کوئی حسابی عمل ہے' اس نوع کا حسابی عمل جس کا ذکر میں نے موت کے حوالے سے کیا۔ ہم اپنی مشکلات اور دوسروں کے چہروں کو ہی دیکھتے ہیں۔ ہم دوسروں کی تکالیف اور مصیبتوں پر نظر نہیں رکھتے صرف ان کی آنکھوں اور ہونٹوں پر کھلی مسکراہٹ ہی ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ اب اس نکتۂ نظر کے تحت اگر ہم اپنے اوپر غور کریں تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اندرونی طور پر اپنی مصیبتوں اور ابتلاؤں کے باوجود بیرونی طور پر ہم خوش نظر آنے کی شعوری کوشش کرتے رہتے ہیں؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری مسکراہٹیں اپنی پریشانیوں کو دوسرے سے چھپائے رکھنے کا ایک ذریعے ہوتی ہیں۔

کوئی نہیں چاہتا کہ وہ دوسروں کے سامنے خود کو غیر مطمئن ظاہر کرے۔ اگر وہ حقیقت میں ناخوش بھی ہے تب بھی وہ دوسروں کے سامنے خود کو مطمئن اور آسودہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ خود کو نا آسودہ اور غیر مطمئن ظاہر کرنا دراصل اپنی بے آبروئی کا اعتراف' نقصان اور شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بیرونی طور پر خوش نظر آنے کے باوجود اندر سے وہی ہوتے ہیں کہ جو اصل میں ہیں۔ اندر اندر تو آنسو بھرے ہوتے ہیں اور باہر سے ہم خوش نظر آنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی ہم کو دیکھتا ہے تو ہم کو مسکراتے ہوئے پاتا ہے اس کے برعکس جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو خود کو مصائب اور مسائل میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اور یہ کیفیت اس کے لیے مسئلے کی حیثیت اختیار کرتی جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ دنیا میں تمام لوگ خوش خرم اور آسودہ ہیں' ایک صرف وہی پریشان حال اور مصائب میں مبتلا ہے۔

اس یہودی فقیر کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ ایک رات اپنی دعاؤں میں اس نے خدا سے کہا: "میں نہیں کہتا کہ مجھے غم و اندوہ نہ دے کیونکہ اگر میں انہی مصائب کا حقدار ہوں تو یقیناً مجھ کو یہی ملنا چاہئیں...... لیکن کم از کم اتنا کہنے کی اجازت تو ضرور ملنی چاہیے کہ مجھ کو حد سے زیادہ پریشانیوں میں مت ڈال۔ میں دنیا میں ہر شخص کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھتا ہوں جبکہ صرف میں اکیلا پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہوں۔ ہر شخص خوش نظر آتا ہے' ایک صرف میں ہی غموں کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہوں۔ آخر میں نے ایسی کیا غلطی کی ہے؟ برائے کرم مجھ پر ایک مہربانی کر...... میرے مسائل کے بدلے مجھے کسی اور کے مسائل عطا کر دے' میرے غم و اندوہ اپنی پسند کے کسی بھی شخص سے بدل دے...... میں ان کو قبول کر لوں گا۔

اُس رات اس نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ ایک بہت بڑی اور عظیم الشان عمارت میں لاکھوں کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں اور لاکھوں لوگ اپنے کندھوں پر اپنے رنج و الم کے گٹھڑ لادے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ غموں اور پریشانیوں کے اتنے بہت سے بوجھ بھار دیکھ کر وہ ڈر گیا اور ایک مخمصے میں پڑ گیا۔ دوسرے تمام لوگ جو اپنی پریشانیوں کے گٹھڑ اٹھائے ہوئے تھے وہ سب کے سب اس کے اپنے رنج و الم کے بوجھ سے کم نہیں تھے۔ وہ ذہنی طور پر الجھ کر رہ گیا۔ اپنے پڑوسی کو اس نے ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہوئے ہی دیکھا تھا اور ہر صبح جب بھی وہ فقیر اس سے حال احوال لیتا تھا وہ یہی جواب دیتا تھا کہ سب کچھ بہتر ہے؛ اس کا وہی پڑوسی اب اپنے مصائب کا اسی قدر بوجھ اٹھائے ہے جو خود اس کے اپنے مصائب جتنا ہے۔

اس نے بہت سے سیاستدانوں اور ان کے مقلدوں کو دیکھا' بہت سے گرو اور ان کے چیلوں کو دیکھا...... ہر کوئی ایک جتنا بوجھ اٹھائے چلا آ رہا تھا' کیا عقل مند' کیا بے وقوف' کیا امیر' کیا غریب' کیا صحت مند' کیا بیمار' ہر ایک کے مصائب کا بنڈل ایک ہی جتنا تھا۔ وہ دریائے حیرت میں غرق ہو گیا' اب تک وہ صرف ان کے چہروں کو دیکھتا رہا تھا' ۔لوگوں کے مصائب کو اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ اچانک ایک بلند آواز ابھری: اپنی گٹھڑیاں کھونٹیوں میں لٹکا دو' اس فقیر سمیت ہر شخص نے ایسا ہی کیا' ہر کوئی اپنے مسائل اور مصائب سے فوری چھٹکارا چاہتا تھا' اگر ہمیں بھی ایسا موقعہ ملتا تو کیوں نہ ہم بھی جلد از جلد ایسا ہی کرتے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور آواز ابھری: اب جو بھی چاہے اپنی پسند کی گٹھڑی اٹھا لے۔

ہم سمجھ رہے ہوں گے کہ اس فقیر نے فوراً ہی کسی دوسرے کی گٹھڑی اٹھالی ہوگی......نہیں! اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اس کی گٹھڑی اٹھالیتا' اس نے بہ عجلت تمام اپنی گٹھڑی پر قبضہ کرلیا' بصورتِ دیگر یہ اس کے لیے ایک مسئلہ بن جاتا کیونکہ تمام تر گٹھڑیاں شکل وصورت میں بھی ایک ہی جیسی تھیں۔ اس نے اپنی ہی گٹھڑی حاصل کرنا بہتر سمجھا کیوں کہ اس کے اندر موجود مسائل کا وہ پہلے سے عادی تھا۔ کسے معلوم کے دوسروں کی گٹھڑیوں میں کس قسم کے مسائل بھرے ہوئے ہوں معلومہ پریشانیاں پھر بھی کم تر درجے کی ہوں گی' وہ جن سے پہلے سے لوگ نبرد آزما ہوں وہ پھر بھی قابلِ قبول ہوسکتی ہیں۔

لہٰذا ہیجانی کیفیت میں اس نے دوڑ کر اپنی گٹھڑی اٹھالی قبل اس کے کہ کوئی اور اس کے اوپر ہاتھ رکھ دے۔ پھر اس نے اطراف میں نظر ڈالی تو اسے معلوم ہوا کہ کسی اور نے بھی اپنے علاوہ کسی دوسرے کی گٹھڑی حاصل کرنے کی کوشش نہیں۔ لوگوں سے اس نے پوچھا کہ تم لوگ اپنی ہی گٹھڑیاں واپس حاصل کرنے میں کیوں اتنے متجسس ہو؟

"ہم ڈر گئے! اب تک ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے علاوہ ہر کوئی خوش اور مطمئن ہے' اور یہ صرف ہم ہیں جو دکھوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں" انھوں نے جواب دیا۔

اس عمارت میں اس فقیر نے جس سے بھی سوال کیا اس نے یہی جواب دیا کہ وہ اب تک یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے علاوہ ہر شخص آسودہ ہے۔ یہاں تک کہ ہم تم کو بھی خوش اور مطمئن سمجھتے تھے کیونکہ تم بھی آتے جاتے اپنے چہرے پر مسکراہٹ ہی لیے دکھائی دیتے تھے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنے اندر تم بھی غم واندوہ کی ایک دنیا بسائے پھرتے ہو۔

فقیر کا تجسس پھر بھی رفع نہیں ہوا' اس نے پھر پوچھا کہ تم لوگوں نے اپنی ہی گٹھڑیاں کیوں واپس لیں؟ کسی دوسری گٹھڑی سے کیوں نہیں بدلیں؟

انھوں نے جواب دیا: آج صبح ہم میں سے ہر ایک نے خدا سے دعا کی تھی کہ ہمیں کسی اور کے مصائب عطا کردیے جائیں' لیکن جب ہم نے دیکھا کہ ہر ایک کے دکھ ایک جیسے ہیں' جو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا' لہٰذا ہم ڈر گئے' اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے ہی دکھوں کے بوجھ اٹھائے رکھنے میں عافیت ہے' ان سے ہم پہلے ہی گذر رہے ہیں' یہ ہمارے لیے اجنبی نہیں اس لیے نئے دکھ اٹھانے سے کیا حاصل؟ جیسے تیسے ہی سہی ہم اپنے دکھوں کے عادی ہوہی جائیں گے۔ اُس

رات کسی نے بھی اپنے دکھوں کے بدلے کسی اور کے دکھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ فقیر جاگ اٹھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کے اپنے دکھ واپس کردیئے' اور آئندہ کے لیے اس نے اس قسم کی دعا مانگنے سے توبہ کرلی۔

اس تمام قصے کے پس پردہ وہی ایک حسابی عمل کارفرما ہے۔ جب ہم دوسروں کے چہرے اور اپنے حقائق پر نظر ڈالتے ہیں......تو' ہم ایک مہیب غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی اور موت کی توقعات میں بھی یہی حسابی غلطی کارفرما ہے۔ آپ نے ہمیشہ دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے' کبھی اپنے آپ کو نہیں۔ ہم دوسروں کی صرف اموات دیکھتے ہیں' یہ کبھی نہیں جان پاتے کہ ان کے اندر کا بھی کچھ بچا ہے یا نہیں۔ کیونکہ موت کے وقت ہم پر بے ہوشی کی حالت طاری ہوتی ہے' اس لیے موت ہمارے لیے اجنبی ہی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم رضا کارانہ موت کے منہ میں چلے جائیں۔ اگر کوئی انسان ایک بار موت کو اپنے ہوش وحواس میں دیکھ پائے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس نجات حاصل کرلے گا......اس پر فتح پاجائے گا۔ مگر درحقیقت اس کو فتح مند قرار دینا بے معنی ہوگا کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں جس سے بازی جیتی جاسکے...... اس طرح موت ایک مغالطہ ثابت ہوجاتی ہے......یعنی موت کا کوئی وجود نہیں۔

اگر کوئی انسان دو اور دو کو جمع کرکے اس کے جواب میں پانچ لکھ دے اور دوسرے دن اس کو معلوم ہو کہ دو اور دو کا مجموعہ چار ہوتا ہے' تو کیا وہ یہ کہے گا کہ اس نے پانچ کے اوپر فتح حاصل کرکے اس کو چار بنادیا؟ بلکہ وہ کہے گا کہ اس میں فتح وشکست کا سوال نہیں...... کیونکہ وہاں پانچ کی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ اس مجموعے کو پانچ قرار دینا اس کی غلطی تھی...... یہ اس کی لاعلمی تھی......اس کا حساب غلط تھا......اس کا جواب تو چار ہی تھا......اس نے اسی کو پانچ جانا اور یہ اس کی غلطی تھی۔ جب ایک بار آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوجائے تو بات ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی انسان یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ پانچ سے کس طرح نجات حاصل کرے؟ اب میں جانتا ہوں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس سے قبل میں ان کے مجموعے کو پانچ سمجھتا تھا۔ میں خود کو پانچ سے کیسے آزاد کراسکتا ہوں؟ اس بے معنی آزادی کا وہ کبھی متقاضی نہیں ہوسکتا کیونکہ جب ایک انسان یہ جان لیتا ہے کہ دو اور دو جمع کرنے سے جواب چار آتا ہے' تو قصہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد پانچ کا وجود ہی کہاں باقی رہے گا؟ پھر ایسی کونسی چیز باقی رہ جائے گی جس سے اس کو نجات پانے کی ضرورت ہو؟

نہ تو کسی کو موت سے آزادی کی ضرورت ہے نہ اس کے اوپر فتح مندی کی۔ اس کو صرف موت سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ یہ واقفیت ہی آزادی کی نوید ہے۔ یہ واقفیت ہی فتح مندی کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ابتدا میں یہ کہا کہ آگہی طاقت ہے' آگہی آزادی ہے' آگہی فتح ہے۔ موت سے آگہی اس کو فنا کر دیتی ہے...... پھر اچانک ...... پہلی بار...... ہم زندگی سے منسلک ہو جاتے ہیں۔

اس وجہ سے میں نے آپ کو بتایا کہ ارتکازِ توجہ اصل میں موت سے رضا کارانہ ملاقات کا نام ہے۔ اور دوسری بات جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ: وہ جو موت سے ارادتاً ہمکنار ہو' وہ اچانک زندگی کو جان لیتا ہے۔ یہاں تک کہ موت آنے سے پہلے جو خود موت کی تلاش میں نکلتا ہے' وہی حقیقی زندگی کا سراغ پالیتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنی تلاش کے نتیجے میں ہی موت کے گنبد میں داخل ہوا ہو وہ خود کو زندگی کے عبادت خانے میں پائے گا۔ اور جو موت کے گنبد سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا وہ کبھی بھی زندگی کے عبادت خانے تک نہیں پہنچ سکے گا۔

مجھے کہنے دیں کہ زندگی کے عبادت خانے کی دیواروں پر موت کے سائے پہلے سے کندہ ہیں۔ میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کی عبادت گاہ کی دیواروں پر موت کے نقش بنے ہوئے ہیں۔ اور جب ہم موت سے بھاگتے ہیں تو عملاً ہم زندگی کی عبادت گاہ سے بھاگتے ہیں۔ جب ہم موت کو تسلیم کرلیں گے تبھی ہم ان دیواروں کے وجود کو بھی تسلیم کرسکیں گے۔ جب بھی ہم موت سے ہاتھ ملائیں گے ہم زندگی کی عبادت گاہ میں گھسیٹ لیے جائیں گے۔ زندگی پر اختیار حاصل کرنے کا دارومدار موت کی دیواروں میں قید ہے۔ موت کے مناظر زندگی کی عبادت گاہ کی دیواروں کی ہر تصویر میں نقش ہیں اور ہم یہی مناظر دیکھ کر اس سے دور بھاگتے ہیں۔

اگر آپ کبھی کھاجوراہو گئے ہیں تو یقیناً آپ نے وہاں ایک عجیب چیز محسوس کی ہوگی...... اس کی دیواروں پر ہر طرف جنسی مناظر کندہ ہیں۔ تمام نقوش برہنہ اور قابلِ اعتراض ہیں۔ اگر ان کو دیکھنے کے بعد کوئی وہاں سے فوراً نکل جائے گا تو وہ زندگی کی عبادت گاہ کے ناقابلِ انکار حقائق تک رسائی کیسے حاصل کر پائے گا؟ ان کے اندر خدا کا وجود ہے اور باہر محض جنس' پیاس' اور اختلاط کے مناظر ہیں۔ وہ لوگ یقیناً حیرت انگیز تھے جنھوں نے کھاجوراہو کے عبادت خانے تعمیر کیے۔ انھوں نے زندگی کے ناقابلِ انکار حقائق نقش کیے: انھوں نے بتادیا کہ زندگی کی عبادت

گاہ میں جنس ناقابلِ انکار حقیقت ہے...... اگر آپ اس سے نظریں چرانا چاہو گے تو کبھی آفاقی صفات حاصل نہیں کرسکو گے۔ یہ اوصاف تو خود تمھارے اندر موجود ہیں۔ جب تم اپنی ذات کی دیواروں سے باہر نکل پاؤ گے تبھی تم ان اوصاف سے آگاہ ہوسکو گے۔ ان دیواروں پر تو صرف فانی دنیا نقش کی گئی ہے' اگر تم ان دیواروں سے دور ہوجاؤ گے تو تم کبھی خدا تک رسائی حاصل نہیں کرسکو گے۔ اس فانی دنیا کی ہر چیز کے اندر وہی تو براجمان ہے۔

یہی بات میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ کہیں...... کسی جگہ...... ہم کو ایک ایسا عبادت خانہ بنا چاہیے جس کی دیواروں پر فنا کے نقوش اجاگر کیے گئے ہوں...... حیاتِ دائمی اسی کے اندر پوشیدہ ہے۔ یہی حقیقی صورت حال ہے۔ بہر حال جب تک ہم فنا کے خوف میں مبتلا رہیں گے' دائمی حیات کے تصور تک سے نابلد رہیں گے۔

دو باتیں میں ایک ساتھ کہتا ہوں: ارتکازِ توجہ رضا کارانہ طور پر موت کے قلعے میں داخلے کا نام ہے؛ اور یہ کہ جو اس قلعے میں رضا کارانہ داخل ہوجاتا ہے وہ ابدی زندگی پالیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جو اس طرح موت کا مقابلہ کرتا ہے تو موت تحلیل ہوجاتی ہے اور وہ خود کو زندگی کی آغوش میں پاتا ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد دکھائی دیتی ہیں کہ آپ موت کی تلاش میں نکلیں اور زندگی سے دوچار ہوجائیں...... لیکن ایسا ہے نہیں۔

مثال کے طور پر میں کپڑے پہنے ہوئے ہوں؛ ایسی حالت میں اگر تم مجھے ڈھونڈنے نکلو گے تو پہلے تم کو میرے لباس کا سامنا ہوگا - میں بذاتِ خود لباس تو نہیں - اور اگر تم میرے کپڑوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلتے ہو تو تم مجھ سے کبھی واقف نہیں ہوسکتے - ہاں اگر میرے لباس سے ڈرے بغیر تم مجھ سے نزدیک تر ہوتے جاؤ گے تو تم کو میرے لباس کے نیچے میرا جسم ملے گا۔ جبکہ وسیع تر معنی میں میرا جسم بھی میرا لباس ہی ہے اور اگر تم میرے جسم کو بھی تسلیم نہیں کرو گے تو بھلا اس سے کیسے واقف ہوسکو گے جو اس جسم کے اندر فروکش ہے۔ اگر تم جسم سے خوفزدہ ہوئے بغیر اپنی تلاش میں آگے بڑھتے رہتے' یہ جان کر کہ دراصل جسم بھی ایک لباس ہے...... تب یقیناً تم اس تک رسائی حاصل کرلیتے جو اندر موجود ہے...... وہی ایک...... جس سے ملنے کا ہر کوئی خواہشمند ہے۔

کتنی دلچسپ حقیقت ہے کہ جسم کی دیواریں بنا کر وہ خود بڑے وقار کے ساتھ اندر بیٹھا

ہوا ہے۔ دیواریں فانی مادّے کی بنائی گئی ہیں اور جو اندر موجود ہے وہ لافانی ہے۔ وہاں آ گہی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ فانی جسم کے اندر زندگی کا لافانی وجود!؟ یقیناً یہ دونوں متضاد باتیں ہیں' لیکن اگر آپ ٹھیک طور پر سمجھ پائے ہو تو دیواریں اصل میں موت ہیں اور ان دیواروں کے اندر حیاتِ لافانی موجود ہے۔

جب کوئی مصور تصویر بناتا ہے تو وہ سفید رنگ کو اجاگر کرنے کے لیے گہرے رنگ کا پس منظر تخلیق کرتا ہے۔ سفید لکیریں پس منظر کے گہرے رنگ میں خوب نمایاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی گہرے رنگوں کو ناپسندیدہ سمجھ لے گا تو وہ سفید رنگ کے وجود کو بھی گوارا نہیں کر سکے گا۔ اس طرح وہ اس حقیقت کے ادراک سے بھی قاصر رہے گا کہ دراصل گہرے رنگ کی وجہ سے ہی سفید رنگ ابھرتا ہے۔

بعینہٖ کانٹوں میں گھرے مہکتے گلاب کے پھول ہیں۔ اگر کوئی کانٹوں سے ڈر جائے تو گلابوں تک اس کی رسائی کہاں ممکن ہے؟ اگر وہ کانٹوں سے بچتا رہے گا تو وہ گلابوں سے بھی محروم رہے گا۔ لیکن جب کوئی کانٹوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے باوجود پھولوں تک بلا خوف رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا تو اس پر انکشاف ہوگا کہ وہ تو پھولوں کی حفاظت کے لیے ہیں اور محض پھولوں کی بیرونی دیوار کی حیثیت رکھتے ہیں...... محض حفاظتی دیوار۔ کانٹوں کے وسط میں پھول جھوم رہا ہے...... کانٹے پھول کے دشمن نہیں ہیں۔ پھول کانٹوں کا حصہ ہیں اور کانٹے پھول کا حصہ ہیں۔ دونوں ہی پودے کی حیات بخش قوت سے نمودار ہوئے ہیں۔

جس کو ہم حیات کہتے ہیں اور جس کو ہم موت کہتے ہیں...... دونوں اسی ایک طاقت کے مرہونِ منت ہیں جس کا کہ پھول اور کانٹوں کا وجود........... میں سانس لے رہا ہوں۔ ایک سانس باہر جاتا ہے' ایک اندر آتا ہے۔ وہی ایک سانس جو باہر جاتا ہے' کچھ دیر بعد وہی سانس اندر آتا ہے۔ اور جو سانس اندر آتا ہے وہی کچھ دیر کے بعد باہر چلا جاتا ہے۔ سانس کا اندر آنا زندگی ہے اور باہر جانا موت۔ لیکن دونوں ہی ایک عظیم زندگی کی طرف جانے والی سیڑھیاں ہیں۔ زندگی اور موت...... پہلو بہ پہلو۔ زندگی ایک قدم ہے اور موت دوسرا۔ لیکن اگر ہم دیکھ سکیں' اگر اپنے اندر جھانک سکیں تب ہم حیاتِ جاوداں کے تصور سے آ گاہ ہو سکیں گے۔

اِن تین دنوں میں ہم اپنی توجہ موت سے ملنے پر مرتکز رکھیں گے۔ اور اس کی مختلف

جہات پر آپ سے بات کروں گا۔ آج رات ہم توجہ کے پہلے دن کی ابتدائی مشق کریں گے۔ اس کے بارے میں میں آپ کو چند باتوں سے آ گاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

آپ لوگ اب تک میرے نکتۂ نظر سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ ہم کو اپنے اندر' بہت اندر' ایک خاص نکتہ تک پہنچنا ہے' وہاں جہاں موت آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہمیں اپنا باہر کا محیط چھوڑنا ہوگا' جس طرح مرنے کی صورت میں ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ مرنے کی صورت میں جسم چھوڑ دیا جاتا ہے' احساسات ترک کر دئے جاتے ہیں' خیالات ختم کر دئے جاتے ہیں' دوستیاں اور دشمنیاں حتیٰ کہ سب ہی کچھ ترک کر دیا جاتا ہے۔ تمام تر بیرونی تعلقات و معاملات چھوٹ جاتے ہیں' ہم......صرف ہم رہ جاتے ہیں۔ ہمارا اپنا پن رہ جاتا ہے' صرف اور صرف ہمارے حواس تنہا رہ جاتے ہیں۔

ارتکازِ توجہ میں بھی ہمیں ہر چیز اور ایک گواہ......اپنے اندر کا ایک گواہ چھوڑ کر مر جانا ہوتا ہے' اور اس طرح موت واقع ہو جاتی ہے۔ ارتکاز کے ان تین دنوں میں' اگر آپ نے مرنے کی ہمت برقرار رکھی اور خود کو ختم کر لیا تو ایک ایسی کیفیت نمودار ہوگی جسے ہم سمادھی کہہ سکتے ہیں۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ سمادھی ایک حیرت انگیز لفظ ہے۔ مکمل ارتکاز کی کیفیت کو سمادھی کہتے ہیں اور مرنے والے کے اوپر بنائی جانے والی قبر کو بھی سمادھی کہتے ہیں۔ اس موضوع پر آپ نے کبھی سوچا؟ دونوں کو سمادھی کہتے ہیں۔ دراصل دونوں میں ایک مشترکہ راز ہے' ایک قدرِ مشترک اصل میں ایسا شخص جو سمادھی کی حالت کو پہنچ چکا ہو' اس کا جسم ایک قبر کی صورت میں باقی رہ جاتا ہے...... اور کچھ نہیں۔ تب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی اندر موجود ہے۔ باہر صرف اور صرف تاریکی ہے۔

کسی کے مرنے کے بعد ہم اس کے اوپر ایک قبر بنا دیتے ہیں اور اس کو سمادھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ سمادھی دوسرے بناتے ہیں' اگر ہم دوسروں کے بنانے سے پہلے اپنی سمادھی خود بنا لیں تو یہ کیفیت وہ ہوگی جس کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔ دوسرے تو یقیناً ہماری سمادھی تیار کریں گے ہی' مگر اس صورت میں اپنے ہاتھوں سے اپنی سمادھی بنانے کا اختیار ہم سے چھن چکا ہوگا۔ اگر ہم اپنی سمادھی خود تیار کر سکیں' صرف اسی صورت میں ہمارا جسم بے شک مر جائے گا لیکن ہمارے حواس کے فنا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ نہ تو ہم کبھی مرے ہیں اور نہ کبھی مر سکتے ہیں۔ نہ کبھی

کوئی مرا ہے' اور نہ کبھی کوئی مر سکتا ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کے لیے بہر حال ہم کو موت کی طرف اترنے والی تمام سیڑھیاں طے کرنی ہوں گی۔

میں آپ کو وہ تین مراحل دکھانا چاہتا ہوں جن سے ہمیں گذرنا ہوگا۔ کسے معلوم کہ وہ موقعہ اسی ساحل پر واقع ہو جائے اور آپ اپنی سمادھی حاصل کر لو...... اُس سمادھی کے علاوہ جو دوسرے تمھارے لیے کریں گے' تم خود اپنے لیے تیار کرلو۔

وہ تین مراحل درج ذیل ہیں: پہلے مرحلے میں آپ اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں! آپ کو اپنا جسم اس قدر ڈھیلا چھوڑنا ہے کہ محسوس کرنے لگو جیسے آپ کا جسم کسی قدر فاصلے پر پڑا ہوا ہے۔ آپ کو اپنے جسم کی تمام تر توانائی یک جا کر کے اپنے من میں اتارنی ہوگی۔ جسم میں موجود تمام تر توانائی ہماری اپنی دی ہوئی ہے۔ جسم صرف وہی توانائی حاصل کرتا ہے جو ہم اس کو مہیا کرتے ہیں اس میں سے جتنی توانائی ہم حاصل کرنا چاہیں' کر سکتے ہیں۔

کبھی آپ نے ایک بات پر توجہ دی؟ جب آپ کی کسی سے لڑائی ہو جاتی ہے تو آپ کے اندر اضافی توانائی کہاں سے آ جاتی ہے؟ غصے کی اُس حالت میں آپ اتنی بڑی چٹان اٹھا سکتے ہیں' جس کو بحالتِ اطمینان جنبش بھی نہیں دی جا سکتی' حالانکہ آپ کا جسم وہی کا وہی ہوتا ہے۔ کیا آپ کو تعجب نہیں ہوتا کہ اتنی توانائی کہاں سے آ جاتی ہے۔ چونکہ آپ کو پیشِ نظر دشمن سے خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس لیے آپ حسبِ ضرورت مطلوبہ توانائی از خود مہیا کرتے ہیں۔ آپ کو علم ہوتا ہے کہ اگر یہ چٹان اپنی جگہ سے نہ ہٹائی گئی تو جان مشکل میں پھنس جائے گی اور آپ اپنے اندر کی تمام توانائی اپنے جسم کو مہیا کر دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک شخص مفلوج ہو گیا اور دو سال تک بستر پر دراز رہا۔ وہ نہ اٹھ سکتا تھا اور نہ حرکت کر سکتا تھا۔ معالجوں نے تمام امیدیں چھوڑ دیں اور یہ اعلان کر دیا کہ وہ اب باقی ماندہ تمام عمر مفلوج ہی رہے گا۔ پھر ایک رات اس کے مکان میں آگ لگ گئی اور تمام مکین گھر سے باہر نکل گئے۔ گھر سے باہر آنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ گھر کا سربراہ اندر ہی پھنسا رہ گیا ہے' وہ بھاگ بھی نہیں سکتا' آخر اس کا کیا بنے گا؟ کچھ لوگوں کے پاس ٹارچیں تھیں' انھوں نے دیکھا کہ وہ تو پہلے سے باہر موجود ہے۔ ان لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ چل کر باہر آیا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ کیسے چل کر آ سکتا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ مگر کیونکہ وہ یقیناً اپنے پیروں سے چل کر

باہر آیا تھا اس لیے کسی قسم کے شک وشبہ کی بات ہی نہیں تھی۔

مکان میں آگ لگی ہوئی تھی' ہر شخص وہاں سے نکل رہا تھا' ایک لمحے کے لیے وہ بھول ہی گیا کہ وہ مفلوج ہے۔ اس نے اپنے اندر کی تمام توانائی مجتمع کر کے اپنے جسم کو دے دیں۔ لیکن جب ٹارچ کی روشنی میں لوگوں نے اس کو دیکھ کر پوچھا کہ وہ کیسے باہر آیا تو وہ متعجب ہو کر گویا ہوا: "اوہ! میں تو مفلوج ہوں" یہ کہہ کر وہ گر پڑا...... اور اپنی توانائی کھو بیٹھا۔ اب یہ اس کے بس سے باہر تھا کہ وہ اس واقعے کی وجہ تسمیہ بیان کر سکے۔ پھر ہر شخص اس سے کہنے لگا کہ وہ اصل میں مفلوج نہیں ہے' کیونکہ اگر وہ اتنا چل سکتا ہے تو باقی تمام عمر بھی چل پھر سکتا ہے۔ لیکن الٹا وہ یہی سوال کرتا رہا کہ جب میں اپنا ہاتھ تک نہیں ہلا سکتا' اپنا پیر تک نہیں اٹھا سکتا تو یہ سب کیسے ہو گیا؟ وہ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے نہیں معلوم کہ اسے کون اٹھا کر باہر لایا۔

اس کو کوئی اٹھا کر باہر نہیں لایا تھا۔ وہ خود اپنے پیروں پر چل کر آیا تھا' اس کو بہر حال یہ علم نہیں تھا کہ خطرہ کو سر پر دیکھ کر اس کے اندر کی تمام توانائی جسم میں جمع کر دی گئی تھی پھر اس کے مفلوج ہونے کے خیال نے تقویت پکڑی اور تمام قوت واپس اپنے مرکز میں چلی گئی اور وہ پھر سے مفلوج ہو گیا۔

ایسے واقعات ایک یا دو انسانوں کے ساتھ نہیں پیش آئے ہیں' اس دنیا میں ایسے بے شمار واقعات ہو چکے ہیں جب فالج سے متاثرہ افراد اپنے فالج کے اثرات سے باہر آ گئے۔ ایسے اوقات میں کہ جب آگ بھڑک اٹھی ہو یا کوئی اور خطرناک حالات درپیش ہو گئے ہوں وہ اپنی معذوری کی حالت بھول کر اضطراری کیفیت میں چل اٹھے ہوں۔

میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم اپنے جسم کو توانائی خود فراہم کرتے ہیں' لیکن اس کو واپس حاصل کرنے کے طریقے سے ناواقف ہیں۔ رات کے وقت ہم آرام وسکون محسوس کرتے ہیں کیونکہ جسم کی توانائیاں واپس ہو چکی ہوتی ہیں اور وہ سکون وآرام کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور دن کے وقت ہم دوبارہ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ اس بات کے اہل بھی نہیں کہ وہ رات کے وقت بھی اپنی جسمانی توانائی اپنی ذات کے مرکز میں داخل کر لیں۔ ان کی توانائی ان کے جسم میں ہی محبوس رہتی ہے' جس وجہ سے ان کو نیند آنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ بے خوابی اس بات کی علامت ہے کہ جو توانائی پہلے سے جسم میں داخل ہے اس کو اپنے مرکز کی طرف واپسی کا

راستہ نہیں ملتا۔ ارتکاز کے پہلے مرحلے میں جسم کو مہیا شدہ تمام کی تمام توانائی لازماً واپس لینی ہوگی۔

اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ محض سوچنے کے عمل سے ہی توانائی جسم سے نکلنا شروع ہوجاتی ہے۔ اگر کسی لمحے' کوئی محسوس کرے کہ اس کی توانائی جسم سے نکل رہی ہے' اور جسم بتدریج پُرسکون ہونے لگا ہے تو وہ مسلسل زیادہ سے زیادہ پرسکون ہوتا رہے گا یہاں تک کہ ایک ساعت ایسی آجائے گی کہ خواہش کے باوجود وہ اپنا ہاتھ تک اٹھانے میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ ہر چیز پرسکون ہوجائے گی...... پس محض احساس کے ذریعے ہم اپنے جسم کی توانائی خارج کر سکتے ہیں۔

لہٰذا پہلی ضرورت جسم کی بنیادی قوت 'حیات آمیز توانائی' کا اپنے مرکز کی طرف اخراج ہے۔ اس عمل کے ذریعے جسم ایک چھلکے کی طرح بے حرکت ہوجائے گا...... اور جس طرح ناریل کا چھلکا اور اس کے اندر کی گری دو علیحدہ علیحدہ وجود میں بدل جاتے ہیں بالکل اسی طرح ہم خود باہر کھڑے رہ جاتے ہیں اور ہمارا جسم ایک چھلکے کی مانند باہر پڑا رہ جاتا ہے...... جیسے اتارے ہوئے ملبوسات۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ اپنی سانسوں کو ساکن کرنا ہے۔ ہماری سانسوں کے کہیں بہت اندر عمیق گہرائی میں ہماری قوتِ حیات موجود ہے۔ جب سانسیں رک جاتی ہیں تو انسان مرجاتا ہے۔ ہماری سانسوں کی گہرائیوں میں ہماری زندگی کی ڈور جڑی ہوئی ہے۔ سانس وہ پُل ہے جس کے ذریعے ہمارے جسم و جان آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم سانس کو پران یا روح کہتے ہیں۔ جیسے ہی سانسیں رک جاتی ہیں روح پرواز کر جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے تجربات کیے جاچکے ہیں۔

جب ایک انسان مکمل طور سے پرسکون ہوجاتا ہے تب کیا ہوتا ہے؟...... کیا اس طرح اس کو مکمل بے حس و حرکت ہونے میں مدد ملتی ہے؟ آہستہ آہستہ سانسیں ایک اس نکتے پر پہنچ جاتی ہیں جب انسان کو یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ وہ سانس بھی لے رہا ہے یا نہیں۔ کبھی وہ حیرت میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں...... سانسیں آجا بھی رہی ہیں یا نہیں۔ سانس اتنی ساکت ہوجاتی ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہوجاتا ہے کہ آیا اس میں کوئی جنبش بھی ہے یا نہیں؟

آپ کو اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرنی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کرنا چاہا تو کبھی اپنی سانسوں پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ وہ باہر آنے کی کوشش کرے گا اور اگر آپ

باہر اس پر قابو پانے کی کوشش کریں گے تو وہ اندر آنا چاہے گا۔ اس لیے میرا کہنا ہے کہ آپ کو اپنی طرف سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں' بس اس کو خود ہی پرسکون ہونے دیں...... زیادہ سے زیادہ خاموش...... ساکت۔ ایک مخصوص مقام پر' نہایت آہستگی کے ساتھ' سانس بالکل بے حرکت ہوجائے گی۔ یہ کیفیت اگر اس پر صرف ایک لمحے کے لیے بھی طاری ہوجائے...... یہی وہ لمحہ ہوگا جب انسان کو حواس اور جسم کے مابین ایک لامحدود فاصلے کا ادراک ہوگا۔ عین اسی وقت وہ اس فاصلے کو دیکھ بھی سکے گا۔ یہ ایسا ہے جیسے روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور اسی ایک لمحے میں میں نے آپ سب کے چہرے دیکھ لیے۔ اس کے بعد خواہ روشنی رہے یا نہیں البتہ میں نے آپ کے چہرے تو دیکھ ہی لیے۔

جب سانسوں کے درمیان ایک خفیف سا وقفہ آئے تو اسی درمیانی وقفے میں' انسان کے وجود کے اندر وہ احساس پیدا ہوگا...... وہی روشنی کا جھماکا' جس کے ذریعے اس پر واضح ہوگا کہ جسم قطعی علیحدہ ہے' اور وہ خود جسم سے علیحدہ ایک حقیقت ہے۔ یہی فنا کا لمحہ ہے۔ لہٰذا دوسرے مرحلے میں سانسوں کو سکون عطا کرنا ہے۔

تیسرے مرحلے میں ذہن کو آزاد چھوڑنا ہے۔ اگر سانسیں پرسکون ہوں اور ذہن نہ ہو تب بھی' روشنی تو ضرور نمودار ہوگی لیکن یہ ادراک مشکل ہے کہ اس دوران کیا ہوا؟ کیونکہ ذہن تو اپنے خیالات میں الجھا ہوا ہوگا۔ اگر اس دوران مجھ پر روشنی منکشف بھی ہوگی تو میں اس سے وقت گذرنے کے بعد آگاہ ہوسکوں گا' بروقت نہیں۔ بہرحال اس دوران' روشنی تو نمودار ہوئی لیکن میں اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ بہرحال روشنی کا ادراک ضرور ہوگا بشرطیکہ جیسے ہی سانسوں کے دوران وہ مخصوص وقفہ پیدا ہوجائے مگر وہ محسوس اسی صورت میں ہوگا جب خیالات کی لڑی ٹوٹی ہوئی ہو' بصورتِ دیگر احساس تک نہیں ہوگا اور موقعہ ضائع ہوجائے گا۔ پس اس سلسلے کی تیسری کڑی ذہن کو خیالات سے آزاد کرنا ہے۔

ہم کو ان تین مراحل سے گذر کر چوتھے مرحلے میں خاموشی سے بیٹھنا ہے۔ اگر آپ لیٹنا چاہیں تو لیٹ بھی سکتے ہیں۔ لیٹنا بہرحال زیادہ مفید ہوگا...... یہ ساحل کتنا خوبصورت ہے' اس کو بہتر طریقے پر استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے اطراف میں اچھا خاصا فاصلہ پیدا کر کے لیٹ جانا چاہیے۔ اگر کوئی بیٹھے رہنا پسند کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں لیکن خیال

رہے کہ اگر گرنے کی نوبت آ گئی تو وہ اپنا جسم سنبھال نہیں سکے گا...... گرنے کی صورت اسی وقت ظہور میں آتی ہے جب انسان کا جسم مکمل طور پر سکون میں آ چکا ہو اور اس وقت اسے کنٹرول کرنے کی کوشش اس کو مکمل سکون سے محروم کر دے گی۔

لہٰذا ہم کو ان تین مراحل سے گذرنے کے بعد چوتھے مرحلے میں دس منٹ تک خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھنا ہے۔ ان تین دنوں میں، خاموشی کی اس کیفیت میں آپ کی کوشش ارادی طور پر موت کا مشاہدہ کرنے کی ہونی چاہئے، اسے نازل ہونے دیا جائے۔ اس دوران میں آپ کو ہدایات دیتا رہوں گا کہ آپ کا جسم پرسکون ہو رہا ہے، سانس استغراق میں جا رہا ہے، ذہن قطعی طور پر خیالات سے آزاد ہو رہا ہے۔ پھر میں خاموش ہو جاؤں گا، روشنیاں بند کر دی جائیں گی، اور دس منٹ تک یونہی خاموشی سے لیٹے رہنا ہوگا۔ اس دوران آپ کے اندر جو کچھ بھی ہو رہا ہو آپ کو بالکل بے حس و حرکت اور خاموش رہتے ہوئے اس کا مشاہدہ کرنا ہے۔

اپنے مابین کافی فاصلہ پیدا کر لیں مبادا جسم گرے تو اس سے کوئی اور متاثر نہ ہو۔ وہ لوگ جو لیٹنا چاہیں وہ خصوصی طور پر اپنے اطراف کافی فاصلہ پیدا کر لیں۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ ریت پر خاموشی سے لیٹ جائیں۔ کسی قسم کی گفتگو نہیں کرنی...... درمیان سے سلسلے کو ترک نہیں کرنا۔

بس ٹھیک ہے۔ سب لوگ بیٹھ جائیں، جو جہاں ہیں وہیں بیٹھیں یا لیٹ جائیں...... آنکھیں بند کر لیں اور اپنے جسم کو آزاد چھوڑ دیں۔ بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں، پھر جیسے ہی میں ہدایات دینا شروع کروں، میرے ساتھ وہ ان کیفیات کو محسوس کرنا شروع کریں، جیسے ہی آپ محسوس کرنا شروع کریں گے جسم بتدریج سکون پذیر ہوتا جائے گا۔ پھر عالمِ مدہوشی میں آپ کا جسم گرنے لگے گا اور ایسا محسوس ہوگا جیسے اس میں زندگی موجود ہی نہیں ہے۔

اب محسوس کرنا شروع کیجیے...... جسم سکون میں آ رہا ہے...... اسے پرسکون ہونے دیں، اپنے جسم کو سکون لینے دیں اور ساتھ ہی محسوس بھی کریں کہ وہ سکون پذیر ہو رہا ہے۔ محسوس کریں، اپنے جسم کے ہر حصے کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں اور اندرونی طور پر اس تبدیلی کو محسوس کریں، جسم حواس سے لاتعلق ہو رہا ہے، آپکی قوتِ حیات اندر کی جانب منتقل ہو رہی ہے۔ آپ کے جسم کی تمام تر توانائی واپس ہو رہی ہے، اس کا رخ اندر کی طرف ہے۔ توانائی واپس ہو رہی ہے اور جسم

پرسکون ہو رہا ہے...... جسم پرسکون ہو رہا ہے...... جسم پرسکون ہو رہا ہے...... ہونے دیں...... مکمل طور پر ہونے دیں، کسی مزاحمت کے بغیر...... بالکل ایسے جیسے اب آپ زندہ ہی نہیں ہیں۔ جسم جیسا چاہے اسے گرنے دیں...... اسے بالکل ہی ڈھیلا چھوڑ دیں۔ جسم پرسکون ہو گیا ہے...... جسم بالکل پرسکون ہو گیا ہے...... جیسے اس میں حیات کی کوئی رمق موجود نہیں۔ جسم پرسکون ہو گیا ہے...... جسم پرسکون ہو گیا ہے...... جسم پرسکون ہو گیا ہے...... جسم پرسکون ہو گیا ہے...... جسم پرسکون ہو گیا ہے...... ہونے دیں، مکمل طور پر ہونے دیں ایسے گویا جسم موجود ہی نہیں ہے۔

ہم اندر آ چکے ہیں۔ جسم قطعی بے حس ہو چکا ہے۔ جسم قطعی بے حس ہو چکا ہے۔ جسم قطعی بے حس ہو چکا ہے، سانسیں خاموشی کی طرف گامزن ہیں۔ اپنی سانسوں کو بھی خاموش ہو جانے دیں۔ انھیں مکمل طور پر خاموش ہو جانے دیں، انھیں خود اپنے طور پر آزادی سے آنے جانے دیں آپ بس انھیں بھی ڈھیلا چھوڑ دیں۔ ان کو آہستہ کرنے یا روکنے کی کوشش نہ کریں۔ بس ان کو خودکار طریقے پر آنے جانے دیں۔ ان کو اتنا اندر آنے دیں جتنا یہ آنا چاہیں...... ان کو باہر بھی اتنا جانے دیں جتنا یہ جانا چاہیں۔ سانسیں بھی مائل بہ سکون ہو گئی ہیں...... سانسیں خاموشی اختیار کر رہی ہیں۔

اس کو اس طرح محسوس کریں: سانسیں خاموشی اختیار کر رہی ہیں...... سانسیں خاموش اور سکون پذیر ہو رہی ہیں، سانسوں کا عمل پرسکون طور پر جاری ہے۔ سانس بالکل خاموش ہو چکی ہے اب ذہن کو پرسکون ہونے دیں اور محسوس کریں کہ خیالات میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ذہن پرسکون ہو گیا ہے۔ ذہن پرسکون ہو گیا ہے۔

☆

دوسرا باب

زندگی خواب ہے

عزیزانِ گرامی!

گذشتہ رات کی گفتگو کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے گئے ہیں:

ایک دوست کا سوال ہے:

" کہا جا سکتا ہے کہ کسی مرنے والے کی زندگی کا اختتام مکمل ہوش و حواس میں ہو' مگر اپنی پیدائش کے وقت وہ کس طرح ہوش و حواس میں رہ سکتا ہے؟"

اصل میں موت و حیات دو علیحدہ علیحدہ واقعات نہیں ہیں' وہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں...... بالکل ایسے جیسے ایک سکے کے دو رخ۔ اگر کسی انسان کے ہاتھ میں سکے کا ایک رخ ہے تو یقیناً دوسرا رخ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ میں سکے کا ایک رخ اپنے ہاتھ میں لے کر سوچوں کہ اس کا دوسرا رخ کیسے حاصل کروں؟ دوسرا رخ تو خود بخود مجھے حاصل ہے۔

موت و زیست اسی نوعیت کا معاملہ ہے۔ اگر موت حواس قائم رہنے کے دوران واقع ہوگی تو لامحالہ زندگی بھی حواس قائم رہتے ہوئے حاصل ہوگی۔ اگر موت لاعلمی کے عالم میں واقع ہوگی تو زندگی بھی لاعلمی کی کیفیت میں ملے گی۔ اگر ایک شخص اپنی موت کے وقت مکمل حالتِ حواس میں تھا تو اس کو دوسری زندگی کے وقت بھی ہوش و حواس سے مزین کر دیا جائے گا۔

ہم لوگ بے خبری میں مارے جاتے ہیں اور بے خبری کے عالم میں ہی پیدا ہوتے ہیں اس لیے ہمیں اپنی گذشتہ زندگیوں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا' اس کے باوجود ہماری پچھلی زندگیوں کی یادداشت ہمارے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں محفوظ رہتی ہیں اور اگر ہم چاہیں تو اس

یادداشت کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

پیدائش کے لیے ہم پیشگی کچھ نہیں کر سکتے۔ اور موت کے لیے بھی ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اپنی زندگی میں ہی کر سکتے ہیں۔ جو انسان بے خبری کے عالم میں فوت ہو رہا ہے' وہ اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ دوبارہ پیدا نہ ہو...... دوسرا کوئی راستہ نہیں' وہ لامتناہی بے خبری میں ہی مبتلا رہے گا۔ پس اگر آپ پچھلی بار بے خبری کے عالم میں فوت ہوئے تھے' تو تم آپ دوبارہ بے خبری کے عالم میں ہی پیدا ہونا پڑے گا۔ غرضیکہ جو کچھ بھی کرنا مقصود ہے وہ موت سے پہلے ہی کرنا ہے' کیونکہ مرنے سے پیشتر ہمارے پاس لامحدود مواقع ہیں' جو ہم کو تمام زندگی حاصل رہیں گے۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ضرور ہوش میں آنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر بیداری کے لیے زندگی کے آخری لمحات کا انتظار کیا جائے تو یہ بڑی غلطی ہوگی۔ موت کے وقت کسی کو ہوش میں آنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ آگہی کے سفر (سادھنا) کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ابتدا موت آنے سے بہت پہلے کر لی جائے جس کے لیے باضابطہ منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔ پیشگی تیاری کے بغیر انسان ہوشمندی کے ساتھ موت سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا۔ بہرنوع اگر وہ حیاتِ نو کے وقت حواس میں رہنے کے لیے آمادہ نہیں ہے تو موت کے وقت بیہوشی کا عالم طاری ہو جانا اس کے حق میں بہتر ہی ہے۔

غالباً 1915ء میں کاشی کے حکمران کو معدے کے ایک آپریشن کی ضرورت پڑ گئی بیہوشی کی دوا استعمال کرائے بغیر وہ دنیا کا اول ترین آپریشن تھا۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والے تین معالجوں نے بے ہوش کیے بغیر آپریشن کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک بڑا آپریشن ہے جس میں معدے کو ڈیڑھ سے دو گھنٹے تک کھلے رہنا ہے' اور بیہوش کیے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس میں ایک بڑا خطرہ تھا...... ان کے خیال کے مطابق درد کی شدت سے مریض چلا سکتا تھا...... حرکت کر سکتا تھا...... اچھل کر گر سکتا تھا...... کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر یہ آپریشن بے ہوش کیے بغیر عمل میں لانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

مگر وہ حاکم بضد رہا کہ جب تک وہ محوِ استغراق رہے گا تب تک تشویش کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک اطمینان سے عالمِ استغراق میں رہ سکتا ہے۔ وہ بیہوشی کی دوا استعمال کرنے سے گریزاں تھا' اس کا کہنا تھا کہ وہ ہوش کے عالم میں ہی یہ آپریشن کرانا چاہتا

ہے۔ بہر حال ڈاکٹر ایسا کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہے تھے اور ان کو یقین تھا کہ ہوش میں رہتے ہوئے کوئی بھی اتنی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ جب کوئی راستہ نہیں بچا تو ڈاکٹروں نے تجرباتی طور پر اس سے محوِ استغراق ہونے کی فرمائش کی۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے ہاتھ کو ایک جگہ کاٹا...... اور دیکھا کہ اس میں ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔ دو گھنٹے تک اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا' البتہ دو گھنٹے بعد اس نے ہاتھ میں تکلیف کا اظہار کیا۔ بعدہٗ آپریشن کر دیا گیا۔

یہ دنیا کا پہلا آپریشن تھا جس میں سرجنوں نے مریض کو بیہوش کیے بغیر دو گھنٹے تک اس کا معدہ کھول کر اپنا کام کیا اور کامل دو گھنٹے کے اس آپریشن کے اختتام تک وہ حکمران مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس نوعیت کی آگہی میں رہنے کے لیے بہت گہری محویت کی ضرورت ہے۔ اس قدر حواس قائم رکھنے کے لیے محویت بھی اتنی ہی گہری ہونی چاہئے کہ ذات اور جسم کا ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہونے کے بارے میں ہلکا سا شبہ بھی نہ رہے۔ ایسی حالت میں جسم کے ساتھ خفیف سا رابطہ بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔

ان معنوں میں موت بھی ایک عظیم الشان سرجری ہے۔ کسی معالج نے کبھی اتنا بڑا آپریشن نہیں کیا ہوگا جتنا بڑا یہ آپریشن ہے۔ اس کے ساتھ ایک ایسا عمل وابستہ ہے جس میں ایک جسم کی تمام تر توانائی ایک دوسرے جسم (پران) میں منتقل کی جاتی ہے۔ اس نوعیت کا آپریشن نہ تو آج تک کیا جا سکا ہے اور نہ یہ عملاً دائرۂ امکان میں ہے۔ ہم کسی جسم کا کوئی بھی حصہ کاٹ کر علیحدہ کر سکتے ہیں' یا کوئی حصہ کسی دوسرے سے تبدیل بھی کر سکتے ہیں' مگر موت کا معاملہ قطعی دوسرا ہے' اس میں ایک جسم کی مکمل توانائیاں نکال کر دوسرے مادی جسم میں داخل کی جاتی ہیں۔

فطرت نے ایک خاص حکمت کے تحت اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ اس موقعہ پر ہم مکمل بے ہوشی کی حالت میں آجاتے ہیں: یہ خود ہماری بہتری کے لیے ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس عمل کے دوران ناقابلِ برداشت تکلیف محسوس کرتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ موت کی تکلیف کے پیش نظر ہماری بے ہوشی کا انتظام رکھا گیا ہو۔ یہ خود ہمارے مفاد میں ہے کہ اس وقت ہم پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ قدرت نہیں چاہتی کہ ہمارے حافظے میں موت کے مرحلے سے گذرنے کی یادداشت باقی رہے۔

ہم اپنی ہر زندگی میں کم و بیش وہی غلطیاں دہراتے رہتے ہیں جو ہم اپنی گذشتہ

زندگیوں میں دہرا چکے ہیں۔ اگر ہم یاد کر سکیں کہ ہم اپنی پچھلی زندگی میں کیا کر چکے ہیں' ہو سکتا ہے کہ ہم دوبارہ ان ہی گڑھوں میں نہ گریں۔ اور اگر ہم اپنی تمام گذشتہ زندگیوں کی کارگذاریاں یاد رکھ سکتے تو ہم یقیناً اس حال میں نہ ہوتے جس میں ہم اس وقت مبتلا ہیں۔ ہم ہمیشہ ایک جیسے رہ بھی نہیں سکتے کیونکہ ہم ہر وقت دولت جمع کرنے میں لگے ہوتے ہیں اور ہر مرتبہ موت اس دولت کو بے معنی بناتی رہتی ہے۔ ان باتوں کو اگر ہم یاد رکھ سکتے تو ہمیشہ کی طرح ہم دولت جمع کرنے کے خبط میں مبتلا نہیں رہتے۔ ہزاروں بار ہم محبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور ہر بار اس کو قطعی بے معنی پاتے ہیں۔ ماضی کی زندگیوں کی یہ باتیں اگر ہم کو یاد رہ جایا کرتیں تو ہم محبت کرنے اور محبت کیے جانے کی طرف کبھی راغب نہیں ہوتے۔ ہزاروں بار ہم نے کوششیں کی ہیں' خود غرض رہے ہیں' کامیابیاں حاصل کی ہیں' اونچے مرتبے تک پہنچے ہیں' لیکن ہر بار یہ سب کچھ بے معنی ثابت ہوتا رہا ہے' سب کچھ مٹی میں ملتا رہا ہے۔ ذرا سوچیں کہ اگر یہ سب واقعات ہمارا حافظہ ہمیں یاد دلاتا رہتا تو شاید ہمارا جدوجہد کا جذبہ سرد پڑ جاتا اور ہم کبھی اس حال میں نہیں ہوتے جس میں ہم اس وقت ہیں۔

چونکہ ہم کو اپنی پچھلی زندگیوں کے بارے میں کچھ یادداشت نہیں ہوتی اس لیے ہم آنکھیں بند کیے اسی ایک دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ کوئی انسان یہ جان ہی نہیں پاتا کہ وہ اس دائرے میں پہلے بھی گھومتا رہا ہے' اور اب دوبارہ بھی وہ اسی دائرے میں اسی امید کے ساتھ گھوم رہا ہے جو امید لیے وہ پہلے بھی سرگرداں رہا ہے۔ پھر موت انسان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتی ہے' اور ایک بار پھر وہی شب و روز۔ انسان اس دائرے میں اسی طرح گھومتا ہے جیسے کولھو کا بیل۔

انسان اپنے اس نقصان سے بچ سکتا ہے مگر اس کے لیے بہت زیادہ آگہی اور تجربات کی ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کوئی انسان خود کو موت کے حوالے کرنے کے لیے ہر وقت تیار بھی نہیں رہتا' موت کے اس دھچکے اور اتنے بڑے آپریشن کے دوران وہ خود آگہی کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اس کے لیے ہم کو نہایت آہستگی کے ساتھ تجرباتی مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ کسی تکلیف میں پڑے بغیر ضروری تجربات سے گذرنا ہوتا ہے۔ نہایت آہستہ روی کے ساتھ' اس لیے کہ ہم ان مراحل سے گذرنے کے دوران ان کو جان بھی سکیں۔

مثال کے طور پر آپ کو سر درد ہے تو آپ ایک ہی لمحے میں یہ جان لیتے ہیں کہ آپ کو سر درد ہے نا یہ کہ آپ کا سر درد میں مبتلا ہے۔ لہٰذا سر درد کے ابتدائی مرحلے میں تجربہ سکھا دے گا کہ سر میں درد ہے اور میں اس سے آگاہ ہوں۔

جب سوامی رام جی امریکہ میں تھے تو ابتدا میں وہاں کے لوگ ان کی بات سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ جب امریکہ کے صدر نے ان کے استھان پر حاضری دی تو وہ بھی الجھ گئے اور کہنے لگے کہ یہ کونسی زبان ہے؟ کیونکہ سوامی جی صیغۂ واحد غائب میں گفتگو کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ میں بھوکا ہوں بلکہ وہ کہتے تھے کہ رام بھوکا ہے۔ وہ نہیں کہتے تھے کہ مجھے سر درد ہے بلکہ وہ کہتے کہ رام کو سخت سر درد ہے۔

ابتدا میں لوگوں کو ان کی بات سمجھنے میں خاصی دقت ہوتی تھی۔ ایک روز وہ کہنے لگے کہ گذشتہ رات رام سردی میں سکڑا جا رہا تھا...... جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ تو وہ کہنے لگے کہ ان کی مراد رام سے ہے۔ ان سے جب دوبارہ پوچھا گیا کہ کونسا رام؟ تو انہوں نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ رام...... بیچارہ غریب رات بھر سردی سے سکڑتا رہا۔ ہم لوگ ہنستے رہے اور پوچھا کہ رام! سردی کیسی ہے؟

وہ کہتے کہ رام کو راستے سے گذرنے کے دوران لوگ اس پر گالیوں کے ڈونگرے برساتے رہے۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ جاتے اور ہم کہتے کہ رام تم گالیوں کو کیسا سمجھتے ہو؟ اگر تم اعزاز کے خواہشمند ہو تو تم کو یقیناً بے عزتی سے ضرور واسطہ پڑیگا۔ جب لوگ ان سے پوچھتے کہ آپ کس رام کی بات کر رہے ہیں؟ تو وہ انگلی سے اپنی طرف اشارہ کر دیتے۔

انسان کو معمولی درجے کی تکلیفوں سے اپنے تجربات کا آغاز کرنا چاہئے۔ روزمرہ زندگی میں ہر وقت ان سے واسطہ پڑتا ہے...... وہ روزانہ ہی پیش آتی ہیں...... صرف تکلیفیں ہی نہیں ان تجربات میں خوشیوں کو بھی شامل رکھنا ہوگا۔ کیونکہ خوشیوں میں حواس قائم رکھنا بہ نسبت تکلیفوں کے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ سر اور اس میں موجود درد دو علیحدہ چیزیں ہیں البتہ یہ جاننا بہت دشوار ہے کہ کیا جسم علیحدہ ہے اور صحتمند رہنے کی مسرت کوئی جدا چیز ہے...... میں کہ وہ بھی نہیں ہوں۔ اسی طرح جب ہم خوش ہوتے ہیں تو خود اپنے آپ سے یہ فاصلہ برقرار رکھنا بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے' کیونکہ ایسی کیفیت میں ہم خود سے نزدیک تر رہنا پسند

کرتے ہیں۔ جبکہ دکھوں میں' واضح طور پر ہم ان سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ جیسے ہی ہم پر آشکارا ہوتا ہے کہ دکھ دور ہو گئے ہیں ویسے ہی ہم چھٹکارا محسوس کرتے ہیں اور اسی حال میں رہنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

یہ تجربہ بھی لازم ہے کہ جس طرح ہم خوشی کے دوران حواس میں رہتے ہیں اسی طرح دکھوں کے دوران بھی رہ سکیں۔ جو کوئی بھی اس نوع کے تجربات کرتا رہے گا' لازم ہے کہ ان تجربات کے نتیجے میں وہ اپنی مرضی سے خود کو دکھوں میں مبتلا کرتا رہے گا۔ بنیادی طور پر یہی تمام تپساؤں اور ریاضتوں کا جزو ہے۔ یہ خود کو رضا کارانہ دکھوں میں مبتلا کرنے کا طریقہ ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص روزہ رکھے ہوئے ہے۔ بھوکا رہ کر وہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ بھوک اس کے شعور پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے۔ عموماً کسی روزہ دار کو یہ شائبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے...... وہ صرف یہ جانتا ہے کہ وہ بھوکا ہے' اور اس کو خوراک حاصل کرنے کا انتظار ہے۔

روزہ کا بنیادی مقصد ایک خاص کیفیت کو محسوس کرنا ہے اور وہ یہ کہ بھوک موجود ہونے کے باوجود مجھ سے فاصلہ پر ہے۔ میرا جسم بھوکا ہے' میں قطعی نہیں۔ سو خود پر اپنے ارادے سے بھوک مسلط کر کے وہ اپنے اندر سے یہ جاننا چاہتا ہے کہ آیا وہاں بھوک موجود ہے؟ "رام بھوکا ہے...... میں نہیں...... میں جانتا ہوں کہ بھوک ہے' اور یہ صورت اس وقت تک موجود رہے گی جب تک میں ایک ایسے نکتے تک رسائی حاصل نہ کر لوں گا جب میرے اور بھوک کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہو جائے گا...... جہاں بھوک کا احساس فنا ہو جائے گا...... بھوکا ہونے کے باوجود مجھے بھوک محسوس نہیں ہوگی۔ صرف میرے جسم کو بھوک محسوس ہوگی' اور مجھے اس کا ادراک ہوگا۔ میری حیثیت صرف ایک گواہ کی رہ جائے گی" تب روزے کی اصل حقیقت آشکار ہوگی...... تب وہ محض بھوکا رہنا نہیں رہے گا۔

عموماً جب کوئی روزہ رکھتا ہے تو وہ تمام دن یہ دہراتا رہتا ہے کہ وہ بھوکا ہے اور یہ کہ اس نے تمام دن کچھ نہیں کھایا ہے۔ اس کا ذہن اگلی بار ملنے والی خوراک کی اشتہا محسوس کرتا رہے گا۔ اس نوعیت کے روزہ کی کوئی اہمیت نہیں' ایسی حالت میں یہ صرف خود کو کھانے سے روکنا ہے۔ خود کو کھانے سے روکنے اور برت رکھنے کے مابین بنیادی فرق یہ ہے: روزے کا مطلب ہے نزدیک سے نزدیک تر رہنا...... کس کے نزدیک؟ مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ سے نزدیک رہنا اور جسم و

جاں کے مابین زیادہ زیادہ سے فاصلہ پیدا کرنا۔

برت کا مطلب یہ نہیں کہ بس خوراک چھوڑ دی جائے۔ برت کا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ نزدیک رہنا...... کس کے نزدیک؟ یعنی اپنے آپ سے قریب تر۔ خود سے نزدیک اور جسم سے حتی الامکان دور۔ پھر ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص کھاتا رہنے کے باوجود برت کی حالت میں رہے۔ اگر وہ کھانے کے دوران اندر سے آگاہ ہو کہ کھانے کا یہ عمل کہیں اور جاری ہے' اور ہوشمندی اس عمل سے قطعی بے تعلق ہے' تب یہ برت کہلائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص درحقیقت روزے سے نہ ہو حالانکہ وہ خوراک سے اجتناب کرتا رہا ہے کہ وہ بہ قائمی ہوش وحواس خوب جانتا ہے کہ وہ بھوکا ہے اور بھوک سے مرا جارہا ہے۔ بھوک کے احساس کو خود سے دور رکھنا۔ ایک نفسیاتی آگہی کا نام ہے...... جس کو روزہ (برت) کہتے ہیں۔

اس نوع کی دیگر تکالیف بھی رضا کارانہ تخلیق کی جاسکتی ہیں۔ ہر چند کہ اس طرح کی تخلیق بہت گہرے تجربے کی متقاضی ہے۔ کوئی شخص کانٹوں پر محض یہ تجربہ کرنے کے لیے لیٹ سکتا ہے کہ کانٹے اس کے جسم کو چبھ رہے ہیں اسے خود کو نہیں۔ لہٰذا شعور اور جسم کے مابین علیحدگی پیدا کرنے کے لیے کوئی تکلیف از خود بھی اختیار کی جاسکتی ہے۔

مگر دنیا میں بہت سے مصائب بن بلائے موجود ہیں...... مزید مشکلات کو آواز دے کر بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت سارے دکھ پہلے سے دستیاب ہیں...... انہی سے تجربات کا آغاز کرنا چاہیے۔ پریشانیاں بہرحال بغیر بلائے آجاتی ہیں۔ اگر ان ابتلاؤں کے دوران انسان یہ شعور برقرار رکھ سکے کہ وہ اپنی تکلیفوں سے غیر متعلق ہے' تب وہ تکلیف ایک روحانی ضابطہ (سادھنا) بن جاتی ہے۔

انسان کو اپنے اوپر یہ کیفیت ان مسرتوں پر بھی برقرار رکھنی چاہئے جو خود بخود آتی رہتی ہیں۔ مصائب مبتلا رہتے ہوئے تو یہ ہوسکتا ہے کہ ہم خود کو فریب دینے میں کامیاب ہوجائیں اور خود کو سمجھالیں کہ "میں تکلیف میں نہیں ہوں" لیکن جب خوشیوں کا دور ہو تو ان سے اپنی بے تعلقی کا تصور قائم کرنا بے حد مشکل ہوگا کیونکہ انسان ہر صورت میں خوش رہنا چاہتا ہے۔ لہٰذا مسرتوں کے ہوتے ہوئے خود کو تکلیف میں سمجھنا ناممکن ہوگا۔

حقیقتاً خوشیوں سے خود کو علیحدہ سمجھنے سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مرحلہ نہیں۔ کیونکہ انسان

ہر صورت خوشیوں کے سمندر میں غوطہ زن رہنا چاہتا ہے اور یہ قطعی بھول جاتا ہے کہ اس کا اور ان کا کوئی ساتھ نہیں۔ خوشی ہمیں ڈبو دیتی ہے' تکلیفیں ہم کو خود سے کاٹ کر علیحدہ کردیتی ہیں۔ بہرنوع ہم یقین کرلیتے ہیں کہ ہمیں مصائب سے اپنا تعلق اس لیے قبول کرنا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسری ترجیح نہیں ہوتی۔ لیکن خوشیوں کو ہم دل وجان سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

جو مشکلات آپ کے راستے میں آئیں ان سے خبردار رہیں۔ جو خوشیاں آپ کو ملیں ان سے خبردار رہیں...... اور کبھی کبھی' صرف تجربہ کے طور پر' اپنی خود ساختہ تکلیفوں سے بھی خبردار رہیں کیونکہ ایسی صورت میں حالات کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ ہم اپنے اوپر خود بلائی ہوئی تکلیفوں میں کبھی بھی اپنے آپ سے شناسا نہیں ہوسکتے۔ یہ علم کہ یہ آفت ہم نے خود مول لی ہے' فاصلے پیدا کرتا ہے۔ وہ مہمان جو آپ کے گھر آتا ہے وہ آپ کے گھر کا حصہ نہیں ہوتا...... وہ مہمان ہے۔ بالکل اسی طرح جب ہم مصائب کو اپنے یہاں مدعو کرتے ہیں تو یہ طے ہے کہ وہ تو پہلے ہی ہم سے جدا حیثیت رکھتے ہیں۔

ننگے پیر چلتے ہوئے آپ کے پیر میں کانٹا چبھ جاتا ہے۔ یہ ایک حادثہ ہے اور اس کی تکلیف حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ناخوشگوار حادثہ' اس واقعے سے قطعی طور پر مختلف ہوگا جب آپ خود اپنے ارادے سے ایک کانٹا لیکر اپنے پاؤں میں چبھالیں...... یہ جانتے ہوئے کہ آپ اپنے پیر میں کانٹا از خود چبھو کر درد کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ میں آپ کو یہ نہیں کہہ رہا کہ چلو اپنے آپ کو یہ اذیت دو! کیونکہ اس سے زیادہ اذیتیں پہلے سے موجود ہیں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ: مسرت یا پریشانی میں مبتلا ہونے سے قبل ان کی طرف سے خبردار رہو۔ بعد میں کسی روز کوئی پریشانی بلاؤ اور دیکھو کہ تم اپنے شعور کو اس سے کتنے فاصلے پر رکھ سکتے ہو۔

یاد رکھیں! کہ از خود کسی پریشانی کو دعوت دینا غیر معمولی بات ہے۔ کیونکہ ہر کوئی خوشیوں کی تلاش میں رہتا ہے اور کوئی بھی اپنے ہوش وحواس میں دکھوں کو دعوت نہیں دیتا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جو مشکلات ہم نہیں چاہتے وہ بن بلائے آجاتی ہیں' اور خوشیاں جن کے ہم متلاشی رہتے ہیں وہ کبھی نہیں آتیں۔ بالفرضِ محال اگر کبھی آ بھی جاتی ہیں تو دروازے سے باہر ہی کھڑی رہتی ہیں۔ جن خوشیوں کو ہم بلانا چاہیں وہ کبھی نہیں آتیں اور جن خوشیوں کا ہمیں تصور بھی نہیں ہوتا وہ درانہ اندر داخل ہوجاتی ہیں۔ جب ایک انسان پریشانیوں میں پڑنے کے لیے کافی

شکتی جمع کر لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اتنا خوش ہے کہ اب از خود کوئی پریشانی مول لے سکتا ہے۔ اس کے دامن میں اتنی مسرتیں بھری ہوئی ہیں کہ اس کو دکھ بھرے دن کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کر سکتے۔ اب اس کی زندگی میں کوئی بھی دکھ آ سکتا ہے۔

مگر یہ بہت گہرا مشاہدہ ہے۔ جب تک ہم اس تجربہ کے لیے خود کو آمادہ کر پائیں، ہم کو ان تمام مشکلات کے لیے تیار رہنا چاہئے جو اس صورت میں ہمارے اوپر نازل ہو سکتی ہیں۔ ہم اگر اپنے اوپر آنے والی تمام مشکلات کے لیے پیشگی تیار رہیں تو اس طرح ہم موت کی آمد پر بھی ہوش و حواس میں رہنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ قدرت ہمیں موت کے وقت حواس میں رہنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ اسے علم ہے کہ جب ایک انسان تکلیف کے دوران اپنے ہوش میں رہ سکتا ہے تو موت کی آمد پر بھی وہ اپنے ہوش نہیں بھلائے گا۔ اگر اس کیفیت کا پیشگی تجربہ نہ ہو تو موت کی اچانک آمد پر ہر کوئی اپنے حواس بھلا دیتا ہے۔

کچھ برس پہلے پی ڈی اوسپنسکی نامی ایک شخص کا انتقال ہوا۔ وہ روس کا ایک بہت بڑا حساب دان تھا۔ وہ واحد آدمی تھا جس نے موت کے سلسلے کے نہایت گہرے مشاہدات کیے۔ اپنی موت سے تین مہینے قبل وہ شدید بیمار ہوا۔ معالجوں نے اس کو سختی کے ساتھ بستر میں آرام کرنے کے لیے کہا لیکن اس نے انسانی تصور سے ماورا ایسے اقدامات کیے کہ کوئی یقین نہیں کر سکتا۔ وہ راتوں کو نہیں سوتا، سفر میں رہتا، چلتا رہتا، دوڑتا رہتا، مختصر یہ کہ وہ ہر وقت حرکت پذیر رہتا۔ معالجین حیرت زدہ رہ گئے، ان کے خیال میں اس کو بہت زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ اوسپنسکی نے اپنے تمام نزدیکی دوستوں کو جمع کر لیا لیکن کسی سے کچھ کہا نہیں۔

وہ تمام احباب جو تین مہینے اس کی موت تک اس کے ساتھ رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک شخص کو حالتِ ہوش میں مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حالانکہ انہوں نے اوسپنسکی کو بار ہا ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے کہا مگر وہ ایک ہی جواب دیتا: میں ہر قسم کی تکلیف کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں خواہ موت کی تکلیف اتنی بڑی کیوں نہ ہو کہ میں اس کی شدت سے بے ہوش ہو جاؤں۔ میں موت سے قبل ایسی تمام تکالیف سے گذرنا چاہتا ہوں جن کے نتیجے میں میرے اندر اتنی شکتی پیدا ہو جائے کہ میں موت کی آمد پر اپنے حواس میں رہ سکوں۔ اس طرح اس نے تین مہینے تک ہر تکلیف برداشت کرنے کی مثالی جرأت کا مظاہرہ کیا۔

اس کے دوستوں نے لکھا ہے کہ ایسی حالت میں ہر اعتبار سے صحتمند اور دلیر لوگ تھک جاتے مگر اوسپنسکی نے ایسا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر اصرار کرتے رہے کہ اگر وہ مکمل آرام نہیں کرے گا تو نقصان اٹھائے گا...... مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اپنی زندگی کی آخری رات بھی اوسپنسکی اپنے کمرے میں لگاتار ادھر سے ادھر چلتا رہا۔ جن ڈاکٹروں نے اس وقت اس کا معائنہ کیا انہوں نے وضاحت سے یہ اعلان کیا کہ اس کی ٹانگوں میں اب چلنے پھرنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ تمام رات چلتا رہا۔

اس نے کہا کہ بیٹھ کر بے ہوشی کی حالت میں مرنے کے بجائے وہ چلتے پھرتے مرنا بہتر سمجھتا ہے ورنہ وہ بیٹھے ہوئے یا لیٹے لیٹے بے ہوشی کی حالت مر جائیگا۔ اسی حالت میں چلتے چلتے اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ، کچھ ہی دیر میں، شاید مزید دس قدم اور...... اس کے بعد سب کچھ ختم سمجھو...... لگتا ہے کہ میں ڈوب رہا ہوں...... مگر مجھے اپنے آخری قدم تک چلتے رہنا چاہئے۔ مجھے اپنے آخری سانس تک کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہئے، ورنہ موت مجھ کو لاعلمی کی حالت میں آدبوچے گی۔ میں پرسکون ہو کر سو بھی سکتا ہوں...... مگر میں موت کے اختتامی لمحات میں ایسا نہیں چاہتا۔

اوسپنسکی آخری قدم تک چلتا رہا۔ شاید کم ہی لوگ دنیا میں اس طرح چلتے چلتے اپنے اختتام کو پہنچے ہوں۔ وہ چلتے چلتے گر گیا، یعنی وہ اس وقت ہی گرا جب اس کو موت نے گھیر لیا۔ اپنا آخری قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کہا: اب میں گرنے ہی والا ہوں۔ مگر رخصت ہونے سے قبل میں سب کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنا جسم بہت پہلے چھوڑ چکا تھا، تم کو محسوس ہو رہا ہوگا کہ اپنا جسم میں اب چھوڑ رہا ہوں، مگر بہت پہلے اسے چھوڑ چکا ہوں اس کے باوجود دیکھیے کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ جسم سے میرے تمام رشتے منقطع ہو چکے ہیں، لیکن اپنی ذات کے اندر میں ابھی موجود ہوں۔ اب صرف میرا جسم گرے گا اور ایسی کوئی صورت نہیں کہ میں گر جاؤں۔

اس کی موت کے وقت اس کے دوستوں نے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی روشنی کا مشاہدہ کیا۔ ایک ٹھہراؤ، اور جوشِ مسرت اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ ایک ایسی کیفیت جو زندگی کے داخلی دروازے پر کھڑے ہوئے کسی انسان کی آنکھوں میں ہی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے انسان کو شعوری کوشش کرنا لازم ہے۔ ایک لگاتار جدوجہد۔ اگر کوئی انسان اس کے لیے

اپنے آپ کو مکمل طور پر آمادہ کر لے تو موت اس کے لیے ایک بیش بہا تجربہ ہوگی۔ اس صورتِ حال سے زیادہ قیمتی کوئی اور موقعہ ممکن نہیں' کیونکہ موت کے وقت جو کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ کسی اور موقعے پر ہرگز نہیں۔ پھر موت سے ایک انسیت محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے' کیوں کہ آخری لمحے میں ہی آگاہی ہوتی ہے کہ ہم ایک مادی وجود ہیں...... اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

یاد رکھیے کہ رات جتنی کالی ہوگی' ستارے اتنے ہی چمک دار ہوں گے۔ گہرے سیاہ بادلوں میں روشنی کی چمک ایک نقرئی لکیر لگتی ہے۔ اسی طرح جب موت ہم کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے عین اسی وقت ہمارے اندر' ہمارے مرکز میں زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں...... کبھی نہیں۔ جب موت ہم کو ایک گہری تاریکی کی صورت میں گھیر لیتی ہے۔ اس وقت درمیان میں...... زندگی کے مرکز میں...... اسے آتما کہیں یا روح کہیں ...... اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی ہوتی ہے۔ چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی اس کو مزید روشن کر دیتی ہے۔ مگر اس وقت ہم حواس میں نہیں رہ پاتے' موت کے بالکل آخری لمحات میں' جو دوسری صورت میں ہم سے ہماری آگاہی کا سبب بن سکتا تھا' ہمارا شعور ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے اپنی آگہی کو بیدار رکھنے کے لیے پیشگی کوشش کرنا ضروری ہے۔ اور دھیان ہی وہ کوشش ہے۔

دھیان' اس تجربے کا نام ہے جو بتدریج رضا کارانہ موت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وہ تجربہ ہے جو ہم کو خود اپنی ذات کے اندر داخل ہو کر جسم کو چھوڑ دینا سکھاتا ہے۔ اگر کوئی تمام زندگی غور و فکر میں غرق رہے گا تو وہ زندگی کے اختتام پر پوری طرح اپنی شعوری کیفیات برقرار رکھ سکے گا۔

جب موت پوری شعوری حالت میں آتی ہے تو انسان کی روح اپنا دوسرا جنم بھی پوری شعوری حالت میں لیتی ہے۔ پھر اس کی زندگی کا پہلا دن لاعلمی کے اندھیروں کے بجائے پوری طرح آگہی کی کیفیت میں نمودار ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ بطنِ مادر میں بھی پوری طرح ہوش و حواس میں رہتا ہے۔ جو انسان شعور کی حالت میں فنا سے دوچار ہوتا ہے اس کے پاس شعور کی حالت میں دوبارہ پیدا ہونے کا صرف ایک موقعہ ہوتا۔ اس ایک موقعے کے بعد اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ جس کو یہ تجربہ ہو جائے کہ پیدائش کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت

کیا ہے؟ وہ نجات (مکتی) حاصل کر لیتا ہے۔ موت و حیات کے چکر سے فارغ ہو جاتا ہے۔

وہ لوگ جو شعور کی حالت میں موت سے ہم کنار ہوں ان کو ہم اوتار' تیر تھنکر' بدھ' مسیح اور کرشنا کے نام سے جانتے ہیں۔ اور جو چیز ان کو ہم سے علیحدہ کرتی ہے وہ علم ہے' آگہی ہے۔ وہ جاگتے ہیں جب کہ ہم سو رہے ہیں۔ شعوری حالت میں مرنے کی وجہ سے وہ دنیا میں آخری مرتبہ وارد ہوئے۔ ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں۔ کوئی ایسی چیز جو وہ بلا تکان ہم کو منتقل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہمارے اور ہمہ وقت بیدار ان لوگوں کے درمیان ایک ہی فرق ہے: ان کی گذشتہ موت اور اس کے بعد کی زندگی شعوری حالت میں رونما ہوئیں...... پس وہ اپنی پوری زندگی مکمل آگاہی کی کیفیت میں بسر کرتے ہیں۔

تبت کے علاقے کے لوگ مسلسل 'بردو' کے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت قیمتی تجربہ ہے جو صرف موت کے وقت کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص موت کے نزدیک ہوتا ہے تو لوگ اس کے پاس جمع ہو کر اس کو 'بردو' کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر صرف وہی شخص یہ تجربہ کرنے کا اہل ہوتا ہے جو اپنی زندگی کے دوران ارتکازِ توجہ کرتا رہا ہو۔ دوسری صورت میں نہیں۔ بردو کے اس تجربہ میں جیسے ہی کوئی شخص مرتا ہے...... اس کو ہدایات دی جاتی ہیں کہ وہ پوری طرح جاگتا رہے۔ اس کو کہا جاتا ہے کہ وہ مسلسل یہ دیکھتا رہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے کیونکہ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ مرنے والا بہت سی باتوں کو سمجھ نہیں پاتا کیونکہ نئے ماحول کو ایک دم سے سمجھ لینا آسان نہیں ہوتا۔

اگر کوئی انسان مرنے کے بعد ہوش میں رہ سکے تو اسکو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ مر چکا ہے۔ جب لوگ اس کی لاش اٹھا کر اس کو شمشان گھاٹ میں جلانا شروع کرتے ہیں تب اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ مر چکا ہے...... انسان کے اندر کوئی چیز در حقیقت ہلاک نہیں ہوتی...... صرف ایک فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی کے دوران اس فاصلے کا کبھی تجربہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا انوکھا تجربہ ہوتا ہے جس کی کوئی معمول کی تشریح کرنا ہی ممکن نہیں۔ انسان صرف یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی بنیادی چیز علیحدہ ہو گئی ہے۔ مگر کوئی چیز مر گئی ہے...... اس کو وہ صرف اسی وقت جان پاتا ہے جب اس کو گھیرے ہوئے لوگ اس پر گر کر دکھ سے رونا اور چلانا شروع کرتے ہیں اور اس کی چتا جلانے کے لیے اس کو شمشان گھاٹ کی طرف لے چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔

چتا کو جلد سے جلد شمشان گھاٹ لے جانے کی بھی ایک وجہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کی آتما کو یہ یقین دلانا ہوتا ہے کہ جسم مر چکا ہے' اور اس کو جلا کر راکھ کیا جا چکا ہے۔ مگر اس حقیقت سے صرف وہی آگاہ ہو سکتا ہے جو آگہی کی حالت میں مرا ہو۔ بے ہوشی کی کیفیت میں مرنے والا اس حقیقت سے بے بہرہ رہے گا۔ لہٰذا بردو کی حالت میں مرنے والے کو اپنا جسم جلتا ہوا دیکھنے کے لیے چوکنا کیا جاتا ہے "اپنے جلتے ہوئے جسم کو توجہ سے دیکھ لو' عجلت میں اس کو چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش مت کرو' جب لوگ تمھارا شریر جلانے کے لیے لائیں تو یاد رہے کہ تم ان کے ساتھ موجود رہو' اپنے جسم کو پوری توجہ کے ساتھ جلتا ہوا دیکھ لو تا کہ آئندہ تم اس مادی وجود کے ساتھ کسی قسم کا تعلق قائم رکھنے کی خواہش نہ کر سکو"

جب تم ایک بار کسی چیز کو جل کر راکھ ہوتا ہوا دیکھ لو گے تو اس سے تمھارا ہر قسم کا واسطہ ختم ہو جائے گا۔ دوسرے تو بہر حال تمھاری چتا کو جلتا ہوا دیکھیں گے ہی' لیکن ان کے ساتھ جب تم بھی اس کو جلتا ہوا دیکھو گے تو اس سے تمھارا تعلق ختم ہو جائے گا۔ عموماً ہزار میں سے نو سو ننانوے واقعات میں موت کے وقت انسان اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔ اس کو اس وقعے کا ادراک ہی نہیں ہوتا۔ اگر کبھی ایک موقعہ پر جب وہ عالمِ ہوش وحواس میں تھا تو وہ اپنے جسم کو جلتے ہوئے دیکھنے سے پہلے ہی وہاں سے ہٹ گیا' شمشان گھاٹ سے فرار ہو گیا۔ لہٰذا بردو کے تجربے میں اس کو بتایا جاتا ہے کہ خبردار اس موقعہ کو ضائع مت کرو' اپنی چتا کو جلتے ہوئے دیکھتے رہو' صرف ایک بار اور ہمیشہ کے لیے اس کو دیکھ لو۔ دیکھو کہ جس کو تم ہمیشہ اپنا آپ سمجھتے رہے ہو وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ اس کو مکمل طور پر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھ لو تا کہ اپنی آئندہ زندگی میں تم کو یاد رہے کہ 'تم' اصل میں کیا ہو؟

انسان مرنے کے فوراً بعد ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے' ایک ایسی دنیا جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ وہ دنیا ہمارے لیے ڈراؤنی اور خوفناک بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ہمارے ماضی کے ہر قسم کے تجربات سے بالکل علیحدہ ہے۔ یہ نئی دنیا اس کے مقابلے میں زیادہ خوفناک ہو سکتی ہے کہ ہم کسی اجنبی ملک میں چلے جائیں جہاں ہر شخص ہمارے لیے اجنبی ہو' جہاں کی زبان سے' ان کے طرزِ زندگی سے واقفیت نہ ہو۔ اس صورت میں ہم یقیناً حیران و پریشان ہوتے رہیں گے۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ مادی اجسام کی دنیا ہے۔ ہم جیسے ہی یہ دنیا چھوڑتے ہیں تو اس سے جڑی ہوئی دوسری دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جس کا ہمیں ماضی میں کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہمارے پچھلے تمام تجربات سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہمیں خوف وہراس میں مبتلا کر سکتی ہے۔ ہماری اس دنیا میں خواہ کوئی جگہ ہمارے لیے کتنی ہی اجنبی کیوں نہ ہو' وہاں کے باشندے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں' ان کا طرزِ زندگی کتنا ہی بدلا ہوا کیوں نہ ہو اس کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان ایک قدرِ مشترک ضرور باقی رہے گی۔ یہ انسانیت کی فطری قدرِ مشترک ہو گی۔ غیر جسمانی' روحوں کی دنیا کا تجربہ تصور سے زیادہ ہولناک ثابت ہو سکتا ہے۔

عموماً ان حقائق سے ہم بیہوش گذر جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر ہماری توجہ نہیں ہوتی۔ لیکن جو لوگ بقائمی ہوش وحواس ان مراحل سے گذرتے ہیں وہ سخت مشکل میں آ جاتے ہیں' اس لیے بردو کے دوران اس بات کا موقعہ ہوتا ہے کہ مرنے والے کو بتایا جائے کہ وہ دنیا کیسی ہو گی' وہاں کیا ہوتا ہے' کس نوع کے وجودوں سے اس کا واسطہ پڑے گا...... اس تجربے سے وہی گذر سکتے ہیں جن کو گہرے مشاہدے کا تجربہ ہو گا' ورنہ نہیں۔

میں کافی دیر سے محسوس کر رہا ہوں کہ وہ احباب جو دھیان کی مشق کرتے رہے ہیں بردو کے کسی نہ کسی نوع کے تجربے سے گذارے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ اسی صورت میں جب وہ ارتکاز کے گہرے تجربات کر چکے ہوں' ورنہ ان کی سماعت آوازوں کا بار بھی نہیں اٹھا سکے گی۔ ان میں وہ سب سننے اور سمجھنے کی تاب ہی نہیں ہو گی کہ موت کے وقت ان سے کیا کہا جا رہا ہے۔ ان سے کیا کہا جا رہا ہے یہ سمجھنے کے لیے مکمل سکون اور خالی الذہنی کی کیفیت درکار ہوتی ہے۔ جیسے ہی حواس گم ہونا شروع ہوتے ہیں' دنیا سے تمام رشتے ناطے منقطع ہونا شروع ہو جاتے ہیں' اسی وقت ایک پر سکون ذہن اس دنیا سے مرسلہ آوازیں سن سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ آوازیں نہیں سنی جا سکتیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ یہ صورت صرف موت کے زمرے میں ہی ممکن ہے' پیدائش کے سلسلے میں یہ سب کرنا ممکن نہیں۔ مگر یہ کہ ہم جو عمل بھی موت کے سلسلے میں کرتے ہیں وہ بہر حال پیدائش کے مرحلے پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم اسی کیفیت میں پیدا ہوتے ہیں جس کیفیت میں ہماری موت واقع ہوتی ہے۔

ایک بیدار ذہن ہی اپنے لیے اپنی پسند کا بطن اختیار کر سکتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ وہ کبھی کوئی چیز آنکھیں بند کر کے بحالتِ بیہوشی پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے والدین کو اسی طرح منتخب کرتا ہے جیسے کوئی امیر آدمی اپنے لیے گھر منتخب کرتا ہے۔ ایک غریب آدمی کبھی اپنی پسند کا گھر حاصل نہیں کر پاتا۔ اپنی پسند کی کوئی چیز حاصل کرنے کے لیے آپ کی ایک خاص حیثیت ہونی چاہیے۔ کسی کو گھر خریدنے کے لیے اس کے مطابق استطاعت ہونی ضروری ہے۔ ایک غریب آدمی کبھی اپنی پسند کا گھر حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھر ہی غریب کو پسند کرتا ہے۔ ایک غریب گھر ایک غریب مکین کو ہی پسند کرتا ہے۔ ایک لکھ پتی البتہ یہ خود طے کرتا ہے کہ اس کو کہاں رہنا ہے' اس کا باغیچہ کیسا ہونا چاہیے' کھڑکیاں اور دروازے کہاں ہونے چاہئیں......سورج کی کرنیں دائیں جانب سے آئیں یا بائیں جانب سے' روشن دان کیسے ہونے چاہئیں' گھر کتنا کشادہ ہونا چاہیے......غرضیکہ وہ ہر چیز میں اپنی پسند کا خیال رکھ سکتا ہے۔

ایک بیدار ذہن اپنے لیے وہی بطن اختیار کرتا ہے جو اس کی پسند کا ہوتا ہے۔ مہاویر اور گوتم بدھ جیسے افراد ہر کہیں پیدا نہیں ہو جاتے' وہ ہر قسم کے امکانات کو مدِ نظر رکھ کر پیدا ہوتے ہیں: ان کا جسم کیسا ہوگا......اور کون سے والدین کے ذریعے وہ حاصل ہو سکے گا' کس نوعیت کی شکتی اسے حاصل ہوگی......وہ کتنا طاقتور ہوگا......اسے کس قسم کی سہولیات حاصل ہوں گی۔ ان سب معاملات پر پیشگی غور کرنے کے بعد وہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے پاس پورا اختیار ہوتا ہے کہ ان کو کیا پسند کرنا ہے اور کہاں جانا ہے۔ اپنے پہلے دن سے ہی وہ مکمل طور پر اپنی پسند کی زندگی گذارتے ہیں۔

مکمل اپنی پسند کی زندگی جینے کی خوشی ہر اعتبار سے ایک مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اپنی پسند کی زندگی شروع ہونے کے ساتھ ہی مکمل آزادی کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی جو ہمیں بخشی گئی ہو وہ ایک قسم کی غلامی ہوگی جو ہر قسم کے اختیار سے عاری ہوگی۔ اس نوعیت کی زندگی میں جب ہم کو دھکیلا جائے گا تو وہی کچھ ہوگا جو ہوتا ہے......اس میں انسان اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔

اگر اوپر بیان کی گئی آگہی ممکن ہو سکے تو پھر یقیناً اپنی پسند پر عمل درآمد ممکن ہو سکتا ہے۔ اگر ہماری زندگی ہماری پسند کے مطابق عمل میں آئے تو ہم اپنی باقی ماندہ زندگی بھی اپنی پسند کے

مطابق جی سکتے ہیں۔ وہ زندگی جیون مکت کہلائے گی۔ ایک ایسا شخص جو اپنے حواس میں رہتے ہوئے مرا ہوگا وہ اپنے حواس میں رہتے ہوئے ہی پیدا ہوگا اور پھر اپنی پوری زندگی آزادی سے ہمکنار رہتے ہوئے گذارے گا۔

ہم اس کا مطلب بیشک نہ جانتے ہوں لیکن جیون مکت کا لفظ ہم اکثر و بیشتر سنتے رہتے ہیں۔ جیون مکت اس کو کہتے ہیں جو اپنی پیدائش کے مرحلے میں اپنے ہوش و حواس میں رہا ہو۔ صرف وہی جیون مکت ہوگا۔ بصورتِ دیگر خواہ کوئی انسان اپنی پوری زندگی آزاد زندگی کی جدوجہد کرتے ہوئے گذار دے پھر بھی اس کو آزادی (مکتی) اگلے جنم میں ہی نصیب ہوگی موجودہ زندگی میں اس کو مکتی نصیب ہونا ممکن نہیں۔ اس زندگی میں جیون مکت ہونے کے لیے اس کو انتخاب کی سہولت اپنی پیدائش کے پہلے دن سے ہی حاصل ہونا لازمی ہے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کے آخری لمحے میں ہوش و حواس میں رہا ہو۔

اس مرحلے پر بہر حال یہ موضوعِ گفتگو نہیں ہے۔ ابھی ہم زندہ ہیں' موت ابھی نہیں آ سکی ہے' یقیناً وہ آئے گی' اس سے زیادہ یقینی کوئی اور بات نہیں ہے۔ دوسری باتوں کے بارے میں ہم کو شک و شبہ ہو سکتا ہے' مگر موت ایک ایسا معاملہ ہے جس کے آنے کے بارے میں رتی بھر شبہ موجود نہیں ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے وجود کے بارے میں ابہام میں مبتلا ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو روح کے بارے میں بے یقینی میں ہیں' مگر تم کو ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا جو موت کے بارے میں کوئی شبہ رکھتا ہو......اس کی آمد لازمی ہے' وہ یقیناً آئے گی بلکہ وہ تو پہلے ہی اپنے راستے پر ہے۔ ہر لمحہ وہ نزدیک سے نزدیک تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں اس کے آنے سے پہلے کی دستیاب مہلت ہوش میں آنے کی کوشش میں استعمال کرنی چاہیے۔ ارتکازِ توجہ اس کے حصول کا طریقہ ہے۔ ان تین دنوں کے دوران میری کوشش ہوگی کہ میں یہ سمجھنے میں آپ کی مدد کروں کہ ارتکازِ توجہ ایسی آگہی حاصل کرنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔

ایک دوست نے پوچھا ہے کہ دھیان اور پچھلے جنم کے مابین کیا رشتہ ہے؟

جاتی سمارن پچھلی زندگی کی بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ یہ دھیان کا ایک مخصوص طریقہ ہے اور اس کا ایک مخصوص اطلاق ہے۔ مثال کے طور پر جیسے کوئی پوچھے کہ دریا کیا ہے اور نہر کیا ہے؟

ہمارا جواب ہوگا کہ نہر بذاتِ خود دریا کی ہی ایک مخصوص شکل ہے ...... منصوبہ بندی کے ذریعے اچھی طرح مربوط اور پابند۔ جبکہ دریا آزاد ہے' اسے بھی کہیں پہنچنا ہے مگر اس کی منزل طے نہیں ہے۔ جبکہ نہر کی منزل متعین ہوتی ہے۔

دھیان ایک بڑے دریا کے مانند ہے' اس کو ایک سمندر تک پہنچنا ہے؛ اور اس کا پہنچنا یقینی ہے۔ دھیان آپ کو یقیناً خدا تک پہنچا دے گا۔ چھوٹی چھوٹی نہروں کی طرح دھیان کے کئی درمیانی طریقے بھی ہیں جن کو دھیان کی نہروں کی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ جاتی سمارن بھی دھیان کا ایک ایسا ہی معاون طریقہ ہے۔ ہم اس کے دھارے کا رخ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں جاننے کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ دھیان کا آسان مطلب ہے کسی نکتے کی جانب خصوصیت سے اپنی توجہ کو مرکوز کرلینا۔ ایسی مشقیں بھی ہیں جن کے ذریعے کسی کی توجہ کسی ایک نکتے کی طرف مرکوز کی جاسکتی ہے۔ انہی میں سے ایک جاتی سمارن بھی ہے۔ جس میں اپنی توجہ پچھلی زندگی کی کسی مخصوص یادداشت پر مرکوز کی جاسکتی ہے۔

یاد رکھیے کہ یادداشت کبھی محو نہیں ہوتی۔ یا تو یہ پوشیدہ رہتی ہے یا نمایاں۔ مگر پوشیدہ یادیں بظاہر محو بھی ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ اگر میں آپ سے پوچھ بیٹھوں کہ آپ نے یکم جنوری 1950ء کو کیا کیا؟ گو کہ آپ اس کا جواب نہیں دے سکیں گے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اس روز آپ نے کچھ کیا ہی نہیں ہوگا۔ اور اچانک ایسا لگے گا کہ جیسے پہلی جنوری 1950 کا وہ دن بالکل خالی اور سپاٹ گذرا ہو۔ چونکہ وہ دن گذر چکا ہے اس لیے یقیناً خالی نہیں گذرا ہوگا بلکہ مشاغل سے بھرپور گذرا ہوگا۔ مگر آج اس وقت ایسا لگا کہ وہ بالکل خالی گذرا ہے۔ اسی طرح آج کا دن آنے والے کل خالی محسوس ہوگا۔ آج سے دس برس کے بعد آج کے دن کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

لہٰذا یہ نہیں کہ آج وہ یکم جنوری 1950 کا دن موجود نہیں ہے یا یہ کہ اس روز آپ موجود نہیں تھے' اس وقت صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر آپ کو اس دن کی تفصیلات یاد نہیں تو یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دن کبھی موجود تھا۔ مگر وہ حقیقت میں موجود تھا اور اس کے بارے میں جاننے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ دھیان کا رخ اس کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ جیسے ہی دھیان کی کرنیں اس دن کے اوپر پڑیں گی تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وہ اتنا زیادہ زندہ و جاوید دکھائی دیگا جتنا

اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

بطور مثال یوں ہوگا جیسے ایک شخص ایک تاریک کمرے میں داخل ہو کر چاروں طرف ٹارچ کی روشنی گھمائے۔ جب وہ روشنی کا رخ بائیں جانب کرے گا تو دائیں جانب کی اشیاء اندھیرے میں ڈوب جائیں گی...... مگر دائیں جانب کی بھی کوئی شے غائب نہیں ہوگی اور جب وہ روشنی کا رخ دائیں جانب کرے گا تو وہاں موجود ہر شے نمایاں ہو جائے گی مگر بائیں جانب کی ہر چیز اندھیرے میں ڈوب جائے گی۔ ارتکاز کا بھی ایک ہدف ہوتا ہے اور اگر کوئی اس کو کسی مخصوص نکتے کی طرف مرکوز کرنا چاہے تو اس کو ٹارچ کی طرح کسی ایک جانب متوجہ کرنا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اس کو غیب کی طرف مرتکز کرنا چاہے تو اسکو ایک چراغ کی طرح استعمال کرنا ہوگا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔

چراغ کا اپنا کوئی ہدف نہیں ہوتا۔ وہ بلا ہدف روشن ہوتا ہے اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ اس کو کسی ایک یا دوسری جانب روشنی پھیلانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے دائرے میں جو کچھ بھی آجائے وہ اس کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ مگر ٹارچ کی روشنی اپنے ہدف کی پابند ہوتی ہے۔

ٹارچ کی روشنی کو ہم کسی ایک جانب رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے یہ ہوسکتا ہے کہ چراغ کی روشنی میں ہر چیز دھندلی نظر آئے۔ جبکہ کسی چیز کو نمایاں طور پر دیکھنے کے لیے ہمیں روشنی کو کسی ایک نکتے پر مرتکز کرنے کی ضرورت ہوگی اور یہ ٹارچ کی حیثیت حاصل کرلے گی اور ہر چیز نمایاں ہو جائے گی۔ البتہ باقی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کو واضح طور پر دیکھنے کا خواہشمند ہوگا تو باقی اشیاء کو اندھیرے میں چھوڑ کر اپنی توجہ پوری طرح اس کی طرف مرتکز کرنی ہوگی۔

جو کوئی براہِ راست زندگی کی حقیقت جاننے کا خواہشمند ہوا سے اپنی توجہ چراغ کی طرح پھیلانی ہوگی۔ یہی اس کا بنیادی مقصد ہوگا۔ اور چراغ کی حیثیت محض اس کا مشاہدہ کرنے تک محدود رہے گی۔ اگر وہ اس حد تک روشنی دے پایا تو یہ کافی ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کا کردار ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس چراغ کو کسی مخصوص مقصد از قسم پچھلی زندگی کی یادداشت تازہ کرنے کے لیے استعمال کرنا ہو تو پھر اس کو مطلوبہ سمت کی طرف مرکوز کرنا ہوگا۔ توجہ کو کسی مخصوص سمت پر مرکوز کرنے

کے سلسلے میں دو تین نکات تک میں آپ کے ساتھ ہوں' تمام نکات کی صراحت اس لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو ان تمام کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور اگر کوئی چاہے تو مجھ سے ذاتی طور پر مل سکتا ہے۔ اس لیے میں دو یا تین نکات کا ذکر کروں گا' جو فی الواقعہ گذشتہ زندگی یاد کرنے کے تجربے میں معاون ثابت نہیں ہوں گے' مگر یہ کہ آپ کو ایک اندازہ قائم کرنے میں مددگار ہونگے۔ میں دانستہ اس مشق کے بارے میں سب کچھ بتانا اس لیے ضروری نہیں سمجھتا کہ ہر کس و ناکس کے لیے ان کا تجربہ کرنا مفید نہیں۔ اور یہ کہ اس نوع کا تجربہ بعض اوقات الٹا نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔

اسی قسم کے ایک حادثے کے بارے میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ آپ پر بالکل واضح ہو جائے: "ارتکازِ توجہ (دھیان) کے سلسلے میں ایک خاتون پروفیسر دو تین سال تک میرے رابطے میں رہیں۔ وہ اپنی پچھلی زندگی (جاتی سمارن) کے بارے میں جاننے کے لیے نہایت بے چین تھیں۔ ہر چند کہ میں نے ان کو مطلوبہ مشق سے باز رکھنے کی بھتیری کوشش کی اور باور کرایا کہ گذشتہ زندگی کے بارے میں نہ جاننا اس وقت تک ٹھیک نہیں جب تک ان کی تمام مشقیں مکمل نہیں ہو جاتیں' ورنہ وہ نقصان اٹھا سکتی ہیں"

عموماً کسی ایک زندگی کی تفصیلات برداشت کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح گذشتہ تین چار زندگیوں کی تفصیلات بند توڑ کر اندر داخل ہو سکتی ہیں اور انسان کے پاگل ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے اس بات کا بندوبست کیا ہوا ہے کہ ہم اپنی گذشتہ زندگی کو فراموش کرتے جاتے ہیں کہ کہیں ذہن پر برداشت سے زیادہ بوجھ نہ پڑ جائے۔ جب تک ذہن کے بھاری بوجھ اٹھانے کی استطاعت نہ بڑھائی جائے' اس وقت تک یہ اضافی بوجھ بڑی پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر وہ خاتون مصر رہیں' میری تاکید کا ان کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اس مشق کے تجربے میں مصروف ہوگئیں۔

جب پچھلی یادوں کا سیلاب بند توڑ کر اس پر حملہ آور ہوا تو وہ رات دو بجے کے قریب دوڑتی ہوئی میرے پاس آئیں۔ وہ مکمل طور پر ذہنی شکستگی اور ناقابلِ برداشت ہیجان میں مبتلا تھیں۔ کہنے لگیں: کسی بھی طرح اس سیلاب کو روک دیجیے؛ میں کسی قیمت پر حقائق کے اس پہلو کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ مگر جب ایک بار یادوں کی لہر کو آزادی مل جاتی ہے تو ان کو روکنا آسان نہیں

ہوتا۔ ان یادوں کا دروازہ سادہ طریقے پر صرف کھلتا نہیں ہے بلکہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس سیلاب کو روکنے میں کم و بیش پندرہ دن لگے۔ آپ بتائیں کہ اصل مسئلہ کیا تھا؟

اس خاتون کا دعویٰ تھا کہ وہ نہایت نیک اور بے داغ کردار کی مالک ہے' مگر جب پچھلی زندگی کے واقعات اس کے اوپر منکشف ہوئے تو پتہ چلا کہ ماضی کی زندگی میں وہ فاحشہ تھی اور جب اس کی فحاشی کے مناظر اس کی نظروں کے سامنے آئے تو وہ لرز کر رہ گئی۔ اس کی موجودہ زندگی کے کردار کی پختگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

اس نوع کی یادداشتوں میں یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی اور کی زندگی کے عکس ہیں۔ وہی خاتون جو خود کو پاکیزہ کہتی تھی اب خود کو فاحشہ کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اپنی کسی گذشتہ زندگی میں فاحشہ رہی ہو' وہ بعد کے کسی دورِ حیات میں نیک سیرت ہو گئی ہو...... ایسا معاملہ پچھلی زندگی کی مشکلات کے ردِعمل میں پیش آ جاتا ہے۔ گذشتہ زندگی کے مصائب اور مشکلات کے ردِعمل میں وہ ایک نیک سیرت اور پاکیزہ عورت بن گئی۔

بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی پچھلی زندگی میں گناہگار رہے ہوں وہ اس زندگی میں درویش بن جاتے ہیں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ گناہگاروں اور درویشوں کے مابین تعلقات کے مضبوط رشتے ہوتے ہیں۔ ایسا ردِعمل اکثر سامنے آتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ جو بات ہمارے علم میں آ جاتی ہے وہ کسی نہ کسی طور ہم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم قطعی مخالف اور متضاد سمت کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

ہمارے ذہن کا پنڈولم ہمیشہ مخالف سمت میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ جیسے ہی وہ دائیں جانب کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے ویسے ہی وہ بائیں جانب اپنا رخ کر لیتا ہے۔ ابھی وہ بمشکل بائیں جانب کی انتہا تک ہی پہنچ پاتا ہے کہ فوراً دائیں جانب مڑ جاتا ہے۔ جب آپ کسی کلاک کا پنڈولم دائیں طرف جاتا ہوا دیکھیں تو سمجھ لیں کہ وہ بائیں جانب جانے کے لیے قوت جمع کر رہا ہے...... وہ بائیں جانب بھی اتنا ہی جائے گا جتنا کہ وہ دائیں جانب ہو کر آیا ہے۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک گناہ گار نیک بن جاتا ہے اور کوئی نیک انسان گناہوں کی زندگی اختیار کر لیتا ہے۔

یہ ایک عام سی بات ہے' اس قسم کے نشیب و فراز ہر ایک کی زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس زندگی میں جو نیک اور پاکردار ہے وہ اپنی پچھلی زندگی میں بھی ایسا

ہی رہا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ جو آج ہے وہ کل بھی بعینہٖ ایسا ہی تھا...... البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ کل کے مقابلے میں آج اس کے بالکل برعکس ہو گیا ہو۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی کی ابتلا کے نتیجے میں اس کے بالکل برعکس کیفیت میں ڈھل گیا ہو۔

میں نے سنا ہے:

ایک نیک آدمی اور ایک فاحشہ آمنے سامنے رہتے تھے۔ دونوں کی وفات ایک ہی روز ہوئی۔ فاحشہ کی روح کو جنت میں داخل کیا گیا اور اس نیک آدمی کی روح کو دوزخ میں۔ جوان کو وہاں پہنچانے پر مامور تھے وہ بڑے حیران ہوئے اور آپس میں ایک دوسرے سے یہی پوچھتے رہے کہ یہ کیا گڑبڑ ہوئی؟ کیا کسی غلطی کے نتیجے میں ایسا ہوا ہے؟ ہم ایک نیک آدمی کو دوزخ میں کیوں لائے ہیں؟ کیا وہ نیک نہیں تھا؟

ان میں سے ایک دانشمند نے کہا: مانا کہ وہ نیک انسان تھا' مگر وہ اس فاحشہ سے حسد رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے وہاں ہونے والی دعوتوں اور اس کی مسرتوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا وہاں سے اٹھنے والی موسیقی کی تانیں اس کی روح میں اتر جاتی تھیں۔ اس کے سامنے براجمان فاحشہ کے مہمان اس کی پائل کی جھنکار سے اتنے مدہوش نہیں ہوتے تھے جتنا یہ بزرگ۔ اس کی تمام تر توجہ ہمیشہ اس کے بالاخانہ کی طرف مرکوز رہا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ عبادت کے اوقات میں بھی اس کے کان وہاں سے آنے والی آوازوں کی طرف ہی لگے رہتے تھے۔

اس کے برعکس وہ فاحشہ؟ جب وہ انتہائی مصائب سے دوچار تھی تو اس شخص کی قسمت پر رشک کیا کرتی تھی۔ جب وہ اس کو صبح ہی صبح پوجا کے پھول لے کر جاتے ہوئے دیکھتی تو سوچتی کہ نہ جانے میں کب اس قابل ہو سکوں گی کہ پوجا کے پھول لے کر عبادت گاہ جا سکوں۔ وہ خود کو اتنی ناپاک سمجھتی تھی کہ عبادت گاہ میں داخل ہونے کی ہمت بھی اس کے اندر نہیں تھی۔ وہ خود کو خوشبودار دھوئیں' چراغوں کی روشنی' اور پوجا کے گیتوں کی مدھر آوازوں کے ذریعے ایسے مقدس اور پاکیزہ ماحول میں محسوس کرتی تھی جیسا اس نیک انسان کو کبھی میسر نہیں آیا۔ وہ فاحشہ ہمیشہ اس بزرگ کی زندگی پر رشک کیا کرتی تھی اور یہ شخص اس فاحشہ کی خوشیوں بھری زندگی پر حسد کیا کرتا تھا۔

دونوں کی دلچسپیاں اور رجحانات ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے' مکمل طور پر تبدیل ہو چکے تھے...... ایسا ہوتا بھی ہے...... اور اس کے پیچھے قدرت کے کچھ قوانین کارفرما ہیں۔

پس جب اس خاتون پروفیسر کی پچھلی زندگی کے واقعات اس کے سامنے آئے تو اس نے سخت تکلیف محسوس کی۔ وہ اپنی انا کی شکست پر بیحد رنجیدہ تھی۔ اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں جان کر وہ لرز اٹھی' اور اب وہ ان یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ جب کہ کافی تیاری کے بغیر پچھلی زندگی میں جھانکنے کی کوشش سے میں نے اس کو حتی الامکان باز رکھنے کی کوشش کی۔

اب جب آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں جاتی سمارن کے بارے میں چند قابلِ فہم بنیادی باتیں ضرور بتاؤں گا تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکے' لیکن یاد رہے کہ یہ باتیں اس تجربہ میں کام نہیں آ سکیں گی۔ وہ لوگ جو اس تجربے کے خواہشمند ہوں ان کو علیحدہ سے اس معاملے میں غور کرنا ہوگا۔

اس سلسلے کی پہلی شرط یہ ہے کہ جب کوئی گذشتہ زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہے تو اس کو اپنا ذہن مستقبل کی طرف سے بالکل بند کرنا پڑے گا۔ ہمارا ذہن مستقبل پرست ہے نا کہ ماضی پرست۔ عمومی طور پر ہمارے ذہن کا مرکز مستقبل میں ہوتا ہے۔ یہ مستقبل کی طرف محوِ سفر رہتا ہے۔ ہمارے خیالات کی عمومی رو آنے والے وقت کی طرف ہوتی ہے۔ یہی زندگی کے حق میں بہتر بھی ہے' اچھا ہے کہ یہ ماضی کی طرف گامزن رہنا پسند نہیں کرتا۔ ماضی کی طرف متوجہ رہنے سے کیا فائدہ؟ وہ تو جا چکا...... ختم ہو گیا۔ اس لیے ہم کو آنے والے وقت میں رونما ہونے والے واقعات کا تجسس رہتا ہے۔ ہم علم نجوم والوں سے یہ جاننے کے خواہاں ہوتے ہیں کہ آنے والے وقت میں ہم پر کیا گذرنے والا ہے۔ وہ لوگ جو ماضی میں جھانکنا چاہتے ہیں ان کو مستقبل سے اپنا ہر رشتہ' ناطہ' تعلق قطعی چھوڑ دینا ہوگا۔ کیونکہ اگر ایک بار بھی ذہن کی ٹارچ کا رخ مستقبل کی طرف ہو جائے گا...... ذہنی رو اگر ایک بار بھی مستقبل کی طرف مڑ گئی تو اس کو واپس ماضی کی طرف لانا ممکن نہیں رہے گا۔

لہٰذا وہ پہلی بات جس کی طرف توجہ دینا ہو گی وہ کچھ مہینوں کے لیے یا ایک مقررہ مدت کے لیے مستقبل سے بالکل بے تعلقی ہے۔ پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اگلے چھ مہینے تک مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنا تک نہیں ہے۔ اگر مستقبل کا کوئی خیال پیدا بھی ہو تو اس کو سلام کر کے رخصت

کرنا ہوگا، پھر وہ خود بھی شناخت نہیں ہو سکے گا اور مستقبل کے دیگر تفکرات کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ لہٰذا پہلی بات یہ کہ اگلے چھ ماہ کے لیے وہ مستقبل کے وجود سے انکاری رہے گا اور مسلسل ماضی کی طرف اپنے ذہن کو لگائے رکھے گا۔ اور جیسے ہی ذہن سے مستقبل محو ہوگا، ویسے ہی خیالات کی رو ماضی کی طرف مڑ جائے گی۔

پہلے آپ کو اسی زندگی کے ماضی کی طرف لوٹنا ہوگا، ایک دم سے گذشتہ زندگی کی حدود میں داخل ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ موجودہ زندگی کے ماضی میں جھانکنے کے بھی طریقے ہیں۔ مثلاً جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ آپ کو یاد نہیں کہ آپ یکم جنوری 1950 کو کیا کر رہے تھے؟

یہ جاننے کا ایک طریقہ ہے، اگر آپ میرے بتائے ہوئے طریقے سے دھیان میں مصروف ہو جائیں تو دس منٹ بعد، جب دھیان اور استغراق بہت گہرا ہو جائے گا، جسم ڈھیلا ہو جائے گا، سانسیں سکون میں آ جائیں گی، ذہن خاموش ہو جائے گا اس وقت صرف ایک بات ذہن میں رکھیں: یکم جنوری 1950 کو کیا ہوا تھا؟ اپنے ذہن کی پوری توجہ اسی ایک بات پر مرکوز رکھیں۔ اگر چند دن تک ایک یہی بات آپ کے ذہن میں گونجتی رہے گی تو یکا یک ایک پردہ اٹھے گا یکم جنوری اپنی تمام تر جزئیات اور مکمل تفصیلات کے ساتھ آپ کے سامنے ہوگا، جیسے وہ گذرے ہوئے لمحات آپ دوبارہ جی رہے ہونگے۔ جب پہلی بار آپ نے یکم جنوری کا دن گذارا تھا تب آپ نے اس کی تمام جزئیات پر اس طرح دھیان نہیں دیا ہوگا جس طرح اب دے سکیں گے۔ پس پہلے آپ کو موجودہ زندگی کی طرف ہی لوٹنا ہوگا۔

پانچ سال کی عمر کی طرف مراجعت نسبتاً آسان ہے، اس دور سے قبل کی طرف لوٹنا بے حد مشکل ہوتا ہے اور عام طور پر ہم نہیں جان پاتے کہ پانچ سال کی عمر سے پہلے کیا کچھ ہوا۔ یہ ماضی شناسی کی بعید ترین حد ہے۔ البتہ کچھ لوگ اپنی عمر کے تیسرے سال کی یادداشتوں تک ضرور رسائی حاصل کر لیتے ہیں، لیکن اس سے پیچھے کی خبر تک پہنچنا از حد مشکل ہوتا ہے ایسے جیسے سامنے کوئی رکاوٹ آ جائے اور اس کے بعد ہر چیز مقفل ہو جائے۔ جو شخص ماضی کی یادوں کو زندہ کرنے کی اہلیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ پانچ سال کی عمر تک کے کسی بھی دن کی یادیں جگا سکتا ہے۔ یادیں از سرِ نو ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔

اس دعوے کی تصدیق کی جا سکتی ہے: مثال کے طور پر آج کے دن پیش آنے والے

تمام واقعات کہیں درج کر کے ان کو تالے میں رکھ دیں۔ دو سال بعد آج کے دن کو یاد کرنے کی کوشش کریں، دو سال پہلے کی تحریر نکالیں اور اپنی یادداشت سے ان کو ملائیں۔ آپ یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ آپ نے اپنے درج شدہ واقعات سے زیادہ کا احاطہ کر لیا ہے۔ وہ تمام واقعات آپ کی یادداشت میں ضرور لوٹ آئیں گے۔

گوتم بدھ نے اس کو ''الیا وگیان'' کا نام دیا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں ایک ایسا گوشہ موجود ہے جس کو گوتم بدھ نے الیا وگیان کہا ہے جس کا مطلب ہے ہمارے شعور کا اجتماع۔ جس طرح ہم اپنے گھروں کا کاٹھ کباڑ رکھنے کے لیے تہہ خانے استعمال کرتے ہیں اسی طرح ہمارے حافظے میں ایک ایسا مقام ہے جہاں یادداشتیں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک کے بعد ایک، ہر جنم کی یادداشتیں اس میں محفوظ ہوتی جاتی ہیں اور وہاں سے کوئی نکتہ بھی صاف نہیں ہوتا اس لیے کہ کسی انسان کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس کو کب اور کونسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ مادی جسم تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن ہماری آئندہ زندگیوں میں وہ گودام وہی رہتا ہے۔ اس بات کا کبھی کسی کو علم نہیں ہوتا کہ اس کو کب اسکی ضرورت پڑ جائے۔ ہم نے اپنی زندگیوں میں جو کچھ بھی کیا ہے، جو بھی تجربات کیے ہیں، وہ سب جوں کا توں وہاں جمع ہوتا رہتا ہے۔

ایسا انسان جو اپنی عمر کے پانچویں سال تک کی یادداشتوں تک پہنچ جائے اس کے لیے اس سے آگے جانا کوئی خاص مشکل نہیں رہتا۔ اس تجربے کی نوعیتِ قطعی وہی رہے گی۔ پانچ سال کی عمر کی یادیں بحال ہونے کے بعد وہ راستہ کھل جاتا ہے جو آپ کی پیدائش کے وقت تک آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس ساعت تک جب آپ دنیا میں نمودار ہوئے۔ پھر ایک اور مشکل مرحلہ آتا ہے، رحمِ مادر میں رہنے کے دوران کی یادیں بھی کبھی حافظے سے محو نہیں ہوتیں۔ انسان اس مرحلے کی یادیں بھی اپنی ابتدا کے وقت تک زندہ کر سکتا ہے۔ اس وقت تک جب اس کے ماں باپ کے جینس ملتے ہیں اور روح داخل ہوتی ہے۔ ایک انسان اپنی گذشتہ زندگیوں میں اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب وہ پہلے اس مرحلے تک پہنچ جائے۔ وہ وہاں تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتا۔ یادوں کے اس سفر میں جب وہ اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تب ہی وہ اپنی گذشتہ زندگی میں داخل ہو سکتا ہے۔

پچھلے جنم تک پہنچنے کے بعد جو پہلی یاد آئے گی وہ اس جنم کے آخری واقعے سے شروع

ہوگی۔ بہر حال یاد رہے کہ اس طرح صورت حال کافی مشکل ہوگی، اور باتوں کا مفہوم سمجھنا آسان نہیں ہوگا۔ جیسے ہم کسی فلم کو آخیر سے شروع کی طرف دیکھنا شروع کریں یا کسی ناول کو آخر سے ابتدا کی طرف پڑھنا شروع کریں...... نتیجہ کے طور پر ہم گم ہو جائیں گے۔ پچھلے جنم میں پہلی بار داخل ہونا خود کو اچنبھے میں ڈالنے کے مترادف ہے کیونکہ پیش آمدہ تمام واقعات کی ترتیب اب بالکل الٹ ہوگی۔

جب آپ اپنی پچھلی زندگی میں جائیں گے تو سب پہلے آپ کے سامنے اپنی موت آئے گی، پھر بڑھاپے کا دور، پھر جوانی، پھر بچپن اور اس کے بعد آپ کی پیدائش۔ سب کچھ الٹی ترتیب سے پیش آئے گا۔ اس طرح آپ کے لیے معاملات کی صحیح شناخت آسان نہیں ہوگی۔ لہٰذا جب پہلی بار پرانی یادداشت ظاہر ہونا شروع ہوگی تو سب کچھ الٹی ترتیب میں ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا اور آپ مضطرب اور پریشان ہو جائیں گے۔ جیسے آپ کسی فلم کو الٹی طرف سے دیکھنا شروع کریں یا کوئی ناول آخر سے پڑھنا شروع کریں۔ ان کا سر پیر سمجھنے کے لیے شاید آپ کو کئی بار ان کی ترتیب بدلنی پڑے۔ جو واقعات اپنی صحیح ترتیب سے پیش آ چکے ہوں ان کو الٹی ترتیب سے دیکھ کر سمجھنے میں بہت زیادہ کدوکاوش کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جان لیں کہ ان کی سیدھی ترتیب کیا ہے اور الٹی ترتیب کیا ہے؟ اس کا سیدھا سا ایک جواب ہے کہ ہم دنیا میں کیسے داخل ہوئے اور کیسے یہاں سے رخصت ہوئے؟

ہم ابتدا میں ایک بیج بوتے ہیں اور آخر میں اس سے پھول نمودار ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس کو الٹی ترتیب سے دیکھے تو پہلے پھول نظر آئے گا، پھر غنچہ، پھر پودا، پھر پتے، پھر ٹہنی اور آخر میں بیج۔ چونکہ ہم کو اس نوع کی ترتیب کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں اس لیے تمام واقعات کو درست ترتیب میں رکھنے کے لیے ہم کو بے حد مشقت اٹھانی پڑے گی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز صورت یہ ہوگی کہ موت سب سے پہلے دکھائی دے گی۔ جس کے بعد بڑھاپا، بیماری، جوانی ہر کیفیت کی ترتیب آگے سے پیچھے کی طرف جاتی ہوئی نظر آئے گی۔ اور اگر آپ شادی کر کے طلاق دے چکے ہوں گے تو ماضی میں جاتے وقت پہلے طلاق دکھائی دے گی، پھر محبت اور اس کے بعد آخر میں شادی۔ اس طرح نمودار ہونے والے ماضی کے واقعات کو سمجھنا انتہائی پیچیدہ عمل ہوگا۔ اس لیے کہ ہم ہر عمل کو سیدھے سادے طریقے سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہمارے ذہن ایک ہی رخ پر سوچتے

ہیں۔ چیزوں کو الٹی طرف سے دیکھنا آسان نہیں۔ ہم اس قسم کے تجربات کے عادی نہیں۔ ایک معین سمت میں واقعات کی لہر دیکھنا ہی ہماری سرشت میں داخل ہے۔ کوشش کرنے سے البتہ گذری ہوئی زندگی کے واقعات کو الٹی ترتیب میں دیکھنے کے باوجود صحیح ترتیب میں رکھا جا سکتا ہے اور یہ ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔

یادوں کی الٹی ترتیب میں داخلہ یقیناً ایک دلچسپ تجربہ ہوگا کیونکہ پہلے طلاق، پھر محبت اور پھر شادی کے واقعات دیکھنے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ طلاق واقعی ناگزیر تھی۔ جس نوع سے محبت کی ابتدا ہوئی اس کا منطقی نتیجہ طلاق کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔ طلاق ہی اس شادی کا متوقع انجام تھا۔ مگر گذشتہ زندگی کی اُس شادی کے وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا یہ انجام ہوگا۔ بحیثیتِ مجموعی جب ہم اس شادی پر ایک گہری نظر ڈالیں گے تو محبت ہماری نظر میں بالکل مختلف چیز کی حیثیت اختیار کر لے گی کیونکہ اس میں ہم کو طلاق بالکل واضح نظر آئے گی۔ دوستی کے پردے میں دشمنی بھی ہمیں بے پردہ نظر آئے گی۔

گذشتہ زندگی کی یادیں ہماری موجودہ زندگی کو مکمل طور پر الٹ کر رکھ دیں گی کیونکہ اب آپ گذشتہ زندگی کی طرح جینے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اپنی پچھلی زندگی میں آپ جو کچھ محسوس کرتے تھے...... وہی سوچ ابھی تک موجود ہے کہ کامیابی اور حقیقی خوشی قسمت بنانے سے حاصل ہوتی ہیں۔ مگر اپنی پچھلی زندگی کے مشاہدے کے دوران آپ کو پتا چلے گا کہ بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے آپ کی ابتدا آزردگی، اضمحلال اور سخت تکالیف سے ہوئی تھی۔ اس سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ دراصل مسرت بخشنے کے بجائے قسمت نے آپ کو محرومیوں میں رکھا، دوستی کرنے سے دشمنی کی ابتدا ہوئی، جس کو آپ نے پیار سمجھا وہ نفرت میں بدل گیا اور جس کو بندھن سمجھا وہ علیحدگی کا باعث بنا۔ اس کے بعد آپ پیش آنے والے تمام واقعات کو صحیح تناظر میں دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ کیفیت آپ کی زندگی بدل ڈالے گی...... آپ کے طرزِ زندگی پر مکمل طور پر اثر انداز ہوگی، اور یہ ایک بالکل مختلف صورت حال ہوگی۔

میں نے سنا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص ایک سنت کے پاس گیا اور خود کو اس کی خدمت کے لیے پیش کیا۔ جس پر اس نے انکار کر دیا۔ اس شخص نے جاننا چاہا کہ وہ اس کو اپنے حلقہ میں داخل کرنے سے کیوں گریزاں ہے؟

اس نے جواب دیا کہ میں اپنی پچھلی زندگی میں اپنے پیروکاروں کو دشمن کے روپ میں بدلتے دیکھ چکا ہوں۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' مجھے معلوم ہے کہ خدمت گاروں کا مطلب ہے مخالفین' کسی کو دوست بنانے کا مطلب ہے اس کو اپنا دشمن بنالینا۔ اب میں کسی کو اپنا دشمن بنانے کے لیے تیار نہیں ہوں اس لیے کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تنہا رہنا ہی بہتر ہے۔ کسی کو اپنی طرف کھینچنے کا مطلب ہے اس کو اپنے سے دور بھگانا۔

گوتم بدھ کا قول ہے کہ اپنے پسندیدہ شخص سے ملاقات مسرت کا باعث ہوتی ہے' لیکن اپنے ناپسندیدہ سے علیحدگی بھی خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ اپنے محبوب سے جدائی بھی تکلیف دہ ہوتی ہے اور ناپسندیدہ شخص سے ملاقات بھی صدمے کا باعث ہوتی ہے۔ یوں یہ حقیقت آشکار ہوئی اور بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کے باوجود بعد میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو محبوب ہوتا ہے وہ بعد میں محبوب نہ رہے' اور اس کے برعکس ہم جس سے دور رہنا چاہتے ہوں وہ ہمیں محبوب ہو جائے۔ لہٰذا ماضی کی سیر کی وجہ سے صورت کلیۃً تبدیل ہو جائے گی۔ ہر چیز کا منظر نامہ بالکل تبدیل ہو جائے گا۔

ارتکازِ توجہ میں کبھی کبھی اس نوع کی یادیں عود کر آتی ہیں' گو کہ لازمی نہیں ہیں لیکن کسی وقت بھی غیر متوقع طور پر اُمڈ آتی ہیں۔ کسی تجرباتی مشق کے بغیر اگر گذشتہ جنموں کی یادیں اچانک امڈ آئیں تو ان میں کسی قسم کی دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک نظر ڈال کر فراموش کر دیں کیونکہ ذہن یادوں کا غیر معمولی بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ ان میں الجھنے سے پاگل ہو جانے کا واضح امکان ہے۔

ایک بار میرے پاس ایک لڑکی کو لایا گیا جس کی عمر اندازاً گیارہ سال تھی۔ غیر متوقع طور پر اس کو اپنے پچھلے تین جنموں کی یادداشت تھی۔ اس نے کسی نوعیت کا کوئی تجربہ نہیں کیا تھا' مگر غلطیوں کا امکان تو رہتا ہے۔ یہ اس پر قوانینِ فطرت کی کوئی عنایت نہیں بلکہ کسی نہ کسی نوعیت کی غلطی تھی' بالکل ایسی جیسے کسی کی تین آنکھیں یا چار بازو ہوں۔ یہ کسی غلطی کا نتیجہ ہی ہو سکتی ہیں۔ چار بازو یقینی طور پر دو بازوؤں کے مقابلے میں کمزور ہوں گے۔ چار بازو اتنے موثر طریقے پر کام نہیں کر سکیں گے جتنے دو بازو...... چار بازو جسم کو کمزور کرنے کا باعث بنیں گے نا کہ توانا۔

بہرحال اس گیارہ سالہ لڑکی کو اپنے پچھلے تین جنم یاد تھے۔ اس کے سلسلے میں کئی

تحقیقات بھی کی گئیں۔ اپنی پچھلی زندگی میں وہ میری رہائش گاہ سے تقریباً اسی میل کے فاصلے پر رہتی تھی اور ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہوئی تھی۔ اس وقت وہ جن لوگوں کے درمیان رہتی تھی وہ اب میرے گاؤں میں ہی رہتے تھے اور وہ ان سب کو پہچانتی تھی۔ یہاں تک کہ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی وہ اپنے پچھلے رشتہ داروں کو شناخت کر لیتی تھی۔ اس کے بھائی' اس کی بیٹیاں' اور پوتے' نواسے سب اس کے لیے شناسا تھے۔ دور پار کے رشتہ داروں کے بارے میں وہ بعض ایسی باتیں بھی بیان کرتی تھی جو خود متعلقہ لوگوں کو یاد نہیں رہی تھیں۔

اس کا بڑا بھائی ہنوز زندہ ہے۔ اس کے سر میں ایک معمولی زخم کی بدولت ایک نشان موجود ہے۔ آزمانے کی خاطر میں نے اس لڑکی سے اس نشان کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا خود میرے بھائی کو اس کے بارے میں علم نہیں لیکن میں جانتی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ خود کیا بیان دیتا ہے؟ اس کے بھائی کو اس نشان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

پھر وہ لڑکی بولی کہ اپنی شادی کے موقعہ پر یہ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت گرا تھا جس کی وجہ سے اس کے سر میں معمولی چوٹ آ گئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر دس سال تھی۔ اُس قصبے کے بوڑھے لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی وہ شادی کے موقعہ پر گھوڑے سے گر گیا تھا۔ وہ شخص اس بات کو یاد کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس لڑکی نے وہ خزانہ بھی دکھایا جو پچھلے جنم میں اس نے اس گھر میں دبایا تھا۔

پچھلے جنم میں وہ ساٹھ سال کی ہو کر مری' اور اس سے پچھلے جنم میں وہ آسام کے کسی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی جہاں وہ سات سال کی عمر میں مر گئی تھی۔ گو کہ اس کو نہ اس گاؤں کا نام یاد تھا نہ پتہ معلوم تھا لیکن وہ اتنی آسامی زبان بول سکتی تھی جتنا کہ کوئی سات سال کا بچہ بول سکتا ہے۔ وہ سات سال کی عمر کی مناسبت سے ناچ اور گا بھی سکتی تھی۔ بڑی تحقیقات کے باوجود اس کے اُس جنم کے والدین کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

اس لڑکی کو اپنی پچھلی زندگی کے سڑسٹھ اور موجودہ زندگی کے گیارہ سال کا تجربہ تھا۔ آپ اس کی آنکھوں میں پچھتر سے اٹھتر سالہ عورت کی جھلک صاف دیکھ سکتے تھے' حالانکہ وہ ابھی صرف گیارہ سال کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو چونکہ عمر رسیدہ سمجھتی ہے اس لیے وہ اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتی۔ وہ اپنے اندر پچھتر سال کے تجربات سمیٹے ہوئے اس لیے وہ خود کو پچھتر سال کا

اس نے جواب دیا کہ میں اپنی پچھلی زندگی میں اپنے پیروکاروں کو دشمن کے روپ میں بدلتے دیکھ چکا ہوں۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' مجھے معلوم ہے کہ خدمت گاروں کا مطلب ہے مخالفین' کسی کو دوست بنانے کا مطلب ہے اس کو اپنا دشمن بنالینا۔ اب میں کسی کو اپنا دشمن بنانے کے لیے تیار نہیں ہوں اس لیے کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تنہا رہنا ہی بہتر ہے۔ کسی کو اپنی طرف کھینچنے کا مطلب ہے اس کو اپنے سے دور بھگانا۔

گوتم بدھ کا قول ہے کہ اپنے پسندیدہ شخص سے ملاقات مسرت کا باعث ہوتی ہے' لیکن اپنے ناپسندیدہ سے علیحدگی بھی خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ اپنے محبوب سے جدائی بھی تکلیف دہ ہوتی ہے اور ناپسندیدہ شخص سے ملاقات بھی صدمے کا باعث ہوتی ہے۔ یوں یہ حقیقت آشکار ہوئی اور بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کے باوجود بعد میں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جو محبوب ہوتا ہے وہ بعد میں محبوب نہ رہے' اور اس کے برعکس ہم جس سے دور رہنا چاہتے ہوں وہ ہمیں محبوب ہو جائے۔ لہٰذا ماضی کی سیر کی وجہ سے صورت کلیۃً تبدیل ہو جائے گی۔ ہر چیز کا منظر نامہ بالکل تبدیل ہو جائے گا۔

ارتکازِ توجہ میں کبھی کبھی اس نوع کی یادیں عود کر آتی ہیں' گو کہ لازمی نہیں ہیں لیکن کسی وقت بھی غیر متوقع طور پر اُمڈ آتی ہیں۔ کسی تجرباتی مشق کے بغیر اگر گذشتہ جنموں کی یادیں اچانک اُمڈ آئیں تو ان میں کسی قسم کی دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک نظر ڈال کر فراموش کر دیں کیونکہ ذہن یادوں کا غیر معمولی بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ ان میں الجھنے سے پاگل ہو جانے کا واضح امکان ہے۔

ایک بار میرے پاس ایک لڑکی کو لایا گیا جس کی عمر اندازاً گیارہ سال تھی۔ غیر متوقع طور پر اس کو اپنے پچھلے تین جنموں کی یادداشت تھی۔ اس نے کسی نوعیت کا کوئی تجربہ نہیں کیا تھا' مگر غلطیوں کا امکان تو رہتا ہے۔ یہ اس پر قوانینِ فطرت کی کوئی عنایت نہیں بلکہ کسی نہ کسی نوعیت کی غلطی تھی' بالکل ایسی جیسے کسی کی تین آنکھیں یا چار بازو ہوں۔ یہ کسی غلطی کا نتیجہ ہی ہو سکتی ہیں۔ چار بازو یقینی طور پر دو بازوؤں کے مقابلے میں کمزور ہوں گے۔ چار بازو اتنے موثر طریقے پر کام نہیں کر سکیں گے جتنے دو بازو...... چار بازو جسم کو کمزور کرنے کا باعث بنیں گے نا کہ توانا۔

بہرحال اس گیارہ سالہ لڑکی کو اپنے پچھلے تین جنم یاد تھے۔ اس کے سلسلے میں کئی

تحقیقات بھی کی گئیں۔ اپنی پچھلی زندگی میں وہ میری رہائش گاہ سے تقریباً اسّی میل کے فاصلے پر رہتی تھی اور ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہوئی تھی۔ اس وقت وہ جن لوگوں کے درمیان رہتی تھی وہ اب میرے گاؤں میں ہی رہتے تھے' اور وہ ان سب کو پہچانتی تھی۔ یہاں تک کہ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی وہ اپنے پچھلے رشتہ داروں کو شناخت کر لیتی تھی۔ اس کے بھائی' اس کی بیٹیاں' اور پوتے' نواسے سب اس کے لیے شناسا تھے۔ دور پار کے رشتہ داروں کے بارے میں وہ بعض ایسی باتیں بھی بیان کرتی تھی جو خود متعلقہ لوگوں کو یاد نہیں رہی تھیں۔

اس کا بڑا بھائی ہنوز زندہ ہے۔ اس کے سر میں ایک معمولی زخم کی بدولت ایک نشان موجود ہے۔ آزمانے کی خاطر میں نے اس لڑکی سے اس نشان کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا خود میرے بھائی کو اس کے بارے میں علم نہیں لیکن میں جانتی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ خود کیا بیان دیتا ہے؟ اس کے بھائی کو اس نشان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

پھر وہ لڑکی بولی کہ اپنی شادی کے موقعہ پر یہ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت گرا تھا جس کی وجہ سے اس کے سر میں معمولی چوٹ آ گئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر دس سال تھی۔ اُس قصبے کے بوڑھے لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی وہ شادی کے موقعہ پر گھوڑے سے گر گیا تھا۔ وہ شخص اس بات کو یاد کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس لڑکی نے وہ خزانہ بھی دکھایا جو پچھلے جنم میں اس نے اس گھر میں دبایا تھا۔

پچھلے جنم میں وہ ساٹھ سال کی ہو کر مری' اور اس سے پچھلے جنم میں وہ آسام کے کسی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی جہاں وہ سات سال کی عمر میں مر گئی تھی۔ گو کہ اس کو نہ اس گاؤں کا نام یاد تھا نہ پتہ معلوم تھا لیکن وہ اتنی آسامی زبان بول سکتی تھی جتنا کہ کوئی سات سال کا بچہ بول سکتا ہے۔ وہ سات سال کی عمر کی مناسبت سے ناچ اور گا بھی سکتی تھی۔ بڑی تحقیقات کے باوجود اس کے اُس جنم کے والدین کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

اس لڑکی کو اپنی پچھلی زندگی کے سڑسٹھ اور موجودہ زندگی کے گیارہ سال کا تجربہ تھا۔ آپ اس کی آنکھوں میں پچھتر سالہ عورت کی جھلک صاف دیکھ سکتے تھے' حالانکہ وہ ابھی صرف گیارہ سال کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو چونکہ عمر رسیدہ سمجھتی ہے اس لیے وہ اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتی۔ وہ اپنے اندر پچھتر سال کے تجربات سمیٹے ہوئے اس لیے وہ خود کو پچھتر سال کا

ہی باور کرتی ہے۔ وہ اسکول نہیں جاسکتی کیونکہ گیارہ سال کی ہونے کا باوجود وہ اسکول ٹیچر کو اپنا بچہ سمجھتی ہے۔ اس لیے گیارہ سال کی ہونے کے باوجود اس کی شخصیت اور اسکا ذہن ایک پچھتر سالہ عورت کے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح قلانچیں نہیں بھر سکتی اور صرف ایسی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے جو صرف عمر رسیدہ خواتین ہی کر سکتی ہیں۔ وہ ہر وقت بے چین اور متجسس رہتی ہے۔ اس کے جسم اور ذہن میں کوئی مطابقت نہیں۔ وہ سخت تکلیف اور رنجیدہ حالت میں ہے۔

میں نے اس کے حافظے سے پچھلے جنم کی یادیں مٹانے میں اس کی مدد کرنے کے خیال سے اس کے والدین کو اسے میرے پاس لانے کے لیے کہا۔ کیونکہ جس طرح یادیں لوٹانے کا ایک طریقہ ہے اسی طرح یادیں بھلانے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ مگر اس کے والدین اس واقعہ سے لطف لے رہے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر اس کو دیکھنے کے لیے آ رہا تھا۔ اور لوگ تو اس کی پوجا بھی کرنے لگے تھے۔ اس کے والدین کو اس کے پچھلے جنم بھلا دینے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ان کو خبردار بھی کیا کہ وہ لڑکی پاگل ہو سکتی ہے لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آج وہ لڑکی پاگل ہونے کے قریب ہے کیونکہ کوئی بھی اس طرح تین جنموں کی یادوں کو ساتھ لیے معمول کی زندگی نہیں گذار سکتا۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ اس کی شادی کیسے کی جائے؟ پچھتر سال کی عمر کے ساتھ وہ شادی کے تصور کو ہضم ہی نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر کوئی باہم ربط نہیں ہے، اس کا جسم نیا ہے لیکن ذہن پرانا۔ یہ ایک بہت پیچیدہ صورت حال ہے۔

مگر یہ ایک حادثہ تھا۔ آپ بھی ایک تجربے کے ذریعے یہ راستہ کھول سکتے ہیں۔ ہاں لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ راستہ اسی سمت میں جائے۔ پھر بھی جو لوگ چاہیں وہ تجربہ کر سکتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے ان کو چاہیے کہ وہ مکمل ارتکاز کے ذریعے اپنے ذہن کو اس قابل کر لیں کہ جب یادوں کا بند ٹوٹ جائے تو وہ اس کو سہار سکیں اور ان کی حیثیت ایک گواہ کی رہے۔ جب کوئی گواہ کی حیثیت سے ان واقعات کو دیکھے گا تو اس کو سب کچھ خواب کی طرح محسوس ہوگا۔ پھر وہ اس کے اوپر اثر انداز نہیں ہوگا کیونکہ پھر سب کچھ خواب کے مانند ہوگا۔

جب کوئی اپنی گذشتہ زندگی یاد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو اس کو اپنی موجودہ زندگی بھی ایک خواب کے مانند دکھائی دینے لگے گی۔ جن لوگوں نے اس دنیا کو 'مایا' کا نام دیا ہے انھوں نے کسی فلسفیانہ نظریہ کی بنا پر نہیں...... بلکہ اس کی بنیاد جاتی سمارن یعنی گذشتہ دور حیات یاد

کرنے کے عمل پر ہے۔ جو کوئی بھی اپنی پچھلی زندگی یاد کرنے میں کامیاب ہوگا اس کے نزدیک ہر چیز ایک خواب، ایک فریب کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ اسکی پچھلی زندگی کے دوست احباب کہاں ہیں؟ اس کے عزیز، رشتہ دار، اس کے بیوی بچے، وہ مکان جس میں وہ رہتا تھا، وہ دنیا کہاں ہے؟ ہر وہ چیز کہاں گئی جس کو وہ حقیقی سمجھتا تھا؟ وہ پریشانیاں کیا ہوئیں جن کی وجہ سے وہ راتوں کو کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ وہ تکالیف اور ابتلائیں کیا ہوئیں جن کا ناقابل برداشت بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا تھا؟ اور وہ مسرتیں کہاں ہیں جن کے پیچھے وہ مارا مارا پھرتا تھا؟ ان تمام چیزوں کا کیا ہوا جن کے لیے وہ ہر وقت آمادۂ پیکار رہا کرتا تھا۔ اگر آپ کبھی اپنی گذری ہوئی زندگی یاد کریں، اور آپ ستر سال تک جئیں تو آپ اس زندگی کو خواب کے مانند دیکھیں گے یا حقیقت کی طرح؟ بے شک وہ ایک خواب کی مانند دکھائی دے گا جو آیا اور گذر گیا۔

میں نے سنا ہے کہ:

ایک بار ایک بادشاہ کا بیٹا بستر مرگ پر دراز ہو گیا، آٹھ دن تک وہ بے ہوشی کے عالم میں رہا، نہ تو وہ صحت یاب ہوا اور نہ ہی مر سکا۔ ایک طرف تو بادشاہ اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا رہا جبکہ دوسری طرف حد سے زیادہ تکلیف اور پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس کی زندگی کو بے مصرف سمجھنے لگا۔ وہ بادشاہ آٹھ راتوں تک سو نہیں سکا، لیکن ایک روز صبح چار بجے کے قریب اس کو نیند نے آ لیا اور وہ خواب میں محو ہو گیا۔

ہم عموماً خواب میں اپنی ان خواہشات کو دیکھتے ہیں جو پوری نہیں ہو سکیں، بادشاہ بھی اپنے مرتے ہوئے فرزند کے نزدیک بیٹھا خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کے بارہ جوان اور خوبصورت بیٹے ہیں۔ اس نے خود کو پوری دنیا کے ایک بہت بڑے بادشاہ کے روپ میں دیکھا جس کے بے شمار عالیشان محل تھے۔ اس نے خود کو بے اندازہ خوش دیکھا...... اور یہ سب وہ خواب میں دیکھ رہا تھا۔

خواب میں وقت بہت تیزی سے گذرتا ہے، ہماری روزمرہ زندگی کے اوقات سے قطعی مختلف۔ خواب کے ایک لمحے میں ان گنت سال گذر جاتے ہیں اور جاگنے پر آپ حیرت کرتے ہیں کہ ایک مختصر سے خواب میں اتنا لمبا عرصہ کیسے گذر گیا۔

پس وہ بادشاہ جب اپنے بارہ بیٹے، ان کی خوبرو بیویاں، اپنے محلات اور اپنی سلطنت

دیکھ رہا تھا' اس کا بارہ سالہ بیمار شہزادہ چل بسا۔ ملکہ کے چلانے سے اس کا سہانا خواب اچانک ٹوٹ گیا۔

وہ ایک جھٹکے سے جاگ اٹھا۔ اس کی ملکہ نے پریشان ہوکر پوچھا کہ وہ اتنا خوف زدہ کیوں ہے؟ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں ہیں؟ وہ خاموش کیوں ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا: نہیں میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ بلکہ پریشان ہوں۔ میں سخت بے یقینی کی حالت میں ہوں' میں سوچ رہا ہوں کہ میں کس کے لیے آنسو بہاؤں؟ اپنے ان بارہ بیٹوں کو روؤں جو چند ساعت پہلے میرے ساتھ تھے یا اس کو جو ابھی مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ مجھے جو چیز پریشان کررہی ہے وہ یہ ہے کہ کون مرا ہے؟ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب میں اپنے ان بارہ بیٹوں کے ساتھ تھا تو مجھے اس بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہاں اس کا اور تمھارا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اور جب میں خواب سے بیدار ہوا ہوں تو یہ محل بھی ہے' تم بھی ہو اور میرا یہ بیٹا بھی ہے لیکن وہ محلات اور وہ بیٹے گم ہو گئے ہیں۔ ان میں سے سچ کیا ہے؟ سچ یہ ہے یا وہ سچ تھا؟ مجھے تمیز کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

جیسے ہی آپ اپنی پچھلی زندگی کے واقعات یاد کرنے میں کامیاب ہوں گے تو آپ کو یقین کرنے میں مشکل پیش آئے گی کہ اس زندگی میں آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ سب کچھ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں مگر باقی کچھ بھی نہیں ...... ہر چیز فنا ہوتی رہی ہے۔ پھر جو سوال پیدا ہوگا وہ یہ کہ: کیا یہ سب کچھ جو میں اب دیکھ رہا ہوں وہ اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ میں پہلے دیکھ چکا ہوں؟ ...... یہ سب کچھ بھی پچھلے خوابوں کی طرح معدوم ہو جائے گا۔

فلم دیکھنے کے دوران ہم کو لگتا ہے کہ جیسے سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔ جب فلم ختم ہو جاتی ہے تو ہم کو حقیقت کی طرف لوٹنے اور یہ تسلیم کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے کہ جو کچھ سنیما میں دیکھا وہ محض ایک فریب تھا۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ جو اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے وہ آنسو بھی بہاتے ہیں۔ اس طرح وہ سکھ کا سانس لیتے ہیں اور ان کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کسی دوسرے موقعے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ وہ سنیما میں خود کو ہنسنے بھی دیتے ہیں اور رونے بھی۔ جب ہم سنیما سے باہر آتے ہیں تب احساس ہوتا ہے کہ ہم اسکرین پر دکھائے جانے والے

مناظر میں کتنے منہمک ہو گئے تھے۔ اگر وہی فلم ہم بار بار دیکھیں تو اس کے فریب میں بتدریج کمی آتی جائے گی۔ پھر ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ پچھلی فلم دیکھنے کے دوران ہم کو کیا ہو گیا تھا؟ پھر جب ہم دوبارہ کوئی فلم دیکھتے ہیں تو اس کے واقعات میں ایک بار پھر ملوث پاتے ہیں۔

اگر ہم اپنی پچھلی زندگی کے دوران گذرنے والے واقعات یاد کر سکیں تو ہم کو اپنی موجودہ زندگی بھی خواب کے مانند دکھائی دینے لگے گی۔ یہ ہوائیں پہلے بھی کتنی بار چلتی رہی ہیں' یہ بادل کتنی بار آسمانوں میں گھومتے رہے ہیں' ان سب کو ہم پہلے بھی غائب ہوتے ہوئے دیکھتے رہے ہیں' اور یہ جو اب ہم دیکھ رہے ہیں آخر کار اسی طرح غائب ہو جائیں گے۔ وہ پہلے ہی غائب ہونے کے عمل سے گذر رہے ہیں۔ ہم اگر اس کی حقیقت کو سمجھ جائیں تو ہمیں علم ہو سکے گا کہ مایا کا تصور کیا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ ادراک بھی ہوگا کہ گذرنے والے تمام واقعات غیر حقیقی اور ناقابلِ شناخت اور عارضی ہیں' ایک خواب آتا ہے' پھر دوسرا اور اس کے بعد بھی خوابوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک لمحے سے سفر شروع ہوتا ہے اور دوسرے لمحے میں داخل ہو جاتا ہے۔ لمحات کے بعد لمحات آکر گذر جاتے ہیں لیکن سفر آگے کی طرف جاری رہتا ہے۔

اس طرح ہمیں دو تجربات حاصل ہوئے: ایک یہ کہ (مایا) مادی دنیا کا وجود محض ایک فریب ہے صرف اسے دیکھنے والا حقیقی ہے ...... دوسرا یہ کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ بھی ایک فریب ہے' صرف شاہد' (اس کا نظارہ کرنے والا) سچ ہے۔ نظارے ہر وقت تغیر پذیر ہیں ...... ہمیشہ سے رہے ہیں ...... صرف ان کو دیکھنے والا ہمیشہ سے ناقابلِ تبدیلی ہے' یہ بھی یاد رہے کہ جب تک مناظر حقیقی دکھائی دیتے رہیں گے' آپ کی توجہ تماشبین کی طرف ہونا ممکن نہیں۔ جب تک پیشِ نظر موجودات غیر حقیقی نہ لگنے لگیں تب تک کوئی شاہد سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا میرا کہنا یہ ہے کہ گذشتہ زندگی کی یادداشت مفید ہو سکتی ہیں لیکن صرف اسی صورت میں جب تک آپ دھیان کی گہرائیوں میں غرق نہیں ہو جاتے۔ دھیان میں ڈوب جاؤ اتنے کہ آپکو زندگی ایک خواب کے مانند لگنے لگے۔ مہاتما' یا ایک نیک صفت درویش بننا بھی ایک چور بن جانے جیسا خواب ہے ...... آپ اچھے خواب بھی دیکھ سکتے ہیں اور برے خواب بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چور بن جانے کا خواب بہت جلد تحلیل ہو جائے گا' لیکن مہاتما بننے کا خواب تحلیل ہونے میں وقت لے گا کیونکہ یہ کیفیت ہماری پسندیدہ ہوگی۔ اس وجہ سے چور کے مقابلے میں مہاتما بن

جانے کا خواب خطرناک ہے۔ ہم خوش آئند خوابوں میں رہنا پسند کرتے ہیں جبکہ تکلیف دہ خواب جلد اور خود بخود تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گناہگار خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے اور نیک آدمی اس میں کامیاب نہیں ہوتا۔

میں نے آپ کو پچھلے جنموں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے ضمن میں چند باتیں بتائی ہیں، مگر اس کے لیے آپ کو گہرے استغراق میں جانا ہوگا۔ آیئے ہم آج کے بعد سے استغراق میں جانے کی تیاری شروع کریں، اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا پیش آتا ہے۔ پیشگی تیاری کے بغیر پچھلے دورِ حیات میں جھانکنا ممکن نہیں۔

بطور مثال تہہ خانوں پر مشتمل ایک بہت بڑا مکان ہے، عمارت کے باہر کھڑے ہوئے انسان کو تہہ خانوں میں جانے کے لیے پہلے مکان میں داخل ہونا پڑے گا کیونکہ وہاں جانے کا راستہ اس مکان کے اندر ہے۔ ہماری پچھلی زندگیاں ان تہہ خانوں کے مانند ہیں، کبھی ہم وہاں رہا کرتے تھے جنھیں ہم نے بعد میں چھوڑ دیا تھا اور اب ہم کہیں اور رہتے ہیں۔ کچھ بھی سہی اب ہم اس مکان کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس دور کی باتیں یاد کرنے کے لیے ہم کو مکان کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ اس میں کوئی مشکل، خطرہ یا الجھن کچھ بھی نہیں ہے۔

ایک اور دوست جو جوگی ہے اس نے دعویٰ کیا ہے کہ پچھلے جنم میں وہ ایک چڑیا تھا۔ اب اس نے پوچھا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے؟

اپنا موجودہ لبادہ بدلنے سے پہلے یہ ممکن ہے کہ کوئی آدمی کبھی جانور رہا ہو۔ مگر وہ دوبارہ جانور کے قالب میں نہیں آسکتا۔ تبدیلی کے عمل کے دوران کوئی بھی اپنی موجودہ سطح سے کم تر سطح پر نہیں آسکتا۔ بلند تر درجے کی طرف مراجعت البتہ ممکن ہے۔ مگر یہ کسی طور بھی ممکن نہیں کہ کوئی اپنے موجودہ مقام سے کم تر درجے میں جا پڑے۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں کہ یا تو ہم ترقی کر جائیں یا پھر اپنے موجودہ مقام پر ہی رکے رہیں۔

یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی بچہ پہلے درجے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کو دوسرے درجے میں بھیج دیا جاتا ہے...... لیکن اگر وہ اس میں فیل ہو جاتا ہے تو اس کو اسی درجے میں رہنے دیا جاتا ہے۔ ایسی کوئی صورت نہیں کہ اس کو پہلے درجے سے بھی کم تر درجے میں بھیجا جاسکے۔ بالکل اسی طرح اگر وہ دوسرے درجے میں فیل ہو جاتا ہے تو اس کو وہیں رہنے دیا جاتا

ہے اس کو واپس پہلے درجے میں نہیں بھیجا جاسکتا۔ ہم یا تو ایک مدت تک ایک ہی نسل میں رہ سکتے ہیں یا اس سے اگلی کسی بہتر نسل میں منتقل ہو سکتے ہیں، مگر اپنی موجودہ نسل سے کم تر کسی نسل میں واپس نہیں ہو سکتے۔

البتہ یہ بات یقینی طور پر ممکن ہے کہ کوئی پچھلی بار چوپایہ یا پرندہ رہا ہو۔ بیشک وہ رہا ہوگا لیکن یہ بالکل الگ بات ہے کہ وہ اس نسل میں کتنے عرصے تک رہا۔ اگر ہم اپنی پچھلی زندگی میں جھانک سکیں تو ہم یہ بھی جان لیں گے کہ اب تک ہم کس کس نسل سے متعلق رہ چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم جانور بھی رہے ہوں، ایک پرندہ، ایک چھوٹی چڑیا یا اس سے بھی کسی چھوٹی ذات کے۔ خود آگہی کی اس کیفیت میں ہم اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں جہاں ہم اپنی شعوری حیثیت سے کلیتہً بے بہرہ ہو چکے ہوں۔

پہاڑ بھی کوئی شعور نہ رکھنے کے باوجود زندہ ہیں۔ وہ ننانوے فیصد خود آگہی کے حامل ہیں اور ایک فیصد بے حس۔ جیسے جیسے زندگی متبدل ہوتی ہے شعور جاگا رہتا ہے اور خود آگہی کم تر ہوتی جاتی ہے۔ خدائی سو فیصد ایک شعوری کیفیت ہے۔ خدائی اور مادی وجود کے درمیان کچھ فیصد کا فرق ہے اور یہ فرق مقدار کا ہے نا کہ معیار کا۔ یہی وجہ ہے کہ مادی وجود خدا کے روپ میں جلوہ گر ہوسکتا ہے۔

یہ یقین کرنے میں نہ تو حیرت کی کوئی بات ہے اور نہ یہ مشکل ہے کہ کوئی انسان پہلے جنم میں کوئی جانور رہا ہو۔ البتہ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ہم انسان ہونے کے باوجود جانوروں جیسے رویہ کے حامل ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم سب اپنے پچھلے جنموں میں جانور رہے ہوں۔ بظاہر انسان ہونے کے باوجود ہماری ذہنی سطح اتنی ہی پست ہوسکتی ہے جتنی جانوروں کی۔ اپنے رجحانات کا جائزہ لینے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بیشک ہم اب جانور نہیں ہیں لیکن ابھی انسان بھی نہیں ہیں۔ گویا کہ ہم دو نسلوں کے بیچ میں کہیں اٹکے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی کوئی موقعہ نصیب ہوتا ہے ہمیں جانور بننے میں دیر نہیں لگتی۔

فرض کریں کہ آپ شریفانہ طریقے سے سڑک پر چل رہے ہیں کہ ایک شخص آ کر آپ کو گھونسے رسید کرے اور گالیوں سے نوازے، اچانک آپ کا شریف آدمی اندر کے اس جانور کو راستہ دیدیتا ہے جو کسی گذشتہ زندگی میں آپ رہے ہوں۔ آپ کا چہرہ بگڑ جاتا ہے اور وہ بلا آپ

کے اندر سے اتنے وحشتناک طریقے سے باہر نکل آتی ہے کہ آپ کے انسان ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔

ہمارا وجود پچھلے جنموں کی ان تمام خصوصیات کا ملغوبہ ہے جو ہم گزار چکے ہیں۔ تہہ در تہہ ہمارے اوپر وہ تمام کیفیات چڑھی ہوئی ہیں جو ہمارے مزاج کا حصہ رہ چکی ہیں۔ ہم ذرا اپنے اندر جھانکیں تو اپنی ذات کی عمیق گہرائیوں تک جاسکتے ہیں۔ ہم اپنی حیات کے اس حصے تک بھی پہنچ سکتے ہیں جب ہم پہاڑ کی صورت تھے۔ پھر اس پہاڑ کے اندر بھی ایک اور تہہ موجود ہوگی۔ کہیں اپنے بہت اندر ہم اب بھی چٹانوں کی طرح ہیں' اسی کی وجہ ہے کہ جب کوئی ہم کو مجبور کرتا ہے تو ہم پتھر بن جاتے ہیں' ایک چٹان کی طرح پیش آسکتے ہیں۔ ہم جانوروں جیسا برتاؤ بھی روا رکھ سکتے ہیں۔ اور ہم کرتے بھی ہیں۔ اس سے آگے جو کچھ ہے وہ ہماری وہ مخفی خوبیاں ہیں جو ہمارے گذشتہ ادوار کی تہیں نہیں ہیں۔ گو ہم بعض اوقات ان خوبیوں کا مظاہرہ بھی کر لیتے ہیں مگر جلد ہی واپس اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں۔

ہمارے اندر آفاقی خصوصیات موجود ہیں اس لیے ہم کسی دن اوتار بھی بن سکتے ہیں' مگر ابھی نہیں ہیں۔ اس وقت ہم جو کچھ ہیں وہ اس کا عکس ہیں جو ہم ماضی میں رہ چکے ہیں۔

لہٰذا دو باتیں ہیں: اول یہ کہ جب ہم اپنے اندر جھانکیں گے تو ہمارے سامنے اپنی پچھلی زندگیوں کے عکس دکھائی دیں گے۔ دوسری یہ کہ اگر ہم کو مستقبل میں دھکیل دیا جائے تو ہم اپنی آنے والی زندگی کا مشاہدہ کرسکیں گے۔ بہر حال جب کوئی چھلانگ لگاتا ہے تو وہ ایک خاص وقت تک زمین سے اوپر ہوا میں رہتا ہے مگر دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر آجاتا ہے...... اسی طرح ہم کبھی کبھی اپنی جانوروں والی زندگی سے نکل کر انسان بن جاتے ہیں مگر فوراً ہی اپنی اصلی حالت میں واپس آجاتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو جان لیں گے کہ چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت' ہم حقیقتاً ایک انسان بن جاتے ہیں۔ اور یہ بات ہمیں خوب اچھی طرح معلوم بھی ہے۔

آپ نے بھکاریوں کو دیکھا ہوگا۔ یہ لوگ کبھی شام کے وقت نہیں آتے ہمیشہ صبح کے وقت مانگنے آتے ہیں۔ کیونکہ شام ہونے تک لوگوں کا انسان بنے رہنا عملاً ممکن نہیں۔ ایک انسان رات بھر کی نیند کے بعد صبح کے وقت جب تازہ دم سو کر اٹھتا ہے تو اس کی تازگی اور مسرت کے احساس کے طفیل ایک بھکاری یہ توقع رکھتا ہے کہ اس میں تھوڑی بہت انسانیت ضرور موجود ہوگی۔

وہ شام کے وقت میں خیرات کی امید نہیں رکھتا۔ کیونکہ اسے علم ہے کہ تمام دن ایک انسان کی دفتروں اور بازاروں میں مغز ماری' ہڑتالیں اور مظاہرے' اخبارات اور سیاسیات شام تک اس کو وحشی جانوروں کی سطح تک لانے کے لیے کافی ہوتے ہیں اس لیے وہ کسی سے خیرات کی توقع بھی نہیں رکھتا۔ شام تک ایک انسان تھک تھکا کر ایک وحشی جانور کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ اسی کی وجہ ہے کہ آپ ان وحشیوں کو شام کے وقت اپنی وحشیانہ جبلت کے مظاہرے کے لیے نائٹ کلبوں میں دیکھتے ہیں۔ دن بھر کی انسانی مصروفیات سے تھکا ماندہ شخص شراب' شور وغل' جوا' ناچ گانے اور تھرکتے بدنوں کا خواہش مند ہوتا ہے۔ وہ دوسرے وحشیوں کے درمیان رہنا چاہتا ہے۔ نائٹ کلب اس کے اندر کی پیاس بجھانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شام کے بجائے صبح کا وقت عبادت کے لیے نہایت موزوں ہوتا ہے۔ عبادت گاہوں میں پوجا کی گھنٹیاں صرف صبح کے اوقات میں بجتی ہیں' رات میں نائٹ کلبوں' جوا اور شراب خانوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ فاحشائیں اپنے گاہکوں کو صبح کے بجائے رات میں آنے کی دعوت دیتی ہیں۔

دن بھر کی مشقت کے بعد انسان ایک وحشی میں تبدیل ہو جاتا ہے یہ اسی کی وجہ ہے کہ رات کی زندگی دن کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مساجد سے عبادت کے لیے اذانیں اور عبادت گاہوں میں پوجا کے لیے گھنٹیاں صبح کے وقت بجائی جاتی ہے۔ صبح کے تازہ دم انسان سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ خدا کی طرف رجوع ہوگا جبکہ شام کو تھکے ہوئے انسان سے یہ امید کم ہو جاتی ہے۔

بالکل یہی وجہ کم عمر افراد میں عبادت کی طرف رجحان میں بھی کارفرما ہے۔ عمر رسیدہ افراد سے زیادہ امید نہیں کی جاتی۔ وہ عمر کے اس حصے میں ہوتے ہیں جہاں زندگی ان کو ہر چیز سے محروم کر چکی ہوتی ہے۔ اس لیے چاہئے کہ جلد سے جلد سفر شروع کریں' علی الصبح ممکنہ عجلت میں۔ شام اپنے پر پھیلانے کو ہے۔ اس کے آنے سے پہلے اگر ہم اپنا سفر شروع کر چکے ہوں تو امید کی جاسکتی ہے کہ شام تک ہم خود کو عبادت گاہ میں پائیں۔

اس لیے ہمارا دوست یہ پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ کیا کوئی انسان اپنی پچھلی زندگی میں کوئی جانور یا پرندہ تھا؟ ہم کو جس بات کی آگہی حاصل ہونی چاہئے وہ یہ کہ ہمیں اس زندگی میں پرندہ یا وحشی جانور برقرار نہیں رہنا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم توجہ مرکوز کرنا شروع کریں، ہم کو چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو بالکل آزاد چھوڑ دیں۔ پھر جو کچھ باقی بچ رہنا چاہئے وہی باقی بچے گا۔ ہم کو ہر فانی وجود کو ترک کرنا ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ موت کا تجربہ ہے۔

اس تجربے کے تین حصے ہیں۔ پہلا بدن کو ڈھیلا چھوڑ دینا؛ دوسرا سانس کو اعتدال میں لانا؛ تیسرا خیالات میں ٹھہراؤ۔ جسم، سانس اور خیالات تینوں کو آزاد چھوڑنا ضروری ہے۔

ایک دوسرے سے فاصلے پر بیٹھ جائیں۔ کوئی دوسرے پر گر نہ جائے، لہٰذا اپنے مابین فاصلہ پیدا کر لیں۔ تھوڑا آگے یا پیچھے ہو کر بیٹھ جائیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ آپس میں بالکل نزدیک نہ ہوں۔ بصورتِ دیگر یہ ہوگا کہ آپ تمام وقت خود کو سنبھالنے میں مصروف رہیں گے۔

جب جسم بالکل ڈھیلا پڑ جاتا ہے تو کسے معلوم کہ آگے گرے گا یا پیچھے۔ بحالتِ ہوش و حواس تو آپ اس پر قابو رکھ سکتے ہیں، لیکن جب آپ کا اس پر سے کنٹرول ختم ہو جائے گا تو وہ خود بخود گر جائے گا۔ جب آپ اپنے اندر سے اسے آزاد کر دیں گے تو اس کو کون قابو میں رکھے گا؟ وہ یقیناً گر جائے گا۔ اور اگر آپ اس کے گرنے کی طرف سے پہلے ہی چوکنا رہیں گے تو آپ جہاں کے تہاں رہیں گے...... ارتکاز میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا جب آپ محسوس کریں کہ اب آپ کا جسم گرنے کو ہے تو اس کو ایک نعمت سمجھیں۔ اس کو گرنے سے نہ روکیں اور یکلخت گر جانے دیں۔ اگر آپ اس کو گرنے سے روکیں گے تو اپنے اندر کے سفر میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ اور اگر کوئی دوسرا بھی آپ کے اوپر گرتا ہے تو اس کو گرنے دیں۔ اگر کسی کا سر آپ کے شانے پر ڈھلک جائے تو بھی پریشان نہ ہوں۔

اب بہت آہستگی کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے جسم کو اتنا ڈھیلا چھوڑ دیں گویا اس میں جان ہی نہیں ہے۔ اپنے جسم کی تمام خارجی توانائیاں سمیٹ کر اپنی ذات میں منتقل کرنے کی کوشش کریں۔ جیسے ہی یہ شکتی اندر داخل ہوگی آپ کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ جائے گا۔

اب میں اپنی ہدایات شروع کروں گا کہ جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا ہے؛ کہ اب ہم بالکل خاموش ہوتے جا رہے ہیں؛ جسم کو ڈھیلا ہوتا ہوا محسوس کیجیے۔ ڈھیلا پڑنے دیں...... خود اپنے اندر

داخل ہونے دیں جیسے کوئی مکان میں داخل ہوتا ہے۔ گھس جائیں...... اندر داخل ہو جائیں...... جسم سکون میں آ رہا ہے...... مکمل پرسکون ہونے دیں...... بے جان...... جیسے زندگی کی قید سے آزاد۔ جسم سکون میں آ رہا ہے۔ جسم پر سکون طاری ہو گیا۔ جسم مکمل طور پر سکون میں آ گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا جسم مکمل طور پر پرسکون ہو چکا ہے اور یہ کہ آپ نے اس پر سے اپنا کنٹرول بالکل ختم کر دیا ہے۔ اگر آپ کا جسم گرتا ہے تو گرنے دیں؛ اگر یہ آگے کی طرف جھکتا ہے تو جھکنے دیں، غرض جو کچھ ہوتا ہے ہونے دیں، بس آپ پرسکون ہو جائیں۔ اس بات کا خیال رہے کہ آپ پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ اپنے اندرون پر ایک نظر ڈالیے کہ آپ کے اوپر کوئی دباؤ تو نہیں ہے۔ آپ یہ کہنے کے قابل رہ سکیں "میرے اوپر کوئی دباؤ نہیں، میں نے خود کو بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے"

جسم بے حس ہو چکا ہے، جسم ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ سانسیں پرسکون ہونے لگی ہیں، سانسیں آہستگی پر مائل ہیں، اس کیفیت کو محسوس کیجیے، تنفس بہت آہستہ ہو گیا ہے...... اس کو بالکل آہستہ ہو لینے دیں، سانسوں پر سے اپنا اختیار بالکل ختم کر دیں اور ان کو خود بخود آنے جانے دیں۔ سانس آہستہ ہونے لگی ہے...... سانس خاموش ہونے لگی ہے۔ آخر کار سانس بالکل آہستہ ہو گئی، بالکل پرسکون ہو گئی۔

سانسیں خاموش ہو گئیں...... خیالات بھی ساکت ہونے لگے ہیں۔ اس کو محسوس کیجیے: ان کو مکمل بے حرکت ہونے دیں، اپنے جسم کو بھی بالکل آزاد چھوڑ دیں۔ آپ نے اپنی سانسوں کو سکون دے دیا ہے، اب اپنے خیالات کو بھی ساکت کر دیں...... منتقل ہو جائیں...... مکمل طور پر اپنے اندرون میں داخل ہو جائیں۔ ہر قسم کے خیالات سے بالکل دور۔

اب ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہے جیسے ہر خارجی چیز بے جان ہو گئی ہے۔ ہر چیز مر چکی ہے...... ہر چیز پر مکمل سکوت طاری ہے۔ صرف اندر کی جانب آگہی کا دیا جلا ہوا ہے۔ شعور کا روشن دیا۔ باقی سب کچھ فنا ہو چکا ہے...... ہو جانے دیں، مکمل طور پر فنا ہو جانے دیں بالکل ایسے جیسے آپ ہیں ہی نہیں۔ ہو جانے دیں...... جیسے آپ کا وجود فنا ہو چکا ہے...... جیسے آپ کے وجود کا کچھ نہیں بچا۔ آپ کی سانسیں خاموش ہیں...... آپ کے خیالات ساکت ہیں...... جیسے موت واقع ہو گئی ہے۔ اپنے اندر گھس جائیں...... مکمل طور پر اندر چلے جائیں۔ ہر شے کو فنا

ہوجانے دیں۔سب کچھ جانے دیں۔کچھ مت بچائیں۔جیسے آپ مر چکے ہیں۔

ایسا محسوس کریں کہ جیسے ہر شے فنا ہو چکی ہے۔جیسے کوئی چیز زندہ نہیں بچی۔آپ کے اندر صرف ایک چراغ روشن رہ گیا ہے۔اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ہر چیز فنا ہو چکی ہے...... محو ہو چکی ہے۔خلا کی اس کیفیت میں دس منٹ تک ایک شاہد کی طرح رہیں' اور اپنی اس موت کا مشاہدہ کریں۔آپ کے اطراف میں موجود ہر چیز گم ہوگئی ہے۔آپ کا وجود بھی الگ ہوگیا۔ بہت پیچھے کہیں رہ گیا۔بہت دور...... ہم اسکو صرف دیکھ رہے ہیں۔دیکھتے رہیے۔شاہد و ناظر...... دس منٹ تک اپنے اندر کا مشاہدہ کرتے رہیے۔

اپنے اندر جھانکتے رہیے...... باہر موجود ہر شے فنا ہوجائے گی۔جاری رکھیں...... مکمل طور پر فنا ہو جائیں۔صرف ایک گواہ کی حیثیت سے دیکھتے رہیے۔ہر چیز سے دور ہوتے جایئے جیسے آپ مر چکے ہیں......اور خارج میں آپ کا جسم بھی مردہ ہو چکا ہے۔جسم ساکت ہے...... خیالات ساکت ہیں' صرف آگہی کا چراغ دیکھ رہا ہے......صرف دیکھنے والا گواہ باقی بچا ہے۔ چلنے دیں......اسی طرح جاری رہنے دیں۔

جو کچھ ہو رہا ہے اس کو ہونے دیں' بالکل گم ہو جایئے' صرف اپنے اندر جھانکتے رہیے اور ہر چیز کا خیال چھوڑ دیجئے' اپنے اوپر سے اپنا اختیار بالکل ختم کر دیجیے۔

دماغ خالی اور خاموش ہو چکا ہے' ذہن مکمل طور پر خالی ہو گیا ہے۔اگر ابھی تک آپ کے اوپر کوئی دباؤ ہے تو اس سے چھٹکارا حاصل کیجیے۔ہر چیز کو جانے دیں۔گم ہو جانے دیں جیسے آپ ہیں ہی نہیں۔ذہن خالی ہو چکا ہے...... ذہن خاموش اور خالی ہو چکا ہے۔یہاں تک کہ ذہن بالکل ہی خالی اور خاموش ہو چکا ہے۔

اپنے اندر کی طرف محوِ نظارہ رہیے۔پوری شعوری حالت میں اپنے اندر کا مشاہدہ کیجیے۔ہر چیز پر سکوت طاری ہے۔آپ جسم سے علیحدہ ہو چکے ہیں' بہت پیچھے کہیں چھوڑ چکے ہیں۔ ذہن کو بھی بہت پیچھے کہیں چھوڑ دیا ہے۔صرف ایک چراغ روشن ہے' شعور و آگہی کا چراغ ہر طرف ایک روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

اب نہایت آہستگی سے چند سانسیں لیں اور انھیں دیکھتے رہیں...... ہر سانس کے ساتھ خاموشی گہری ہوتی جائے گی۔ان سانسوں کے ساتھ اپنے اندر کا مشاہدہ بھی کرتے رہیے اور

سانسوں کی نگرانی بھی جاری رکھیے۔ذہن بھی مزید خاموش ہو جائے گا۔آہستہ آہستہ چند سانسیں لیجیے...... پھر نہایت آہستگی سے آنکھیں کھولیے۔اگر آپ میں سے کوئی گرا ہوا ہے تو وہ پہلے ایک گہرا سانس لے پھر آہستگی سے اٹھ بیٹھے۔اگر اٹھنے کی حالت میں نہیں ہیں تو جلدی مت کیجیے' اگر آنکھیں کھولنے میں پریشانی ہو رہی ہو تو پہلے ایک گہرا سانس لیجیے پھر بہت آہستہ سے آنکھیں کھولیے...... بہت نرمی کے ساتھ اٹھیے۔کوئی عمل عجلت میں مت کیجیے۔نہ آنکھیں کھولنے کا نہ اٹھ کر بیٹھنے کا۔

اس کے ساتھ ہی ہمارا صبح کا ارتکاز ختم ہوا۔

☆

تیسرا باب

کل کائنات ایک عبادت گاہ ہے

میرے پیارو!

ایک دوست نے سوال کیا ہے:

آپ نے آفاقی سچائی جاننے کے لیے ہمیں اپنی ذات کی نفی کرنے کا طریقہ بتایا ہے: خود آگہی کے لیے ہر چیز کی نفی۔ کیا اس کے برعکس کرنے سے بھی یہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم ہر چیز میں خدا کا نظارہ نہیں کر سکتے؟ کیا ہم اس کو ہر چیز میں محسوس نہیں کر سکتے؟

یہ جاننے کے لیے یوں سمجھیں:

جب تک خدا کو کوئی اپنے اندر محسوس نہیں کرے گا وہ اس کو کہیں بھی نہیں پہچان سکے گا۔ جس نے ابھی تک اس کو اپنے اندر نہیں پایا ہے وہ اس کو دوسروں کے اندر کبھی شناخت نہیں کر سکے گا۔ ذات کا مطلب وہ چیز جو آپ کے سب سے زیادہ نزدیک ہے، پھر جو آپ سے فاصلے پر ہے وہ آپ سے دور سمجھا جائے گا۔ اگر آپ خدا کو اپنی ذات کے اندر...... جو آپ سے نزدیک ترین ہے، نہیں دیکھ سکتے تو بھلا جو لوگ آپ سے دور ہیں...... آپ سے علیحدہ ہیں...... ان میں آپ اسے کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ پہلے آپ خدا کو خود اپنے اندر محسوس کریں۔ پہلے اس کو خود محسوس کریں...... یہی نزدیک ترین راستہ ہے۔

ذہن میں رہے...... بڑی دلچسپ بات ہے کہ جس کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے وہ ہر چیز کی حقیقت جان لیتا ہے۔ اپنی ذات میں داخلہ ہر ایک کے اندر داخل ہونے کے مترادف ہے۔ جیسے ہی کوئی اپنے اندر جھانکنے کی اہلیت حاصل کرتا ہے اس کو لگتا ہے کہ اس کو ہر کہیں داخل

ہونے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہم باہر ایک دوسرے سے لاکھ مختلف سہی، اندر سے بالکل ایک ہیں۔

بظاہر کسی درخت کے تمام پتے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی صرف ایک پتا لے کر اس کا بغور مشاہدہ کرے تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ تمام پتے بالکل ایک جیسے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ دیکھنے پر ہر پتے کی ساخت میں فرق معلوم ہو گا۔ مگر جب آپ اس کی اندرونی ساخت کے بارے میں تحقیقات کریں گے تو یہ راز افشا ہو گا کہ تمام پتے جہاں سے نمودار ہوتے ہیں اور جہاں تحلیل ہو جاتے ہیں وہ مخرج ایک ہی ہے۔ ایک کا داخل ہونا گویا سب کا داخل ہونا ہے۔

من و تُو کے مابین فرق صرف اسی وقت تک رہے گا جب تک ہم اپنے اندر کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ جب ہم اپنے آپ میں داخل ہوں گے تو ہمارے اندر سے 'میں' کے ساتھ 'تو' بھی غائب ہو جائے گا۔ اس کے بعد جو بچے گا وہ 'کُل' ہو گا!

فی الواقعہ یہ بھی ہے کہ کُل...... میں اور تو...... کا حاصل جمع نہیں ہے۔ یہ تو وہ کیفیت ہے جب...... میں اور تو دونوں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں جو حاصل ہوتا ہے وہی کُل ہے۔ جب تک 'میں' ختم نہیں ہوتی تب تک 'میں اور تُو' کو جمع کیا جا سکتا ہے مگر اس کا حاصل جمع حقیقت پر مبنی نہیں ہو گا۔ جیسے کوئی سارے پتے جمع کر لے تب بھی درخت وجود میں نہیں آ سکے گا خواہ تمام کے تمام پتے اکٹھے کر کے اس کے اوپر چڑھا دیے جائیں۔ ایک درخت کا مطلب تمام پتوں کے ڈھیر سے کہیں زیادہ ہے۔ جمع کے فارمولے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے جمع کرنا ایک غلطی شمار کیا جائے گا۔ ایک پتے کو دوسرے میں جمع کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم دوسرے پتوں کو علیحدہ وجود کا حامل تسلیم کرتے ہیں۔ ایک درخت علیحدہ علیحدہ پتوں کا مجموعہ ہرگز نہیں ہے۔

لہٰذا ہم جیسے ہی اپنے آپ میں سما جاتے ہیں تو ہماری 'میں' کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ پہلی کیفیت جو اس کے نتیجے میں زائل ہوتی ہے وہ اپنے علیحدہ وجود کی نفی ہوتی ہے۔ اور جب اپنے آپ کی نفی ہوتی ہے، ہر غیر کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ اور کُل باقی رہ جاتا ہے۔

اور اس کو کُل کہنا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ کُل بھی اسی قدیم 'میں' کا ملغوبہ ہے۔ وہ جو اس کی حقیقت سے واقف ہیں وہ اس کو کُل کہنے کے بجائے الٹا سوال کریں گے کہ کن چیزوں کا

مجموعہ؟ ہم کیا کیا جمع کر رہے ہیں؟ آخر کار ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ سب کچھ صرف ایک ہے۔ البتہ ان کو یہ اعتراف کرنے میں بھی تامل ہوگا کہ ایک کو علیحدہ رکھنے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا بھی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دو کے بغیر اکیلا ایک کوئی معنی نہیں رکھتا۔ واحد کی پہچان ہی دوسرے سے ہے۔ پھر بھی وہ لوگ جو گہرا ادراک رکھتے ہیں، ہرگز اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ سب کچھ صرف ایک ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ عدم تثنیہ ایک حقیقت ہے۔

اب دیکھئے کہ یہ کتنی دلچسپ صورتحال ہے: یہ لوگ کہتے ہیں کہ دو کہیں نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں صرف ایک برحق ہے، دو ہرگز نہیں۔

کوئی پوچھ سکتا ہے: کہ آپ معموں میں کیوں بات کرتے ہیں؟ سادہ طریقے پر یہ کیوں نہیں کہتے کہ صرف ایک برحق ہے۔ البتہ 'ایک' کو برحق کہنے میں یہ قباحت ہے کہ پھر دوسرے کا تصور ابھرتا ہے۔ پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دو نہیں ہیں تو لازمی طور پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تین بھی نہیں ہیں۔ حتمی نتیجہ یہ کہ نہ ایک ہے نہ کئی ہیں نہ سب ہیں۔ درحقیقت یہ تصور صرف اکیلے اپنے وجود سے ابھرا ہے۔ لہٰذا اپنی ذات کی تفریق سے...... جو سب کچھ ہے...... بس ایک ناقابلِ تقسیم اکائی باقی رہ جاتی ہے۔

لیکن یہ جاننے کے بعد کیا ہم وہ کر سکتے ہیں جس کی ترغیب ہمارا دوست ہمیں دے رہا ہے: کیا ہم ہر چیز میں خدا کا مشاہدہ کر سکتے ہیں؟ ایسا کرنا صرف تصوراتی طور پر ممکن ہے۔ اور تصور کرنا بات کی تہہ تک پہنچنے کے مترادف نہیں۔

کافی عرصہ ہوا جب کچھ لوگ میرے پاس ایک نیک آدمی کو لے کر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شخص گذشتہ تیس سال سے خدا کو ہر چیز میں دیکھ رہا ہے۔ پھولوں میں، پودوں میں، پہاڑوں میں، غرض ہر چیز میں۔ میں نے اس کو کہا کہ اگر وہ کسی مشق کے ذریعے ایسا کر رہا ہے تو اس کے تصورات باطل ہیں۔ وہ میری بات نہیں سمجھا۔ میں نے دوبارہ اس سے کہا: کیا تم نے کبھی اس کو ہر چیز میں دیکھنے کی خواہش یا تصور کیا ہے؟ کہنے لگا کہ ہاں تیس سال قبل میں نے سادھنا کی مشق شروع کی جس میں خدا کو ہر چیز میں دیکھنے کی خواہش شامل ہوتی تھی، اور میں خدا کو ہر چیز میں دیکھنے لگا۔ میں نے اس کو تین دن اپنے پاس رہنے کے لیے اور اس عرصے میں اسے خدا کو ہر چیز میں دیکھنے سے باز رہنے کے لیے کہا۔

وہ آمادہ ہوگیا۔ مگر دوسرے ہی دن وہ کہنے لگا: تم نے مجھے سخت نقصان پہنچادیا، ابھی صرف بارہ گھنٹے گذرے ہیں اور مجھے چٹان چٹان دکھائی دے رہی ہے اور پہاڑ پہاڑ۔ تم نے مجھ سے خدا کو دور کر دیا ہے۔ تم کس قماش کے انسان ہو؟

میں نے کہا: اگر صرف بارہ گھنٹے مشق نہ کرنے سے خدا چھن سکتا ہے، تو جو کچھ تم دیکھتے رہے ہو وہ خدا ہرگز نہیں تھا...... صرف تمھاری لگاتار مشق کا نتیجہ تھا۔ یوں سمجھو جیسے کوئی شخص بلا توقف کسی بات کی تکرار کرتے ہوئے فریبِ نظر کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے خدا کو کسی چٹان کے روپ میں دیکھنا اس وقت تک قابلِ قیاس نہیں جب تک کہ وہ اس مرحلہ پر نہیں پہنچ جاتا جب چٹان میں دیکھنے کے لیے خدا کے سوا کچھ اور باقی نہ بچے۔ یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔

آپ اپنی کوشش سے خدا کو چٹان میں دیکھنا شروع تو کر سکتے ہیں۔ مگر وہ خدا سوائے آپ کے تصوراتی خاکے کے کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف وہ خدا ہوگا جس کو آپ اپنے تصور کے ذریعے چٹان پر چسپاں کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ خدا صرف آپ کی اپنی تخلیق ہوگا۔ وہ صرف آپ کا خیالی پیکر ہوگا۔ ایسا خدا آپ کے خواب کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسا خواب جو بار بار دیکھتے رہنے کی وجہ سے ایک خاکے میں ڈھل گیا ہے۔ خدا کو اس طرح دیکھنے میں کوئی مشکل نہیں مگر یہ تصورات کی دنیا میں رہنے کے مترادف ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

لیکن کسی روز اچانک ایسا ہوتا ہے کہ فرد غائب ہو جاتا ہے اور نتیجتاً وہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اس کو یہ نہیں محسوس ہوگا کہ خدا چٹان میں ہے بلکہ وہ سوچے گا کہ چٹان کہاں ہے؟ یہ صرف خدا ہے! جو فرق میرے پیشِ نظر ہے، کیا آپ وہ سمجھ پائے؟ پھر وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ خدا پودے میں یا پتھر میں موجود ہے...... اس لیے خدا کا وجود ہے...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ اسے محسوس ہوگا وہ یہ کہ پودا کہاں ہے؟ چٹان کہاں ہے؟ پہاڑ کہاں ہے؟ کیوں کہ ہر چار جانب جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، جو کچھ موجود ہے وہ خدا ہی خدا ہے۔ لہٰذا آپ کی مشق سے خدا کے دکھائی دینے کا کوئی تعلق نہیں، یہ آپ کے تجربے پر منحصر ہے۔

روحانیات کی مشق (سادھنا) کے سلسلے میں سب سے بڑا خطرہ تصورات کا ہوتا ہے۔ ہم حقائق کو تصورات کا روپ دے سکتے ہیں جو حقیقت میں ہمارا ذاتی تجربہ ہوگا۔ تصورات کی

تشکیل اور تجربے میں ایک فرق ہے۔ ایک شخص جس کا سارا دن فاقہ کشی میں گذرا وہ اگر رات کو خواب میں کچھ کھائے گا تو وہ خود کو سیر محسوس کرے گا۔ شاید وہ جاگنے کے دوران کھانے سے اتنا مطمئن نہیں ہوگا جتنا خواب کے دوران کھانے سے...... خواب میں وہ اپنی پسند سے جو چاہے کھا سکتا ہے۔ لیکن صبح کے وقت اس کا معدہ خالی ہی ہوگا۔ جو کچھ اس نے خواب کے دوران کھایا وہ اس کو کسی قسم کی توانائی فراہم نہیں کر سکا۔ یوں ہی کرتے کرتے آخر جلد یا بدیر وہ اپنی جان سے چلا جائے گا۔ خواب کے دوران اس نے خواہ کچھ بھی کھایا ہو' وہ درحقیقت کھانا نہیں تھا۔ وہ کسی طور بھی نہ تو خون میں شامل ہو سکتا ہے' نہ گوشت میں' نہ ہڈیوں میں اور نہ گودے میں۔ خواب تو آپ کو بس ایک فریب میں مبتلا کر سکتا ہے۔

یہ صرف کھانا ہی نہیں ہے جو خواب کے ذریعے تیار ہو سکتا ہے بلکہ اسی طرح خدا کو بھی اپنے خوابوں میں تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آزادی بھی خواب میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ خوابوں سے خاموشی بھی تیار کی جاتی ہے' اور خوابوں میں ہم کتنے ہی حقائق تیار کر سکتے ہیں۔ انسانی ذہن میں اپنے آپ کو دھوکا دینے کی لامحدود گنجائش ہے۔ لیکن اس نوع کے فریب میں پڑے رہنے سے کسی قسم کی مسرت یا آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے میں آپ کو ترغیب نہیں دے سکتا کہ آپ ہر چیز میں خدا کو ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ میں تو آپ کو صرف اپنے اندر جھانکنے اور یہ جاننے کے لیے آمادہ کر رہا ہوں کہ وہاں آپ کو کیا دریافت ہوتا ہے؟ جب آپ اپنے اندر جھانکنا شروع کریں گے تو سب سے پہلے وہاں سے آپ خود غائب ہو جائیں گے۔ آپ خود کو اپنے اندر نہیں پا سکیں گے۔ آپ کو پہلی بار یہ ادراک ہوگا کہ آپ کی انا محض ایک دھوکہ تھا' جو گم ہو چکی' اب موجود نہیں ہے۔ آپ جیسے ہی اندر دیکھیں گے تو آپ کی 'میں' آپ کی انا وہاں سے رخصت ہو جائے گی۔ آپ کی 'میں' اسی وقت تک آپ کے اوپر چھائی رہتی ہے جب تک آپ اپنے اندرون میں نظر نہیں ڈالتے۔ اور اس کی وجہ یہی خوف ہو سکتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اندر جھانکنے سے ہم خود گم ہو جائیں۔

شاید آپ نے بھی اس شخص کو دیکھا ہو جو ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل کو گھما گھما کر آگ کا ایک دائرہ بناتا رہتا ہے۔ حقیقت میں وہاں کوئی دائرہ نہیں ہوتا۔ جب مشعل کو تیزی سے گھمایا جاتا ہے تو دور سے دیکھنے والوں کو دائرے کا گمان ہوتا ہے۔ آپ اگر اس کو نزدیک سے دیکھیں گے تو

آپ خود کہہ اٹھیں گے کہ یہ تیزی سے گھومتی ہوئی مشعل ہے' آگ کا دائرہ صرف فریبِ نظر ہے۔ بعینہٖ جب ہم اپنے اندر جھانکیں اور ہوشیاری سے تجزیہ کریں تو جان لیں گے کہ 'میں' ایک فریب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جس طرح تیزی سے گھومتی ہوئی مشعل سے دائرے کا گمان ہوتا ہے اسی طرح تیزی سے حرکت کرتی ہوئی شعوری کیفیت ہمیں 'میں' کے فریب میں مبتلا کرتی ہے۔ یہ ایک سائنسی حقیقت ہے اور اس کو سمجھنا ضروری ہے۔

آپ نے شاید کبھی توجہ نہ دی ہو کہ زندگی میں پیش آنے والے تمام فریب تیزی سے گھومتی ہوئی اشیاء کی بدولت وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ دیواریں ہم کو ٹھوس وجود دکھائی دیتی ہیں' پیروں کے نیچے زمین ہم کو سخت محسوس ہوتی ہے' مگر سائنسدانوں کے مطابق چٹان جیسی سخت اور ٹھوس کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ یہ ایک معلومہ حقیقت ہے کہ جدید سائنس دانوں نے جتنا مادے کا مطالعہ کیا وہ اتنا ہی معدوم ہوتا چلا گیا۔ گو کہ سائنس دان مادے سے دور تھے لیکن اس میں یقین پھر بھی رکھتے تھے۔ یہ سائنسدان ہی تھے جو مادے کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے' اور اب یہی سائنسدان ہیں جو مادے کے وجود کے انکاری ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ توانائی کی تیز ترین حرکت پذیری حجم کا باعث ہوتی ہے۔ مگر یہ حجم بھی کہیں وجود نہیں رکھتا۔

بطور مثال بجلی سے چلنے والا چھت کا پنکھا اتنی تیزی سے گھومتا ہے کہ ہم اس کے گھومتے ہوئے پر دیکھ نہیں سکتے' حتیٰ کہ کوئی اس کے پر گن نہیں سکتا۔ اگر اس کو اور تیزی سے گھمایا جائے تو لگے گا کہ دھات کا کوئی گول ٹکڑا گھوم رہا ہے۔ اس کو اتنی تیز رفتاری کے ساتھ گھمایا جا سکتا ہے کہ اگر اس کی اوپری سطح پر آپ کو بٹھا دیا جائے تو آپ کو اس کی تین پنکھڑیوں کے درمیانی فاصلے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ آپ کو لگے گا کہ کہ آپ کسی ٹھوس دھات پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

مادے کے اجزاء بھی اسی تیز رفتاری کے ساتھ گھوم رہے ہیں......اور وہ اجزاء مادہ نہیں ہیں......وہ تیزی کے ساتھ گھومتی ہوئی برقیاتی توانائی ہے۔ مادہ ہم کو تیزی سے گھومتے ہوئے برقی حراروں کی وجہ سے ٹھوس شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ گو وہ ہم کو ٹھوس شکل میں دکھائی دیتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا وجود نہیں۔ بالکل اسی طرح ہماری شعوری توانائی نہایت تیز رفتاری سے حرکت پذیر ہے جس کی وجہ سے 'میں' کا فریب وجود میں آتا ہے۔

دنیا میں دو قسم کے فریب ہیں: پہلا مادے کا فریب دوسرا 'میں' کا یعنی انا کا فریب

دونوں ہی اپنی حقیقت میں محض دھوکہ ہیں اور نزدیکی مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا کہیں وجود نہیں۔ جیسے جیسے سائنس مادے کے نزدیک آ رہی ہے' مادے کا وجود تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح جب مذہب ہمارے نزدیک آتا ہے تو ہماری انا فنا ہو جاتی ہے۔ مذہب نے ہمیں بتایا ہے کہ ہماری 'میں' کا کہیں وجود نہیں ہے اور سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مادے کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ جتنا ہم ان کے نزدیک ہوتے جائیں گے اتنے ہی فریب میں مبتلا ہوں گے۔

اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اپنے اندر جھانکو۔ نزدیک سے دیکھو کہ اندر کہیں 'میں' موجود ہے؟ میں آپ کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں کہ آپ 'میں' نہیں ہیں۔ اگر آپ یہی سمجھتے ہیں تو اسکی حیثیت جھوٹے عقیدے میں بدل جائے گی۔ اگر آپ میری بات کا یقین کریں اور سوچیں کہ: "میں نہیں ہوں! ...... انا جھوٹی ہے! ...... میں روح ہوں! ...... میں برہمن ہوں! ...... انا جھوٹی ہے" آپ خود کو الجھن میں مبتلا کریں گے۔ اگر اس تکرار کو اپنا معمول بنا لیں گے تو یہ ایک فضول تکرار ہو گی۔ آپ کو اس قسم کی تکرار کے لیے میں ہرگز نہیں کہوں گا۔ اس کے برعکس میں کیا کہہ رہا ہوں؟ "اپنے اندر جھانکو' دیکھو اور پہچانو کہ آپ کون ہیں؟ اس طرح جو کوئی بھی اپنے اندر کا جائزہ لیگا اس پر واضح ہو جائے گا کہ "میں نہیں ہوں!" پھر اگر میں نہیں ہوں تو آخر اندر کون ہے؟ اگر میں اندر نہیں ہوں تو کوئی تو ضرور اندر ہے۔ میں نہیں ہوں کا مطلب بہر حال یہ نہیں ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ جس فریب میں ہم مبتلا ہیں اس کی شناخت کے لیے کسی نہ کسی کو تو اندر رہنا ہے۔

اگر میں نہیں ہوں تو وہاں کون ہے؟ وہاں 'اپنی' غیر موجودگی کا تجربہ خدا کی موجودگی کا تجربہ ہو گا۔ یہ تجربہ یکلخت لامحدود وسعت اختیار کر لے گا۔ اپنی فنا کے ساتھ 'تم' بھی ختم ہو جائے گا اور 'وہ' بھی فنا ہو جائے گا صرف آگہی کا لامحدود سمندر باقی رہ جائے گا۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ صرف اور صرف خدا ہے ...... خدا ہی خدا ہے۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کہنا بھی غلط ہو کہ 'خدا ہے' کیونکہ پھر ایسا کہنا غیر ضروری ہو گا۔

'خدا ہے' کہنا اس لیے غیر ضروری ہو گا کہ خدا کا ہی دوسرا نام ہے 'وہ جو ہے' ہونے کا ہی نام خدا ہے' لہٰذا یہ کہنا کہ خدا ہے محض الفاظ کا کھیل ہے؛ جو صحیح نہیں ہے۔ 'خدا ہے' کہنے کا کیا مطلب ہے؟ ہم کسی چیز کی شناخت 'ہے' سے کرتے ہیں جو کسی وقت بھی 'نہیں ہے' میں بدل سکتا

ہے۔ ہم کہتے ہیں 'میز ہے' کیونکہ یہ قطعی ممکن ہے کہ کل وہ موجود نہ ہو' اور یہ کہ گذشتہ کل موجود نہیں تھی۔ جو کچھ اس سے قبل موجود نہیں تھا وہ آنے والے کل ختم ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہنے میں کیا معنویت ہے کہ 'یہ ہے'؟ خدا وہ نہیں ہے جو پہلے نہیں تھا اور نہ وہ آئندہ معدوم ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ 'خدا ہے' بے معنی ہے۔ وہ ہے ...... حقیقتاً 'وہ جو ہے' خدا کا ہی دوسرا نام ہے۔ خدا بمعنی وجود۔

میرے خیال سے اگر ہم 'وہ جو ہے' کا اطلاق خدا پر کریں گے تو ہم اپنے آپ کو خود فریبی اور جھوٹ میں مبتلا کریں گے۔ یاد رکھیے کہ جو خدا ہم نے خود تخلیق کیے ہیں وہ دوسرے طریقے سے بنائے گئے ہیں' ہر ایک کی علیحدہ شناخت ہے۔ ہندو کا خدا علیحدہ ہے اور مسلمان کا علیحدہ۔ عیسائی' جینی' بدھ ...... سب کا اپنا خدا ہے۔ سب نے ان کے لیے علیحدہ علیحدہ نام تراشے ہوئے ہیں۔ سب نے اپنے لیے علیحدہ علیحدہ خدا بنائے ہوئے ہیں۔ ہر طرف خدا سازی کی ایک وسیع صنعت پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں اپنے لیے خدا بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے خدا خود تخلیق کرتے ہیں۔ پھر یہ خدا ساز لوگ اسی طرح آپس میں لڑتے ہیں جیسے گھروں میں دوسری اشیاء بنانے والے۔ ہر ایک کا خدا دوسرے سے مختلف ہے۔

درحقیقت جب تک 'میں ہوں' موجود ہے' میری بنائی ہوئی ہر چیز آپ کی ہر چیز سے مختلف ہو گی۔ جب تک 'میں ہوں' میرا مذہب' میرا خدا دوسرے تمام لوگوں سے الگ ہو گا کیونکہ وہ ان کی انا کی تخلیق ہو گا۔ جب تک ہم خود کو ایک علیحدہ وجود سمجھتے رہیں گے' اس وقت تک جو کچھ ہم تخلیق کریں گے اس کا اپنا علیحدہ کردار ہو گا۔ اگر مذاہب تخلیق کرنے کی آزادی ہوتی تو اس وقت دنیا میں اتنے ہی مذاہب ہوتے جتنے کہ انسان ہیں۔ مذاہب کی یہ کم تعداد اس بات کا نتیجہ ہے کہ آزادی کی صحیح سمت کا تعین نہیں ہو پایا ہے۔

ایک ہندو باپ اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے اپنے بیٹے کو ہندو بنانے پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ ایک مسلمان باپ اپنے بیٹے کے ہوشیار ہونے سے قبل مسلمان بنانا ضروری سمجھتا ہے کیونکہ ہوش سنبھالنے کے بعد نہ کوئی ہندو بننا پسند کریگا نہ مسلمان۔ لہٰذا بلوغت سے قبل بچوں کے دماغ میں یہ سب خرافات بھر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

ہر والدین اپنے بچوں کے دماغ میں مذہب کو راسخ کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ بچہ جیسے ہی ہوش سنبھالتا ہے' اپنے مختلف سوالات کے ذریعے ان کے لیے آزمائش پیدا کرتا ہے اور

قابلِ قبول جوابات نہیں پا کر وہ اپنے رویوں سے والدین کے لیے ابتدا سے ہی پیچیدہ صورت حال پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والدین اپنی اولاد کو بچپن سے ہی مذہب کے موضوع پر پختہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں...... یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ایک بچہ بہت سی باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت وہ ہر قسم کی خرافات سے پوری طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ اس طرح مسلمان، ہندو، جین، بدھ یا عیسائی آپ ان کو جو بنانا چاہیں، وہ بن جاتے ہیں۔

اس لیے، ایسے لوگ جن کو ہم مذہبی جانتے ہیں وہ اکثر کم عقل ہوتے ہیں۔ ان میں عقل کی کمی ہوتی ہے کیونکہ جس کو ہم مذہب کہتے ہیں وہ ہم کو اس وقت اپنے اثر میں لے لیتا ہے جب ہم شعور کی منزل تک بھی نہیں پہنچے ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم اسی کے زیر اثر رہتے ہیں اور اس سے چھٹکارا پانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ہندو اور مسلمان آپس میں خدا کے نام پر اپنی مسجدوں اور عبادت گاہوں کے لیے لڑتے رہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی کئی صورتیں ہیں؟ ہندو جس کی پوجا کرتے وہ دوسری قسم کا ہے اور مسلمان جس کی عبادت کرتے ہیں وہ کسی اور قسم کا؟ کیا یہ اسی کی وجہ ہے کہ ایک ہندو بت شکنی کو اپنے خدا کی بے عزتی پر محمول کرتا ہے؟ اور ایک مسلمان مسجد کو جلائے جانے یا منہدم کرنے کو اپنے خدا کی بے توقیری خیال کرتا ہے؟

فی الواقعہ 'وہ جو ہے' وہ خدا ہی ہے۔ مندر میں بھی وہی ہے جو مسجد میں ہے۔ وہ قتل گاہوں میں بھی اتنا ہی موجود ہے جتنا کسی معبد میں۔ خانقاہوں میں بھی وہی موجود ہے اور مساجد میں بھی۔ چور کے اندر بھی اس کا وجود ہے اور ایک رمق کے فرق کے بغیر درویش میں بھی۔ چور کے اندر اگر وہ خود نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ وہ تو راون میں بھی اتنا ہی موجود ہے جتنا رام کے اندر ہے۔ ہندو کیا اور مسلمان کیا سب میں وہی براجمان ہے۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم یہ عقیدہ اختیار کر لیں کہ وہی ایک ذات سب میں کارفرما ہے تو ہماری خدا سازی کی صنعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔ لہٰذا اس صورتحال سے بچنے کے لیے ہم اپنے اپنے خدا پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ جب ایک ہندو کسی پھول پر نظر ڈالے گا تو اس میں وہ اپنے خدا کو ہی دیکھے گا اور ایک مسلمان اس میں اپنے خدا کا جلوہ دیکھے گا۔ یہاں تک کہ اس مسئلے پر ہندو مسلم فساد بھی برپا ہو سکتا ہے۔

گوان کے مراکز ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع ہیں، مگر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی آفاقی دکانوں میں بھی ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً وارہ نسی اور مکہ تو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں، مگر وارہ نسی اور رام و کرشن کے عبادت خانوں کے مابین تو کوئی فاصلہ نہیں...... اس کے باوجود وہاں بھی اسی درجے کے فساد برپا ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے ایک بلند پایہ درویش کے بارے میں سنا ہے...... میں اس کو بلند پایہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لوگ اس کو بلند پایہ کہتے تھے، اور میں اس کو درویش بھی صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لوگ اس کو درویش کہتے تھے۔

وہ رام کا چیلہ تھا۔ ایک دفعہ اسے کرشن کے مندر میں لے جایا گیا۔ جب اس نے کرشن کے بت کو ہاتھ میں بنسی پکڑے دیکھا تو اس نے اس کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ گویا ہوا: تم اسی صورت میں میرے دیوتا ہو سکتے ہو اور میں تمھارے سامنے جھک سکتا ہوں جب تم ہاتھ میں تیر کمان پکڑے ہوئے ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ ہم دیوتاؤں پر بھی اپنی شرائط عائد کرتے ہیں کہ وہ خود کو کیسا اور کس حال میں پیش کریں۔ ہم اپنی ترتیب اور اپنی خواہشات کے مطابق اس کو دیکھیں گے تو اس کی پوجا کریں گے۔ ورنہ نہیں۔

یہ کتنا حیرت انگیز ہے کہ یہ بات ہم طے کریں کہ ہمارا خدا کیسا ہو۔ مگر ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے۔ ہم آج تک جس کو اپنا خدا کہتے آ رہے ہیں وہ خود ہمارے تصورات کا عکس ہے۔ جب تک یہ انسانوں کا تخلیق شدہ خدا ہمارے سامنے رہے گا اس وقت تک ہم اس خدا کو شناخت نہیں کر سکیں گے جو ہم نے نہیں گھڑا۔ ہم اس کو ہرگز نہیں پہچان پائیں گے جس نے ہم کو گھڑا ہے۔ اگر ہمیں اس خدا کو جاننے کی خواہش ہے جو حقیقت میں خدا ہے تو ہمیں چاہئے کہ انسان کے بنائے ہوئے ان خداؤں سے نجات حاصل کریں۔ مگر یہ ایک مشکل کام ہے، یہاں تک کہ ایک نرم دل اور نیک خو انسان کے لیے بھی ایسا کرنا آسان نہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے ان خداؤں سے وہ لوگ بھی نجات پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جن کو ہم عقل مند کہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اپنے بنیادی عقائد پر اسی سختی سے جمے ہوئے پائے جائیں گے جس پر احمق اور بے عقل لوگ جمے رہتے ہیں۔ ایک بے وقوف آدمی کو تو معاف کیا جا سکتا ہے مگر صاحبانِ عقل و خرد کو نہیں۔

جب خان عبدالغفار خان ہندوستان آئے تو پورے ملک میں انھوں نے ہندو مسلم

اتحاد کا پرچار کیا۔ مگر وہ خود ایک کٹر مسلمان تھے' جو کہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اس بات سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا کہ جب وہ خود ایک سچے مسلمان تھے تو ہندو مسلم اتحاد کا پرچار ان کو کیسے زیب دیتا تھا۔ جب کہ گرو جی ایک کٹر ہندو اور خان صاحب ایک کٹر مسلمان تھے۔ جب تک دنیا میں مسلمہ ہندو اور مسلمہ مسلمان موجود ہیں یہ اتحاد کیسے عمل میں آ سکتا ہے؟ اگر وہ کچھ دیر کے لیے غیر جانبداری اختیار کر سکیں تو ممکن ہے یہ اتحاد قائم ہو جائے۔ اپنا اپنا نکتۂ نظر مسلط کرنے کی خواہش رکھنے والے یہ ہندو اور مسلمان ہی دونوں مذاہب کے مابین تصادم جاری رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ جبکہ باطن میں ایسی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ وہ لوگ جو ہندو مسلم اتحاد کی بات کرتے ہیں ان کو رتی بھر ادراک نہیں ہے کہ یہ کس طریقے سے ممکن ہو سکتا ہے۔

جب تک مختلف لوگوں کے خدا مختلف رہیں گے...... جب تک مختلف لوگوں کی عبادت گاہیں مختلف رہیں گی ...... جب تک لوگوں کی دعائیں اور اشلوک مختلف رہیں گے ...... جب تک کچھ کے نزدیک قرآن مقدس ہوگا اور کچھ کے نزدیک گیتا پوتر ہوگی' مذاہب کے مابین اس خطرناک وبا کا خاتمہ ممکن نہیں۔ ہم قرآن اور گیتا سے چمٹے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: قرآن پڑھو اور لوگوں کو تبلیغ کرو کہ دشمنی چھوڑ کر سب ایک ہو جاؤ۔ ہم گیتا پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپس کی دشمنی چھوڑ کر سب ایک ہو جاؤ...... ہم یہ نہیں سمجھتے کہ قرآن اور گیتا کے یہی الفاظ سارے فساد کی جڑ ہیں۔

اگر ایک گائے کی دم کاٹ دی جائے تو ہندو مسلم فساد شروع ہو جاتا ہے۔ اور ہم شر پسندوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ کسی فسادی نے کبھی اس بات کا پرچار نہیں کیا کہ گائے ہماری مقدس ماں ہے۔ یہ ہمارے پیشواؤں اور پنڈتوں کا کیا دھرا ہے جو ان فسادات کا الزام شر پسندوں پر رکھ دیتے ہیں۔ کیونکہ جب کسی گائے کی دم کاٹی جاتی ہے تو وہ دم ان کے مطلب کی نہیں ہوتی' بلکہ یہ ان کی مقدس ماں کی دم ہوتی ہے۔ جب وہ اس بات کو عوام کے علم میں لاتے ہیں تب فساد شروع ہو جاتے ہیں جس میں شر پسند اور فسادی لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور فساد شروع کرنے کا الزام انھی کے اوپر عائد کر دیا جاتا ہے۔

لہٰذا جن کو ہم مہاتما کہتے ہیں درحقیقت ان مسائل کی تہہ میں وہی ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف ہو جائیں تو فسادی بے ضرر ہو جائیں' ان کے پاس لڑنے کے لیے طاقت نہیں رہے

گی۔ ان کی قوت کا سرچشمہ یہی مہاتما ہیں۔ مگر یہ لوگ بڑی خوبصورتی سے زیر زمین چھپے رہتے ہیں کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ لوگ ان شرمناک واقعات کے ذمہ دار ہیں۔

اس مسئلے کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار آپ کا خدا ہے...... وہ خدا جو آپ کے گھروں میں تخلیق کیا گیا۔ اپنے گھروں میں تیار کیے گئے ان خداؤں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرو۔ آپ اپنے گھر میں خدا تخلیق نہیں کر سکتے ...... ایسے خدا کا وجود صرف اور صرف خود فریبی کا موجب ہوگا۔ میں آپ کو خدا کا نقشہ بنانے کے لیے نہیں کہتا...... لیکن آخر خدا کے نام پر آپ کیا بنائیں گے؟ کرشن کا پجاری کہے گا کہ میں خدا کو جھاڑی میں چھپے اور ہاتھ میں بانسری لیے دیکھ رہا ہوں جبکہ رام کا پجاری اس کو ہاتھ میں تیر کمان لیے دیکھ رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے خدا کو مختلف روپ میں دیکھے گا۔ اس نوعیت کے نظارے اپنی خواہشات اور خاکوں پر مبنی منظر نامے کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ خدا ایسا نہیں ہے۔ ہم اس کو اپنی خواہشات اور خاکوں کی روشنی میں نہیں پا سکتے۔ اس کو پانے کے لیے ہمیں اپنے آپ کو گم کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی تمام خواہشات اور خاکوں کے ساتھ گم ہونا پڑے گا...... دونوں باتیں ایک ساتھ ممکن نہیں۔ جب تک آپ اپنی انا میں زندہ ہیں اس وقت تک خدا کا تجربہ ممکن نہیں۔ انا کے خول سے باہر آ کر ہی وہ آپ کے تجربے میں آ سکے گا۔ میں اس وقت تک آفاقیت کے دروازے میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک میری 'میں' میری انا' موجود ہے۔

میں نے ایک کہانی سنی ہے کہ ایک شخص نے سب کچھ ترک کر دیا اور اس کے در پر جا کھڑا ہوا۔ وہ دولت' بیوی بچے' گھر بار' معاشرہ' سماج سب کچھ تیاگ کر اس کے دروازے پر گیا تھا۔ حاجب نے اس کو روک دیا اور کہا کہ وہ دروازے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ پہلے جائے اور ہر چیز تیاگ کر آئے۔

اس شخص نے اصرار کیا کہ وہ ہر چیز ترک کر کے آیا ہے۔

جواب ملا: کہ تم واضح طور پر اپنی اَنا کو ساتھ لے کر آئے ہو! یہاں کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہاں صرف تمھاری 'میں' اہم ہے۔ یہاں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ تم کیا کیا چھوڑ کر آ رہے ہو! یہاں صرف تمھاری اَنا پیشِ نظر ہے؛ جاؤ! اس سے نجات پا کر دوبارہ آنا۔

اس شخص نے پھر کہا: میرے پاس کچھ نہیں ہے...... میرا تھیلا خالی ہے...... اس میں نہ

بیوی بچے ہیں، نہ مال و دولت ہے، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

حاجب نے کہا: تمھاری اَنا ابھی تک تمھارے تھیلے میں ہے...... جاؤ اس کو پھینک کر آؤ۔ یہاں کے دروازے ان کے لیے بند ہیں جو اپنی اَنا کو ساتھ لاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہاں کے دروازے ہمیشہ سے بند ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم اپنی 'میں' سے کیسے پیچھا چھڑائیں؟ ہماری کوششوں سے 'میں' سے نجات پانا ممکن نہیں۔ میں اپنی اصل 'میں' سے کیسے نجات پاؤں۔ یہ ناممکن ہے۔ یہ تقریباً ایسی کوشش ہوگی جیسے کوئی اپنے آپ کو اپنے جوتوں کے تسموں کے ذریعے اٹھانا چاہے۔ آخر میں کیسے اپنی 'میں' کو پھینک دوں؟ یہاں تک کہ اپنی ہر چیز ترک کر دینے کے باوجود میری 'میں' موجود رہے گی۔ یہاں تک کہ جب کوئی یہ کہہ دیگا کہ اس نے اپنی انا کو مار ڈالا...... اس کے باوجود اس کی 'میں' اس کے ساتھ ہوگی۔ اپنی اَنا سے پیچھا چھڑا کر ایک شخص خود غرض ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر ایک انسان کو آخر کیا کرنا چاہیئے؟ یہ ایک بہت پیچیدہ صورت حال ہے۔

لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ کیونکہ میں آپ کو کوئی چیز ترک کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ بلکہ میں تو آپ کو کچھ بھی کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ مذکورہ تمام عمل کرنے سے تو 'میں' اور اَنا مزید مضبوط ہو جاتی ہیں۔ میں تو آپ سے صرف یہ کہتا ہوں کہ اپنے اندر جھانکیے اور اپنی اَنا کو تلاش کیجیے۔ اگر آپ اس کو پا لیتے ہیں تو اس سے نجات کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر وہ ہمیشہ سے وہاں موجود ہے تو پھر اس سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟ اور اگر وہ آپ کو نہیں ملتی تو پھر بھی اس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ آپ اس چیز سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں جو موجود ہی نہیں۔

لہٰذا اپنے اندر جائیں اور دیکھیں کہ 'میں' وہاں موجود ہے یا نہیں۔ میں وثوق سے یہ کہہ رہا ہوں کہ جو کوئی اپنے اندر جا کر اپنی 'میں' کو تلاش کرے گا وہ بے ساختہ قہقہہ لگا اٹھے گا کہ وہاں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہوگی۔ پھر کیا ملے گا؟ وہاں جو کچھ ہوگا وہی خدا ہے۔ وہ جس کی موجودگی اَنا کے تحلیل ہونے پر موقوف ہے۔ کیا وہ کبھی آپ سے جدا ہو سکتا ہے؟ جب آپ کی اَنا ہی موقوف ہو جائے گی تو آپ کو اس سے کون جدا کریگا۔ یہ صرف ہماری 'میں' ہے جو مجھ کو آپ سے اور آپ کو مجھ سے جدا کرتی ہے۔

گھر کی دیوار کو دیکھئے، اس کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ خلا کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے حالانکہ خلا کو کبھی دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا وہ ناقابلِ تقسیم ہے۔ آپ خواہ کتنی ہی موٹی دیوار بنا لیں، گھر کے اندر کا خلا اور گھر سے باہر کا خلا ایک ہی ہے۔ آپ دیوار کو جتنا چاہیں اونچا لے جائیں لیکن گھر کے اندر اور باہر کا خلا ایک ہی رہے گا وہ تقسیم نہیں ہو سکتا۔ گھر میں رہنے والا شخص بیشک یہ سمجھتا رہے کہ اس نے خلا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک خلا گھر کے اندر اور دوسرا گھر سے باہر۔ لیکن اگر دیوار گر جائے تو وہ گھر کے اندر کے خلا اور گھر سے باہر کے خلا کے مابین کیسے تفریق کرے گا؟ وہ کیسے تخمینہ لگائے گا؟ پھر تو بس خلا ہی رہ جائے گا۔

بالکل اسی طرح ہم نے شعور کو اپنی 'میں' کی دیواروں کے ذریعے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ جب انا کی یہ دیوار گرا دی جائے گی تو یہ نہیں ہوگا کہ آپ خدا کو دیکھنا شروع کر دیں گے۔ نہیں۔ پھر وہ 'میں' آپ کو نہیں بلکہ خدا کو دیکھ رہی ہوگی۔ اس پیچیدہ فرق کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ میں آپ کے اندر خدا کو دیکھنا شروع کر دوں گا۔ بلکہ میں آپ کو تو اس کے بعد دیکھ ہی نہیں سکوں گا میں تو صرف خدا کو دیکھ رہا ہوں گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ میں درخت میں خدا کو دیکھ رہا ہوں گا۔ بلکہ درخت میری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا اور میں صرف خدا کو دیکھ رہا ہوں گا۔ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ خدا کائنات کے ہر ذرے میں ہے تو وہ صریحاً غلطی میں مبتلا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ ذرے اور خدا دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ دونوں کو اکٹھا دیکھا ہی نہیں جا سکتا مادے کی حقیقت یہ ہے کہ ہر ذرہ خدا ہے...... یہ نہیں کہ ہر ذرے میں خدا موجود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر ذرے کے اندر کوئی خدا براجمان ہے...... جو کچھ بھی ہے...... وہ صرف خدا ہے۔

خدا ایک پیار کا نام ہے جو اسکو دیا ہوا ہے 'جو ہے'...... 'وہ جو ہے' وہ سچ ہے اور اسی کو ہم پیار سے خدا کہتے ہیں۔ اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم اس کو کس نام سے پکارتے ہیں اس لیے میں آپ سے نہیں چاہتا کہ آپ ہر ایک میں خدا کو دیکھنا شروع کر دیں؛ میں کہہ رہا ہوں: اپنے اندر دیکھنا شروع کریں۔ آپ جیسے ہی اندر دیکھنا شروع کریں گے تو آپ خود غائب ہو جائیں گے اور آپکے غیاب کے ساتھ ہی جو کچھ آپ دیکھیں گے وہ خدا ہوگا۔

ایک اور دوست نے استفسار کیا ہے:

"اگر ارتکازِ توجہ کے ذریعے سمادھی اور سمادھی کے ذریعے خدا تک پہنچا جا سکتا ہے تو پھر

عبادت گاہوں کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ کیا ہم انہیں ختم نہ کردیں؟"

عبادت گاہوں میں جانا بھی بے مقصد ہے اور ان کو ختم کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں جس جگہ خدا موجود ہی نہیں اس جگہ کو ختم کرنے کی تکلیف کیوں کی جائے؟ عبادت گاہوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ان سے نجات حاصل کرنے کا کیا جواز ہے؟ مگر یہ مسئلہ بار بار سامنے آتا رہتا ہے۔

مثلاً محمد ﷺ نے کہا کہ خدا بتوں میں نہیں پایا جاسکتا' اس لیے مسلمانوں نے سوچا کہ بتوں کو تباہ کردینا چاہئے۔اور اس کے بعد دنیا میں ایک انوکھے واقعے نے جنم لینا شروع کردیا۔ بت بنانے والا ایک طبقہ تو پہلے ہی موجود تھا' پھر بت شکنوں کا ایک طبقہ بھی وجود میں آ گیا۔اب بت بنانے والے اپنی پوری مہارت کے ساتھ بت بنانے میں مصروف ہیں اور بت شکن دن رات بتوں کو تباہ کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔کوئی یہ تو بتائے کہ محمد ﷺ نے کب یہ کہا کہ بتوں کو توڑنے سے خدا مل جائے گا۔بیشک خدا بتوں میں موجود نہیں ہے......نہ سہی' مگر یہ کس نے کہا کہ بتوں کو توڑنا خدا کے حصول کا موجب ہوگا۔اور اگر بتوں کو توڑنے میں خدا پوشیدہ ہے تو خدا کو کیا مسئلہ درپیش ہے کہ وہ بتوں میں رہتا ہے؟ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ بتوں میں موجود ہو؛ لیکن اگر وہ بتوں میں موجود نہیں ہے تو وہ اس کے تباہ ہونے پر کیسے موجود ہوگا؟

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ عبادت گاہوں کو ختم کردیا جائے۔میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی موجودگی کو ہر جگہ تسلیم کیا جائے۔اگر ایک بار اس سچ کو تسلیم کرلیا جائے تو زمین پر موجود ہر جگہ عبادت گاہ میں تبدیل ہوجائے۔پھر کسی دو جگہ کے مابین یہ فرق نہیں رہے گا کہ ایک جگہ عبادت گاہ ہے اور دوسری جگہ عبادت گاہ نہیں ہے۔پھر ہم جہاں بھی ہوں گے وہیں عبادت گاہ ہوگی۔ہم جس چیز پر بھی نگاہ ڈالیں گے وہ عبادت گاہ ہوجائے گی۔جہاں بیٹھیں گے وہ جگہ عبادت گاہ ہوجائے گی۔پھر زیارت کے مقدس مقامات کی تفریق بھی مٹ جائے گی۔پوری دنیا ایک متبرک مقام میں بدل جائے گی۔پھر الگ الگ بت تیار کرنا بے معنی ہوجائے گا۔اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا اسی کا عکس ہوگا۔

میں ہرگز اس بات کی وکالت نہیں کررہا ہوں کہ آپ عبادت گاہوں کو ختم کرنے میں مصروف ہوجائیں۔یہ میں نے کبھی نہیں کہا کہ عبادت گاہوں میں خدا موجود نہیں ہے۔میں صرف

یہ کہہ رہا ہوں کہ جس کو عبادت گاہ کے علاوہ خدا کہیں دکھائی نہیں دیتا اس کو خدا کے بارے میں کوئی علم ہی نہیں ہے۔

جس نے بھی خدا کے وجود کا اقرار کرلیا اس کو خدا ہر جگہ موجود ملے گا۔عبادت گاہ میں بھی اور وہاں بھی جہاں عبادت گاہ نہیں ہے۔پھر اس کے لیے یہ تفریق کرنا مشکل ہوجائے گا کہ کونسی جگہ عبادت گاہ ہے اور کونسی عبادت گاہ نہیں ہے۔ہم خدا کی موجودگی کی وجہ سے عبادت گاہ کو پہچانتے ہیں اور اگر کوئی اس کو ہر جگہ موجود سمجھتا ہو تو اس کے لیے ہر جگہ عبادت گاہ ہے۔اس کے بعد عبادت گاہ بنانے یا عبادت گاہ ختم کرنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

میں نے دیکھا ہے کہ اکثر لوگ میری بات کو اسی تناظر میں سمجھنے کے بجائے جس میں میں نے کوئی بات کہی ہو' اس کے برعکس معنی نکالتے ہیں۔عموماً لوگ اس بات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ انہیں کیا توڑ پھوڑ کرنی ہے......کس کو تباہ کرنا ہے......کس کو ختم کرنا ہے؟ وہ صحیح بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔یہ صورت طویل عرصے سے جاری ہے۔

انسان ہمیشہ سے ایک مہیب غلطی کرتا آرہا ہے کہ جو کچھ اس کو کہا جاتا ہے وہ اس کا الٹ مطلب لیتا ہے۔اس وقت بھی آپ میں سے کچھ لوگ مجھے عبادت گاہوں کا دشمن سمجھنے لگیں گے' مگر عبادت گاہوں سے مجھ سے زیادہ محبت کرنے والا آپ کو شاید ہی ملے۔میں نے اس کا ذکر کیوں کیا؟ اس کی ایک سادہ سی وجہ یہ ہے کہ میں تو چاہتا ہوں کہ ساری دھرتی عبادت گاہ میں بدل جائے۔میرا زور تو اس بات پر ہے کہ تمام دنیا عبادت گاہ دکھائی دینے لگے۔مگر میری بات سننے کے بعد یہ نتیجہ بھی نکال لیا جائے گا کہ عبادت گاہوں کا وجود ختم کرنے سے حالات بہتر ہوجائیں گے۔ان عبادت گاہوں سے چھٹکارا پانے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔معاملات تب ہی صحیح ہوسکتے ہیں جب پوری دنیا عبادت گاہ میں ڈھل جائے۔

وہ جو خدا کو عبادت گاہ میں دیکھتے ہیں اور وہ جو عبادت گاہوں کو مسمار کرتے ہیں' دونوں غلطی پر ہیں۔اور وہ جو خدا کو صرف عبادت گاہ میں دیکھتا ہے وہ بھی غلطی پر ہے۔اس کی غلطی یہ ہے کہ: عبادت گاہ سے باہر وہ کس کو دیکھتا ہے؟ صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ عبادت گاہ کے علاوہ خدا کو کہیں نہیں دیکھتا۔آپ کی عبادت گاہ بہت تنگ ہے اور وہ لامحدود؛ وہ آپ کی عبادت گاہ کی محدود فضا میں نہیں سما سکتا۔اور دوسرے کی غلطی یہ ہے کہ وہ عبادت گاہوں کا خاتمہ چاہتا ہے۔کیونکہ وہ

سمجھتا ہے کہ عبادت گاہوں کے اختتام کے بعد ہی وہ خدا کا درشن کرسکتا ہے۔آپ کی عبادت گاہیں اس کے رہنے کے لیے بھی نہایت چھوٹی ہیں اور اس کو دوسروں سے بچانے کی غرض سے بھی۔یاد رکھیے کہ آپ کے عبادت خانے مضحکہ خیز حد تک اتنے چھوٹے ہیں کہ ان میں خدا کی رہائش کا تصور بھی ممکن نہیں، اور وہ خدا کو قید کرنے کے لیے بھی ناکافی ہیں۔اور جب ان کو ڈھا دیا جائے تو ممکنہ طور پر وہ آزاد ہو جائے گا۔

آپ میری گفتگو کا ماحصل سمجھنے کی کوشش کریں۔میرا کہنا یہ ہے کہ دھیان میں غرق ہونے کے دوران آپ کبھی عبادت گاہ میں گئے ہیں؟ دھیان وہ عبادت گاہ ہے جس کے در و دیوار نہیں ہیں۔دھیان ہی وہ عبادت گاہ ہے جس میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ حقیقتاً عبادت گاہ میں داخل ہوگئے۔اور ایک بار جو اس عبادت گاہ میں داخل ہو جائے وہ ایسا ہے گویا وہ چوبیس گھنٹے عبادت گاہ میں ہی رہتا ہے۔

ایک شخص عبادت گاہ جاتا ہے اگر وہ دھیان میں غرق نہیں رہتا تو اس کے ذہن میں کیا ہوتا ہے؟ ایسی جگہ جانے میں کیا نکتہ ہے جس کو عموماً ہم عبادت گاہ کے نام سے پہچانتے ہیں؟ اپنی دوکان میں بیٹھے بٹھائے اچانک عبادت گاہ کی طرف چلے جانا آسان نہیں۔اپنے جسم کو عبادت گاہ لے جانا بیشک آسان ہے۔آپ کا جسم ایک غریب اور کمزور وجود ہے جس کو آپ جہاں لے جانا چاہیں لے کر جاسکتے ہیں۔مگر آپ کا ذہن اس کی طرح نہیں ہے۔ایک دوکاندار اگر چاہے تو رقم گنتے گنتے اچانک اٹھ کر اپنے جسم کو لے کر عبادت گاہ کی طرف جاسکتا ہے۔چونکہ اس کا جسم عبادت گاہ میں آگیا ہے اس لیے وہ بیوقوف یہ باور کرسکتا ہے کہ وہ عبادت گاہ میں ہے۔لیکن اس نے اگر ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذہن میں جھانک کر دیکھا ہوگا تو اس کے تعجب کی انتہا نہیں رہی ہوگی جب وہ دیکھے گا کہ وہ بدستور دکان کے اندر رقم گننے میں مصروف ہے۔

میں نے سنا ہے کہ:

ایک شخص اپنی بیوی کے ہاتھوں سخت پریشان تھا......سب ہی لوگ ہوتے ہیں......مگر وہ کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔وہ ایک مذہبی آدمی تھا جبکہ اس کی بیوی اس کے بالکل برعکس تھی۔عموماً بالکل برعکس صورت حال درپیش ہوا کرتی ہے...... بیوی عموماً مذہبی رجحانات کی حامل اور شوہر آزاد خیال ہوا کرتے ہیں......اور اس صورت میں کچھ بھی ممکن ہوتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ دونوں میں

سے کوئی ایک فریق ہی مذہب کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔میاں بیوی دونوں کبھی بھی اس سلسلے میں ہم خیال نہیں ہوتے۔دونوں میں سے کوئی ایک ضرور دوسرے کا مخالف ہوگا۔پیشِ نظر معاملے میں شوہر پہلے سے مذہبی واقع ہوا تھا اور بیوی کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی، لیکن اس کا شوہر اس کو مذہب کی طرف لانے کے لیے روزانہ اس کو وعظ و تبلیغ کرتا رہتا تھا۔

مذہبی آدمی کے اندر ایک بنیادی کمزوری ہوتی ہے۔وہ دوسروں کو اپنے جیسا بنانا چاہتا ہے۔یہ ایک بیحد خطرناک رجحان اور جارحانہ طرزِ عمل ہے۔کسی کو اپنے جیسا بنانے کی کوشش کرنا نری بیہودگی ہے۔دوسروں کو اپنا نکتۂ نظر بتا دینا ہی کافی ہوتا ہے، لیکن کسی کو پکڑ کر بزور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرنا روحانی جارحیت اور تشدد کے زمرے میں آتا ہے۔

سب ہی گرو اس قسم کی کارروائی میں ملوث ہوتے ہیں۔آپ نے مشکل سے ہی کہیں اتنا جارح دیکھا ہوگا جتنا کہ ایک گرو ہوتا ہے۔اپنے چیلوں کی گردن ہاتھ میں لے کر ان کو حکم دیتا ہے کہ ان کو کیسے کپڑے پہننے ہیں...... بال کیسے رکھنے ہیں ......کیا کھانا ہے ......کیا پینا ہے...... کب سونا ہے......کب جاگنا ہے، یہ......وہ......اور اس پر ہر قسم کی پابندی عائد کر کے وہ لوگوں کو قتل نہیں کرتے تو کیا کرتے ہیں؟

لہٰذا وہ شوہر اپنی بیوی کو مذہب کی طرف لانے کے لیے بے چین رہا کرتا تھا۔مذہبی لوگ دوسروں کو مذہب کی طرف لانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔جب کہ مذہبی ہو جانا ایک بڑا انقلاب ہوتا ہے، پر لوگ دوسروں کو مذہب کی طرف گھسیٹ لانے میں بیحد اطمینان محسوس کرتے ہیں۔کیونکہ ایسا کرنے سے پہلے وہ خود کو مذہب پر عمل پیرا خیال کرتے ہیں۔مگر وہ بیوی اپنے شوہر کی کوئی بات نہیں مانتی تھی۔مایوس ہو کر وہ شخص اپنے گرو کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے گھر آ کر اپنی بیوی کو سمجھانے کی درخواست کی۔

پھر ایک روز صبح پانچ بجے کے قریب گرو جی اس کے گھر پدھارے۔شوہر پہلے سے پوجا کے کمرے میں تھا۔اس کی بیوی صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔گرو جی نے اس کو وہیں روک دیا اور کہا: میں نے تمھارے شوہر سے سنا ہے کہ تم کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے......تم کبھی پوجا نہیں کرتی ہو......کبھی دعا نہیں مانگتی ہو......تم گھر میں اپنے شوہر کے بنائی ہوئی عبادت گاہ میں کبھی نہیں جھانکتی ہو۔ذرا اپنے شوہر کو دیکھو کہ ابھی پانچ ہی بجے ہیں اور وہ پوجا میں مصروف ہے۔

بیوی نے جواب دیا کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کبھی عبادت گاہ میں گیا ہو۔

عبادت گاہ میں بیٹھے ہوئے شوہر نے اپنی بیوی کا یہ جواب سنا تو غصے سے سرخ ہو گیا ایک مذہبی آدمی بہت آسانی سے غصے میں آجاتا ہے۔اور جب وہ عبادت گاہ میں بیٹھا ہوا ہو تو اور بھی زیادہ۔آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان کے غصے کی آگ پر تیل ڈالنا کتنا آسان ہو جاتا ہے خدا کو معلوم کہ وہ اپنے غصے کے شعلوں کو چھپانے کے لیے عبادت گاہ میں جاتے ہیں یا کسی اور وجہ سے۔اگر کسی وجہ سے گھر کا ایک فرد مذہب کی چادر اوڑھ لیتا ہے تو دوسروں کی زندگی عملاً عذاب کر دیتا ہے۔

شوہر مکمل آپے سے باہر ہو گیا۔پوجا کے دوران اس نے اپنی بیوی کے الفاظ سنے تو اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔جو کچھ وہ کہہ رہی تھی نری بکواس تھی۔وہ یہاں اپنی عبادت گاہ میں بیٹھا ہوا ہے اور وہ اس کے گرو کو بتا رہی ہے کہ اس نے کبھی اسے عبادت گاہ جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔اس نے عجلت میں اپنی پوجا ختم کی تاکہ جلد باہر جا کر اس کے جھوٹ کا توڑ کر سکے۔

گرو نے اس کی بیوی کو تلقین شروع کر دی۔" تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمھارا شوہر بلا ناغہ عبادت گاہ جاتا ہے" یہ باتیں سن کر اس کے شوہر نے اور تیز آواز میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔اور گرو نے کہا" دیکھو وہ دعاؤں میں کتنی محنت کر رہا ہے۔"

بیوی نے ہنستے ہوئے کہا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس کی دعاؤں کے دھوکے میں آسکتے ہو۔مجھے معلوم ہے کہ وہ بلند آواز سے خدا کا نام لے کر فریب دے رہا ہے۔جہاں تک میں دیکھ سکتی ہوں وہ یہ ہے کہ وہ عبادت گاہ میں نہیں بلکہ جوتے والے کے یہاں جوتے کی قیمت پر تکرار کر رہا ہے۔

اب حد ہو چکی تھی۔اس سے زیادہ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔اس نے پوجا کو وہیں چھوڑا اور دوڑتا ہوا عبادت گاہ سے باہر نکل آیا۔اور چلایا کہ یہ سب کیا بکواس ہے؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں عبادت گاہ کے اندر پوجا میں مصروف تھا"؟

بیوی نے کہا کہ اپنے اندر ذرا دھیان سے دیکھو! کیا تم درحقیقت پوجا میں مصروف تھے؟ کیا تم جوتے والے سے جوتے کی قیمت پر مول تول نہیں کر رہے تھے؟ اور کیا تمھارا اس سے جھگڑا نہیں ہوا؟ یہ بات سن کر شوہر ڈھیلا پڑ گیا کیونکہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ سچ تھا۔

" مگر تم کو کیسے معلوم ہوا"؟ اس نے پوچھا۔

" گذشتہ رات سونے سے پہلے تم نے کہا تھا کہ صبح جو سب سے پہلا کام کروں گا وہ یہ کہ ایک جوتا خریدوں گا، جس کی بہت ضرورت محسوس ہو رہی ہے، تم نے یہ بھی کہا تھا کہ جوتے والا زیادہ پیسے مانگ رہا ہے، میرا تجربہ ہے کہ سونے سے پہلے کا آخری ارادہ صبح اٹھ کر سب سے مقدم ہوتا ہے، اس لیے یہ میرا اندازہ تھا کہ تمھارا خیال ضرور اسی میں الجھا ہوا ہوگا" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

شوہر بولا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا، اس لیے کہ جو کچھ تم نے کہا وہ بالکل صحیح ہے، میں یقیناً جوتے کی دوکان میں تھا اور ہمارے مابین قیمت پر تکرار ہو رہی تھی۔اور گفتار میں جتنی تیزی آرہی تھی میں اتنا ہی زور زور سے خدا کے نام پکار رہا تھے۔میں دکھاوے کے لیے ضرور خدا کا نام لے رہا تھا مگر اصل میں جوتے والے سے تکرار کر رہا تھا۔تم نے صحیح کہا، شاید میں کبھی عبادت گاہ میں نہیں گیا۔

عبادت گاہ میں چلے جانا بہت آسان نہیں ہے...... یہ ایسا نہیں ہے کہ آپ کہیں بھی چلے جائیں اور کہہ دیں کہ آپ عبادت گاہ میں ہیں۔آپ کا جسم تو ضرور عبادت گاہ میں ہوگا...... لیکن آپ کا ذہن؟ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اگلے لمحے آپ کا دھیان کہاں ہوگا؟ اور اگر آپ کا ذہن ایک بار عبادت گاہ میں آگیا تو اس بات کی کیا فکر کہ آپ کا جسم بھی عبادت گاہ میں ہے یا نہیں؟ ذہن جب ایک بار عبادت گاہ میں داخل ہو جائے گا تو چاروں طرف سے خود کو ایک بہت وسیع و عریض عبادت گاہ میں گھرا ہوا پائے گا، جہاں سے نکل جانا ممکن نہیں ہوگا۔آپ جدھر بھی نظر دوڑائیں گے، خود کو عبادت گاہ میں ہی پائیں گے۔آپ اگر چاند پر بھی چلے جائیں...... حال ہی میں آرم اسٹرانگ نے وہاں قدم رکھا ہے...... کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے خدا کا دربار چھوڑ دیا ہے؟ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آپ خدا کے عبادت خانے سے باہر نکل سکیں۔کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسی جگہ موجود ہے جو اس کی عبادت گاہ سے باہر ہو؟

اس لیے جو لوگ اپنے بنائے ہوئے عبادت خانے کو ہی خدا کی واحد عبادت گاہ سمجھتے ہیں، اور یہ کہ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور عبادت گاہ ہے ہی نہیں...... وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔اور وہ جو یہ سوچتے ہیں کہ اس عبادت گاہ میں چونکہ خدا موجود نہیں ہے اس لیے اس کو مسمار کر دینا

چاہئے......وہ بھی اسی درجے کی گمراہی میں ہیں۔

بھلا اس میں غریب عبادت گاہ کا کیا قصور؟ اگر ہم اپنے اس وہم سے باہر آ جائیں کہ خدا صرف عبادت گاہ میں موجود ہے تو ہمارے عبادت خانے ایک خوبصورت اور باعثِ مسرت جگہ میں بدل جائیں۔ یہ تو ہے کہ ایک گاؤں عبادت گاہ کے بغیر نامکمل لگتا ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہو کہ جب وہاں بھی ایک عبادت گاہ ہو۔ مگر ایک ہندو عبادت گاہ کبھی یہ کمی پوری نہیں کرسکتا' نہ مسلمان کی مسجد اور نہ عیسائی کا گرجا۔ صرف اور صرف حقیقی خدا کا عبادتخانہ ہی خوشی کا باعث ہوسکتا ہے۔

مگر افسوس کہ ہندو' مسلم اور عیسائی سیاست اتنی گہری ہے کہ وہ کسی دوسرے کے عبادت خانے کو خانۂ خدا کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو کی عبادت گاہ اور مسلمان کی مسجد ارضِ خدا پر ناخوشگوار منظر پیش کرتے ہیں۔ ایک سچا انسان ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ شر پسند عناصر کی جائے پیدائش میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ہر قسم کی شرارتوں کے منصوبے وہیں جنم لیتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اپنی حرکتوں کے انجام سے باخبر بھی ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ لوگ اس قسم کے پروگرام سوچ سمجھ سے کام لے کر نہیں بناتے۔ وہاں ہر شرارت کسی منصوبہ بندی کے بغیر سوچی جاتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ساری دنیا انتشار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اگر روئے زمین سے کبھی عبادت گاہوں کا وجود ختم ہوا تو وہ مذہب پرستوں کی وجہ سے نہیں بلکہ نام نہاد مذہب پرستوں کی وجہ سے ہوگا۔ ایک تو پہلے ہی دنیا سے عبادت گاہیں ختم ہو رہی ہیں' بلکہ کم و بیش ختم ہو ہی چکی ہیں۔ اگر ہم دنیا میں عبادت گاہوں کا وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پہلے ہم کو اس عظیم الشان عبادت گاہ پر نظر ڈالنی ہوگی جو خود بخود موجود ہے اور ہمارے اطراف محیط ہے......پھر ان چھوٹی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور وہ خدائے لازوال کی علامت کے طور پر موجود رہیں گی۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ میں آپ کو ایک رومال تحفتاً دیتا ہوں......رومال کی اوقات ہی کیا ہے......صرف چند سکے......مگر آپ اس کو اپنی الماری میں حفاظت سے رکھیں گے۔

ایک مرتبہ میں ایک گاؤں میں گیا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت لوگ ریلوے

اسٹیشن تک میرے ساتھ آئے اور کسی نے میری گردن میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ میں نے وہ اتار کر قریب کھڑی ہوئی ایک لڑکی کو دے دیا۔ چھ سال کے بعد ایک بار پھر میرا اسی گاؤں میں جانا ہوا۔ وہی لڑکی میرے پاس آ کر کہنے لگی کہ اس نے وہ پھولوں کا ہار محفوظ رکھا ہوا ہے جو میں نے اس کو دیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پھولوں کا رنگ اڑ چکا ہے اور خوشبو معدوم ہو چکی ہے' مگر آج تک وہ تروتازہ ہیں۔ کیوں نہ ہوں' آخر آپ نے مجھے دیا تھا۔

میں اس کے گھر گیا' وہ لکڑی کا ایک خوبصورت صندوقچہ لائی جس میں وہ پھولوں کا ہار حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ پھول بالکل مرجھا چکے تھے اور خشک ہو کر اپنی خوشبو کھو چکے تھے۔ یہ دیکھ کر کوئی بھی اس پوچھ سکتا تھا کہ اتنے خوبصورت صندوقچے میں تم نے یہ کیا بھر رکھا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ صندوقچہ قیمتی ہے اور اس کچرے کی کوئی اہمیت نہیں۔ مگر وہ لڑکی اس صندوقچے کو تو پھینک سکتی تھی پھولوں کے اس ہار کو نہیں۔ اس کو اس کچرے میں کچھ اور ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لیے وہ ایک علامت تھا......وہ کسی کی پیار بھری یادوں کا حامل تھا۔ وہ تمام دنیا کے لیے ایک بیکار چیز ہو سکتی تھی' مگر اس لڑکی کے لیے نہیں۔

اگر عبادت گاہ' مسجدیں اور گرجا انسان کو یاد دلاتے رہیں کہ ان کو خدا کی جانب لوٹ جانا ہے' جو کہ سچ بھی ہے......گرجا کی اونچی محرابوں پر نظر ڈالیے......مسجد کے بلند ہوتے ہوئے میناروں اور عبادت گاہوں کے آسمان کو چھوتے ہوئے گنبدوں کو دیکھیے۔ ان کی اس کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں کہ وہ خدا کی تلاش میں انسان کی فطری بلندئ پرواز کی علامت ہیں۔ وہ اس بات کی علامت ہیں کہ انسان محض ایک گھر......ایک مکان سے مطمئن نہیں......وہ عبادت گاہ بھی بنانے کا خواہشمند ہے۔ وہ زمین پر محدود رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ آسمان کی بلندیوں کو چھو لینا چاہتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی مٹی کے ان چراغوں کی طرف توجہ دی ہے جو عبادت گاہوں میں جلتے رہتے ہیں؟ آپ کو حیرت نہیں ہوتی کہ ان چراغوں کو جلتا رکھنے کے لیے ان میں گھی اور خالص مکھن استعمال ہوتا ہے۔ کیا آپ کو علم ہے کہ دنیا میں یہ چراغ ہی وہ واحد شے ہے جس کی لو کبھی نیچے کی طرف نہیں جھکتی؟ اس کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتا ہے۔ اگر آپ اس چراغ کو الٹ بھی دیں تب بھی اس کا شعلہ آسمان کی طرف ہی رہے گا۔ وہ شعلہ جس کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتا ہے۔ وہ انسان کی خواہشات کی علامت ہے۔ ہم زمین پر رہتے ہوئے آسمان میں بھی اپنی پناہ گاہ

بنانے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ہم چاہے زمین میں جکڑے ہوئے ہوں مگر چاہتے ہیں کہ آزادی سے آسمان کی وسعتوں کو بھی چھوسکیں۔

اور کیا کبھی اس پر بھی غور کیا کہ شعلہ جس سرعت سے بلند ہوتا ہے اسی سرعت سے فضا میں غائب ہوجاتا ہے؟اور یہ کہ جب شعلہ بلند ہوکر غائب ہوجاتا ہے تو آپ اس کا کوئی نشان نہیں پاسکتے ؟ یہ اس بات کی علامت ہے کہ جو بھی بلند ہوگا وہ معدوم ہوجائے گا۔مٹی کا دیا تو ٹھوس وجود کا حامل ہے جبکہ شعلہ کسی حد تک سیال ہوتا ہے۔وہ جیسے ہی اوپر اٹھتا ہے فوراً گم ہوجاتا ہے۔لہٰذا چراغ کی لو ہمیں یہی پیغام دیتی ہے۔یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ جو بھی اپنی حد سے آگے جائے گا وہ مٹ جائے گا۔

اپنے چراغوں میں گھی جلانا پیار کا اظہار ہے۔حالانکہ ان میں مٹی کا تیل جلانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا...... خدا کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے...... یہ ہمارا احساس ہے جو کوئی خالص گھی کی طرح پاک صاف ہوجائے گا وہی عروج کا حقدار ہوگا۔مٹی کے تیل کے دیے کا شعلہ بھی آسمان کی طرف ہی جائے گا...... مٹی کا تیل بھی گھی سے کم نہیں...... مگر اصلی گھی بھی اس بات کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہ جو بھی پاک صاف ہوگا وہی بلند مرتبہ ہوگا۔

عبادت گاہیں، مسجدیں اور گرجا اسی نوع کی علامات ہیں۔وہ ہم کو بیحد عزیز ہوسکتے ہیں کہ وہ نہایت خوبصورت علامات ہیں۔انسان کی بنائی ہوئی لازوال علامات...... مگر بہت سی خرافات داخل ہوجانے کی وجہ سے وہ اپنی قدر کھو بیٹھی ہیں۔اب ایک عبادت گاہ صحیح معنوں میں عبادت گاہ نہیں رہی...... وہ صرف ہندوؤں کی عبادت گاہ ہوکر رہ گئی ہے۔اور نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ وشنوؤں کی...... وشنو کے چیلوں کی۔بلکہ وشنوؤں کی بھی نہیں...... فلاں اور فلاں شخص کی۔اس قسم کی اکھیڑ پچھاڑ کی وجہ سے وہ سیاسیات کا اکھاڑہ بن کر رہ گئی ہیں۔وہ نسل پرستی اور کند ذہنی کے رجحانات کو فروغ دینے کا کام کرتی ہیں، جو لوگوں کو فتنہ گر بناتے ہیں۔یوں کرتے کرتے وہ ایسے اداروں میں تبدیل ہوگئے ہیں جو اپنے مفادات کی خاطر استحصال جاری رکھے ہوئے ہیں۔

میں آپ کو عبادت گاہوں کے خاتمے پر نہیں اکسا رہا ہوں؛ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس تمام گند سے نجات حاصل کی جائے جو عبادت گاہوں کا حصہ بن گئی ہے۔ان کے مفاداتِ پیوستہ کو تلف کردیا جائے۔عبادت گاہوں کو ادارے بننے سے روکا جائے!ان کو نسل پرستی اور فتنہ

اندوزی سے روکا جائے۔عبادت گاہ حقیقتاً ایک بیحد متبرک اور خوبصورت مقام ہے اگر اس کی حیثیت ہمارے لیے صرف خدا کی طرف رہنمائی کا فرض ادا کرتے رہنا ہو۔اگر وہ اس کی علامت بن جائے، اگر وہ ہمیں بلند پروازی کی ترغیب دیتا رہے۔

میں کہہ رہا ہوں کہ یہ عبادت گاہ جب تک سیاست کے اکھاڑے بنے رہیں گے، ہماری بدقسمتی کا سبب بنے رہیں گے۔جبکہ اس وقت بھی عبادت گاہ سیاست کے اکھاڑے کے سوا کچھ نہیں۔جب ہندوؤں کے لیے کوئی عبادت گاہ بنائی جاتی ہے تو وہ ازخود سیاست کی آماجگاہ بن جاتی ہے، کیونکہ سیاست کی بنیاد ہی نسل پرستی اور ذات پات کے مسائل کو فروغ دینے پر ہے مذہب ایک ایسی چیز ہے جس کا نسل پرستی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔مذہب کا مقصد ہے خود کو فنا کردینا ہے، روحانیت ایک انفرادی معاملہ ہے......اور سیاست کا مطلب ہے نسل پرستی۔ہمیشہ خیال رکھنا کہ مذہب کا رشتہ تو سادھنا سے جوڑا جاسکتا ہے مگر نسل پرستی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں سیاست کا وجود نسل پرستی سے ہے...... نسل پرستی نفرت کی بنیاد ہے......اور نفرت خون خرابہ چاہتی ہے......اور اسی طرح فتنے جاری رہتے ہیں۔

عبادت گاہوں کے خدا کی علامت ہونے کے تصور میں ملاوٹ آچکی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ملاوٹ ختم کی جائے۔تب یہ ایک لازوال حسن کی علامت بن سکتی ہیں۔کسی گاؤں کی عبادت گاہ کا تعلق اگر ہندو، مسلمان یا عیسائی سے نہ جوڑا جائے تو وہ گاؤں کتنا حسین ہو جائے؟ وہ عبادت گاہ اس گاؤں کے ماتھے پر ایک لازوال جھومر کی طرح جڑی ہوئی ہوگی۔پھر جو لوگ اس معبد میں داخل ہوں گے ان کے ذہن میں کبھی یہ نقش نہیں ابھرے گا کہ یہاں آکر وہ خدا کے نزدیک آگئے ہیں، یا یہ کہ وہ جب تک اس سے باہر تھے تب تک وہ اس سے دور تھے...... بلکہ یہاں آکر ان کو خود اپنے اندرون کا جائزہ لینا آسان ہوجائے گا۔مزید یہ کہ وہ اس جگہ آکر حسن، امن اور خودی کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔پھر ان کو علم ہوگا کہ وہ ایسی جگہ آگئے ہیں جو دھیان میں گم ہوجانے کے لیے نہایت موزوں ہے۔اور ارتکازِ توجہ (دھیان) ہی ہمیں خدا سے آشنا کرتا ہے۔

اپنے گھر کو کوئی اتنا پرسکون نہیں بنا سکتا جو ارتکاز کے لیے موزوں ہو۔البتہ پورا گاؤں اجتماعی طور پر ایسا کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ہر کوئی اپنے بچوں کے لیے علیحدہ استاد رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور نہ ان کے لیے علیحدہ اسکول کی عمارت، اور کھیل کا میدان بنا سکتا ہے۔اور

اگر ہر کوئی ایسا کرنے بھی لگے تب بھی نت نئے مسائل پیدا ہو جائیں گے...... بچوں کی ایک محدود تعداد ہی تعلیم حاصل کر سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گاؤں میں ایک اسکول قائم کر کے وہاں ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دی جاتی ہے' وہ پورے گاؤں کے بچوں کے لیے تعلیمی سہولیات فراہم کر دیتا ہے۔ اسی طرح ہر گاؤں میں ایک معبد ہونا چاہیے جو خود آگاہی اور ارتکاز کے لیے کافی ہو۔ مساجد اور منادر کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔ موجودہ وقت میں ان سے یہ کام کوئی نہیں لے رہا' وہ فقط انتشار اور بدنظمی پھیلانے کے مراکز بن کر رہ گئے ہیں۔

اس لیے ہمیں ان عبادت گاہوں کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہمیں اس بات پر توجہ مرکوز رکھنی ہوگی کہ وہ مسائل پیدا کرنے کے سبب نہ بنیں۔ اور ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ وہ کسی ہندو یا مسلمان کے ہاتھوں میں جانے کے بجائے مذہبی ہاتھوں میں رہیں۔

اگر کسی گاؤں کے بچے اتنی ہی آزادی سے مسجد میں جا سکیں جس آزادی کے ساتھ وہ مندر میں چلے جاتے ہیں یا گرجا میں بھی اسی آزادی سے جا سکیں جس کے ساتھ وہ شیو کے مندر میں جا سکتے ہیں۔ تو یقیناً وہ حقیقی معنوں میں مذہبی گاؤں ہوگا۔ وہاں کے لوگ اچھے لوگ ہوں گے۔ وہاں کے والدین اپنے بچوں کے دشمن نہیں ہوں گے۔ دیکھنے والے دیکھیں گے کہ وہاں کے لوگ اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں اور وہ ان کے لیے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھ رہے ہیں جہاں وہ آپس میں خون خرابے سے دور رہیں گے۔ اس گاؤں کے لوگ اپنے بچوں کو یہ درس دیں گے کہ ایک مسجد بھی اتنا ہی تمھارا گھر ہے جتنا ایک مندر۔ جہاں تم کو امن و سکون دکھائی دے وہاں چلے جاؤ۔ وہاں بیٹھو اور خدا کا قرب حاصل کرو۔ سب ہی عمارتیں خدا کے گھر ہیں لیکن اہمیت اس بات کی ہے کہ وہاں اس کی ایک جھلک بھی دکھائی دے جائے۔ اور اس کے لیے ہمیں اپنا آپ تلاش کرنا ہوگا۔ یا جہاں بھی جانا چاہو چلے جاؤ...... جب یہ خواہش حقیقت میں بدل جائے گی تو دنیا میں صحیح قسم کا عبادت خانہ تعمیر ہو جائے گا۔ جس کو بنانے میں ہم ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

میں ان میں سے نہیں ہوں جو عبادت گاہوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ہماری عبادت گاہیں ان لوگوں کے ہاتھوں پہلے ہی تباہ ہو چکی ہیں جو ان کی ملکیت کے دعویدار ہیں۔ اور ہمارا یہ خواب کب پورا ہوگا' یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ اور پھر

لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میں مندروں کا مخالف ہوں۔ بھلا کسی مندر کو تباہ کرنے سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ جن عناصر نے مندروں کو گھیر رکھا ہے ان کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے میں البتہ کوئی مضائقہ نہیں اور اس کاوش میں حصہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

اب ایک سوال مزید! جس کے بعد ہم ارتکاز کا عمل شروع کرینگے۔ صبح کی گفتگو کے بعد ایک دوست نے سوال کیا ہے:

کیا کبھی آتما...... روح یا شعور...... جسم کو چھوڑ کر بھٹکتی بھی ہے؟

موت کے فوراً بعد کسی روح کو نیا جسم تلاش کرنے میں دقت پیش آتی ہے؛ جس کی ایک وجہ ہے...... اور شاید آپ نے کبھی سوچا بھی نہ ہو کہ اسکی یہ وجہ ہو سکتی ہے۔ اگر تمام روحوں کو تقسیم کیا جائے تو ان کے تین حصے ہو جائیں گے۔ ایک حصہ سب سے نچلے درجے کا ہوگا...... ایسے لوگوں کا جو ادنیٰ ذہنی سطح کے مالک تھے؛ دوسرا نہایت اعلیٰ درجے کی ذہنیت کے مالکوں کا ہوگا...... بہترین خود آگہی کے حاملین کا۔ تیسرا ان دونوں درجوں کے درمیان کا درجہ ہوگا...... دونوں درجات کی کچھ نہ کچھ خصوصیات کے حاملوں کا۔

ہم ایک چھوٹے ڈھول یعنی ڈمرو کو بطور مثال لیتے ہیں۔ وہ دونوں سروں پر سے چوڑا ہوتا ہے اور درمیان میں سے تنگ۔ اگر ہم اس کی یہ ترتیب الٹ دیں تو یہ درمیان سے چوڑا اور دونوں کناروں پر تنگ ہو جائے گا۔ اور ہم ناموزوں چیزون کی کیفیت جان سکیں گے۔ تنگ سروں پر بہت کم لوگ ہوں گے۔ یوں کمتر درجے کے اذہان کے مالک بھی نئے جسم کی تلاش میں اتنی ہی مشکل محسوس کرتے ہیں جتنی اعلیٰ پائے کے لوگ۔ البتہ وہ جو درمیانی درجے میں آتے ہیں ان کو دوسرا جسم حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں پیش آتی۔ جیسے ہی وہ پرانا جسم چھوڑتے ہیں ان کو دوسرا جسم دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درمیانی سطح کی روحوں کو ایک بطن ہر وقت خالی مل جاتا ہے۔

جیسے ہی کوئی انسان مرتا ہے اس کی روح سینکڑوں لوگوں کو' سینکڑوں جوڑوں کو محوِ اختلاط دیکھتی ہے' اور ان میں سے جس جوڑے کو وہ پسند کرتی ہے اس کے رحم میں داخل ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ روحیں بہرحال کسی ادنیٰ درجے کے بطن میں داخل نہیں ہوتیں۔ ان کو اپنے لیے غیر معمولی قسم کے بطن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اعلیٰ روحوں کی ضرورت کوئی ایسا جوڑا ہوتا ہے جو اعلیٰ قسم کے

شعور کا حامل ہوتا کہ ان کی پیدائش پر ان کو امکانی حد تک غیر معمولی خصوصیات حاصل ہو سکیں۔ اس لیے ان کو دوسرے جنم کے لیے موزوں رحمِ مادر کی تلاش میں بعض اوقات کافی عرصے تک بھی انتظار کرنا پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح کمتر درجے کی روحوں کو بھی انتظار کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کو بھی کوئی موزوں جوڑا آسانی سے نہیں ملتا۔ پس اعلیٰ شخصیات اور رذیل شخصیات آسانی سے پیدا نہیں ہو پاتیں جبکہ اوسط درجے کی شعوری کیفیات کے مالک کسی مشکل کے بغیر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس نوعیت کے بطن ہر وقت منتظر رہتے ہیں اور اس درجے کی روح ان میں سے کسی بھی رحم میں آسانی سے داخل ہو جاتی ہے۔

صبح کی نشست میں میں نے 'بردو' کا ذکر کیا تھا۔ اس طریقے میں مرنے والے انسان کو کہا جاتا ہے "تم سینکڑوں لوگوں کو محوِ اختلاط دیکھو گے۔ جلد بازی نہیں کرنا۔ کچھ غور کرنا۔ اور انتظار کرنا۔ بطن میں داخل ہونے سے پہلے کچھ دیر وہاں ٹھہرنا' تم کو جو کوکھ پسند آجائے اس میں فوراً داخل مت ہونا۔ کچھ لوگ خریداری کے لیے جاتے ہیں تو جو کچھ ان کی آنکھ میں سما جائے وہ جلد از جلد اس کو خرید لیتے ہیں' جو دکان بھی ان کے سامنے پہلے آجائے وہ اس میں گھس جاتے ہیں۔ مگر ایک سمجھدار گاہک پہلے کئی دوکانوں پر جا کر اپنی ضرورت کی اشیاء پسند کرتا ہے' معلومات حاصل کرتا ہے' قیمتیں طے کرتا ہے پھر فیصلہ کرتا ہے"

لہٰذا 'بردو' میں مرنے والے کو آگاہ کیا جاتا ہے "ہوشیار! جلد بازی نہیں کرنا! تلاش میں رہنا! غور کرنا اور ہر بات کو ذہن میں رکھنا" اس کو یہ اس لیے بتایا جاتا ہے کیونکہ بے شمار جوڑے مستقل محوِ اختلاط رہتے ہیں۔ وہ شخص واضح طور پر سینکڑوں جوڑوں کو پیار کرتے دیکھتا ہے' انہی کے درمیان کو وہ جوڑا نظر آجاتا ہے جو اس کے لیے مناسب رحم فراہم کر سکتا ہے۔

اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں قسم کی روحوں کو مناسب کوکھ کے حصول تک انتظار میں رہنا پڑتا ہے۔ ادنیٰ درجے کی روحوں کو آسانی سے ادنیٰ درجے کی وہ کوکھ نہیں مل پاتی جن کے ذریعے وہ اپنے امکانات حاصل کر سکیں۔ اسی طرح اعلیٰ درجے کی روحیں بھی آسانی کے ساتھ اعلیٰ کردار کی حامل کوکھ حاصل نہیں کر پاتیں۔ جسم کی تلاش میں آوارہ پھرنے والی ادنیٰ روحوں کو ہم خبیث ارواح کا نام دیتے ہیں۔ اور جو اعلیٰ کردار کی روحیں اپنے اگلے جنم کے انتظار میں ہوتی ہیں ان کو ہم دیوتا کہتے ہیں۔ اس درجے کی روحیں جو اپنے لیے مناسب کوکھ کی تلاش میں رہتی ہیں ان کو خدا کا مرتبہ

حاصل ہوتا ہے۔ بھوت اور خبیث ارواح نچلے درجے کی ارواح ہوتی ہیں...... اپنی کمتر حیثیت کی بنا پر آوارہ پھرتی رہتی ہیں۔ درمیانے درجے کی روحوں کے لیے کوکھ ہر وقت دستیاب ہوتی ہے' جیسے ہی کسی کو موت آتی ہے ویسے ہی اس کی روح دوسرے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

اسی دوست نے ایک اور سوال کیا ہے:

وہ روحیں جو دوسرے جنم کے انتظار میں ہوں' کیا کسی اور کے جسم میں داخل ہو کر اس کو پریشان کر سکتی ہیں؟

"ہاں! یہ بھی ممکن ہے...... کیونکہ وہ پست حیثیت کی روح جس کو تا حال کوئی جسم نہیں ملا ہے وہ بیحد مضطرب رہتی ہیں' جبکہ اعلی درجے کی ارواح بغیر جسم کے بھی خوش و خرم رہتی ہیں۔ یہ فرق آپ کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا۔ پہلے درجے کی یہ روحیں جسم کو اپنے لیے ایک قسم کی قید سمجھتی ہیں۔ وہ اتنی سبک رہنا چاہتی ہیں کہ جسم کا بوجھ ان کو ناگوار ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ جسم کی قید سے آزاد رہنا پسند کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک جسم کی حیثیت ایک قید خانے کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جسم میں آنے کے بعد ان کو ایسے کام بھی بطیبِ خاطر کرنے پڑتے ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے اس قسم کی ارواح کے لیے کوئی جسم قابلِ توجہ نہیں ہوتا۔ کمتر حیثیت کی ارواح جسم کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتیں' ان کی دلچسپی' ان کی خوشیاں مادی جسم سے وابستہ ہوتی ہیں۔

اکثر مسرتیں مادی جسم کے بغیر قابلِ حصول ہیں۔ مثلاً ایک مفکر کی روح جسم کی علت کے بغیر غور و فکر کرنے میں خوشی محسوس کرے گی کیونکہ غور و فکر کا تعلق مادی جسم سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ اس لیے ایک مفکر کی روح اگر بھٹکتی ہے تو اس کو جسم حاصل کرنے کی کوئی عجلت نہیں ہوتی اور یہ حالت اس کے غور و فکر کرتے رہنے میں حائل نہیں ہوتی۔ یوں کہہ لیجیے کہ ایک شخص مطمئن ہو کر کھانا کھاتا ہے' تو یہ اطمینان اس کو جسم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس وجہ سے ایک روح جسم میں داخل ہونے کے لیے بےچین ہوتی ہے۔ اور اگر وہ اپنے لیے کوئی جسم حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو وہ ایک ایسے جسم میں داخل ہو جاتی ہے جس میں قوتِ مزاحمت کمزور ہو۔ کمزور قوتِ مزاحمت سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی روح کے احکامات کا پابند نہیں ہوتا۔ ایسی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسکی روح خوف کی حالت میں ہوتی ہے۔

یاد رکھیے کہ خوف کی حالت میں ہونا بہت معنی خیز ہے۔خوف اس کو کہتے ہیں جو آپ کو سکڑنے پر مائل کرتا ہے۔جب آپ خوف کی حالت میں ہوتے ہیں تو سکڑ جاتے ہیں۔اور جب آپ سرخوشی میں ہوتے ہیں تو پھیل جاتے ہیں۔جب ایک انسان خوف کی حالت میں سکڑ جاتا ہے تو اس کے اندر کسی دوسری روح کے داخل ہونے کی گنجائش نکل آتی ہے۔اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ کئی ارواح اس کے جسم میں بیک وقت داخل ہوسکتی ہیں۔ایک روح ایسا اسی وقت کرتی ہے جب اس کی تمام خواہشات اس کے جسم کے ساتھ وابستہ ہوجاتی ہیں' یہ کیفیت اس کو کسی بھی جسم میں داخل ہونے پر مجبور کردیتی ہے۔یہ سو فیصد ممکن ہے۔اس سلسلے میں ٹھوس حقائق موجود ہیں۔یہ سراسر سچ پر مبنی ہے۔

اس کا ایک ہی واضح مطلب ہے کہ خوفزدہ انسان خود کو ہر وقت خطرے میں گھرا محسوس کرتا ہے' جس کی بنا پر وہ سکڑی ہوئی حالت میں ہوتا ہے۔یوں سمجھئے کہ وہ اپنے گھر کے ایک کمرے میں محدود ہے جبکہ باقی کمرے خالی پڑے ہوئے ہیں جن میں کوئی بھی آ کر بسیرا کرسکتا ہے۔

کبھی کبھار اعلیٰ درجے سے تعلق رکھنے والی روح بھی کسی انسانی جسم میں داخل ہوجاتی ہے' مگر وہ قطعی دوسرے مقصد سے ایسا کرتی ہے۔کچھ عمل رحم لی کے باعث کرنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے جو جسم کے بغیر ممکن نہیں ہوتے۔جیسے ایک مکان میں آگ لگ جائے اور کوئی بھی اس کو بچانے کے لیے آگے بڑھنے کو تیار نہ ہو۔ہجوم بے بسی کی حالت میں باہر جمع ہو' کسی کو اندر گھسنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہو کہ اچانک ایک شخص آگے بڑھتا ہے اور آگ بجھا کر اندر پھنسے ہوئے کسی انسان کی جان بچانے کی جدوجہد کرتا ہے۔بعد میں جب سب کچھ معمول پر آجاتا ہے تو اس شخص کو حیرت ہوتی ہے کہ اس نے یہ سب کیسے کردیا؟ اس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ کسی انجانی قوت نے اس سے یہ سب کرایا ہے...... یہ سب وہ نہیں کرسکتا تھا......اور یہ سب کسی اور نے کیا ہے۔ایسے موقعوں پر جب کوئی انسان کسی اچھے کام کے لیے ہمت پیدا نہیں کرسکتا تب کوئی اعلیٰ روح اس کے جسم میں داخل ہوکر وہ کام کرادیتی ہے۔مگر ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے۔

کیونکہ اچھی روحوں کو نئے جنم کے لیے موزوں کوکھ حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے اس لیے ان کو دوسرے جنم کے لیے بعض اوقات سینکڑوں سال انتظار کی حالت میں رہنا پڑتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ ایک ہی دور میں پیدا ہوجاتے ہیں۔مثال کے طور

پر گوتم بدھ اور مہاویر' دو ہزار پانچ سو سال پہلے ہند میں ایک ہی دور میں پیدا ہوئے۔دونوں بہار میں پیدا ہوئے اور اسی دور میں مزید چھ نابغۂ روزگار شخصیات بہار میں موجود تھیں۔ان کے نام ہمیں نہیں معلوم۔اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ ان کے کوئی معتقدین نہیں تھے۔البتہ وہ بدھ اور مہاویر کے مرتبے کے ہی لوگ تھے۔اور انھوں نے انتہائی دلیرانہ تجربہ کیا کہ اپنا کوئی عقید تمند نہیں چھوڑا۔ان میں سے ایک پر بدھا کتیایانہ' دوسرا اجیت کیشکمبل اور اس کے علاوہ ایک سنجے ویلیتھی پتر تھا۔پھر مکھالی گوسل اور دوسرے تھے۔وہیں بہار میں اسی حیثیت اور مرتبے کے آٹھ افراد اسی ایک دور میں پیدا ہوئے۔تمام دنیا کے ہوتے ہوئے ان آٹھ روحوں نے طویل عرصے تک اس چھوٹی سی ریاست بہار میں پیدا ہونے کے لیے انتظار کیا' اور جب یہ موقعہ آیا تو ایک ساتھ آ گیا۔

•

خبیث روحوں کی طرح...... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھائی کے فروغ کے لیے پیدائشوں کی ایک زنجیر سی بن جاتی ہے۔بدھ اور مہاویر کا ہی دور تھا جب یونان میں سقراط اور اس کے بعد افلاطون اور ارسطو پیدا ہوئے۔کم و بیش اسی وقت چین میں کنفیوشس...... لاؤ زھو...... چوانگ زھو...... مینسیس اور ینگ زھو پیدا ہوئے۔یہ بیش قیمت لوگ ایک ہی دور میں دنیا کے مختلف حصوں میں پیدا ہوئے۔پوری دنیا ایک ہی وقت میں اتنے حیرت انگیز لوگوں سے بھر گئی۔ایسا لگتا ہے کہ ان تمام لوگوں کی ارواح انتظار میں تھیں اور جیسے ہی وقت آیا' ان کو موزوں قالب مل گئے۔

جب کبھی اتفاقاً بطن دستیاب ہوتے ہیں تو یہ کھلنے والے پھولوں کی طرح ایک ساتھ بہت سے دستیاب ہوجاتے ہیں۔جب بہار کا موسم آتا ہے تو آپ ایک پھول کھلتا ہوا دیکھتے ہیں' پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔پھول بھی کھلنے کے لیے مضطرب تھے۔صبح ہوتے ہی جب سورج طلوع ہوتا ہے تو پھول کھلنا شروع ہوجاتے ہیں۔غنچہ چٹکتا ہے اور پھول کھل اٹھتا ہے۔پھولوں نے تمام رات انتظار کیا اور جیسے ہی سورج نکلا وہ کھل اٹھے۔

بعینہ ادنیٰ درجے کی روحوں کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔جب دنیا میں ایک سازگار فضا پیدا ہوجاتی ہے تو وہ بھی ایک تسلسل کے ساتھ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔اس کی مثال یوں ہے کہ ہمارے وقتوں میں ہٹلر' اسٹالن اور ماؤ سب ایک ہی دور میں پیدا ہوئے۔ایسے خطرناک لوگوں نے

یقیناً پیدا ہونے کے لیے ہزاروں سال انتظار کیا ہوگا۔ ایسے لوگوں کو آسانی سے کوئی بطن دستیاب نہیں ہوتا۔ تنہا اسٹالن نے روس میں چھ لاکھ انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اور اکیلے ہٹلر نے دس لاکھ انسانوں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ اتنی ہلاکتوں کے لیے ہٹلر نے جو طریقہ اختیار کیا وہ دنیا میں اپنی طرز کا واحد طریقہ تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں انسانوں کو ہلاک کرنے کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کے بعد تیمور لنگ اور چنگیز خان نے نت نئے طریقے ایجاد کیے۔ ہٹلر نے بڑی تعداد میں لوگوں کو ہلاک کرنے کے لیے گیس چیمبر استعمال کیے۔ اس نے ایک ایک انسان کو الگ الگ قتل کر کے ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے طریقے کو وقت طلب اور مہنگا قرار دیا اور بڑی تعداد میں لوگوں کو قتل کرنے کے لیے نیا طریقہ ایجاد کیا۔ اجتماعی قتل کرنے کے اور بھی طریقے ہیں، جیسے حالیہ نسلی فسادات کے دوران احمد آباد اور دوسری جگہوں پر اختیار کیے گئے ...... مگر وہ سب مہنگے طریقے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ لوگوں کو ایک ایک کر کے قتل کرنے میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ ایسے علیحدہ علیحدہ لوگوں کو قتل کرنے سے بات نہیں بنتی! آپ ایک کو یہاں قتل کرتے ہیں تو دوسرا کہیں اور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہٹلر ایک ہی بار پانچ ہزار لوگوں کو گیس چیمبر میں بھر کر ایک بٹن دبانے سے سب کو فنا کر دیتا تھا۔ سب لوگ تحلیل ہو جاتے تھے۔ خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرتا تھا، کوئی قبر نہیں بنانی پڑتی تھی۔ نہایت صفائی کے ساتھ سب کچھ ہو جاتا تھا۔

ہٹلر پر خون کی ہولی کھیلنے کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر اس کا مقدمہ خدا کی عدالت میں پرانے قوانین کے تحت چلایا جائے گا تو اس کو بالکل بے گناہ قرار دے دیا جائے گا۔ اس نے خون کا ایک قطرہ نہیں بہایا۔ اس نے کسی کے سینے میں تلوار نہیں گھونپی۔ اس نے قتل کرنے کے لیے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا جو بیان سے باہر ہے۔ اس نے لوگوں کو گیس چیمبر میں بھر کر بجلی کے زیادہ وولٹ کا ایک بٹن دبا کر لوگوں کو معدوم کر دیا۔ ان کے وجود کا کوئی سراغ باقی نہیں بچا۔ ہٹلر نے پہلی بار لوگوں سے ایسے نجات حاصل کی جیسے کوئی پانی گرم کر کے اسکو بھاپ میں تبدیل کر دے۔ اس نے دس لاکھ جیتے جاگتے انسانوں کو دھوئیں میں تبدیل کر دیا۔

ہٹلر جیسے لوگوں کی روح کے لیے جلد ہی نیا قالب ڈھونڈ لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور یہ اچھا ہی ہے ورنہ دنیا بڑی مشکلات میں گھر جاتی۔ ہٹلر کو دوبارہ پیدا ہونے کے لیے ایک طویل عرصے انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ ایسے وجود کے لیے دوبارہ جگہ پانا انتہائی مشکل کام ہے۔

ایک بہت گھٹیا ابتدا کے ساتھ پیدا ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا مطلب ہے والدین کے آبا و اجداد کے کھاتے میں بے شمار گناہوں کا بوجھ ہونا۔ ایک عرصۂ حیات میں کوئی بھی اتنے گناہ نہیں کر سکتا جو ہٹلر جیسے انسان کی پیدائش کا سبب بن سکیں۔ ہٹلر جیسا ایک بیٹا پیدا کرنے کے لیے کسی کو ایک زندگی میں کتنے گناہ، کتنے قتل کرنے پڑیں گے۔ ہٹلر جیسے بیٹے کو پیدا کرنے کے لیے اس کے والدین کو گناہوں کا ایک لمبا سلسلہ درکار ہوگا۔ اتنے گناہ جن کے ارتکاب کے لیے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں سال درکار ہونگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ہزاروں سال تک لوگوں کو قتل کرنے میں مسلسل مصروف رہے تب کہیں جا کر اس کی جینس، اس کی نسل ہٹلر جیسا بیٹا پیدا کرنے کا استحقاق حاصل کر سکے گی۔

پاکیزہ روح کے لیے بھی یہی صورت ہے۔ ایک واجبی اور عام سی روح کے پیدا ہونے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ چاروں طرف ایسی روحوں کے لیے خالی بطن منتظر رہتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کی شرائط بھی بہت معمولی ہوتی ہیں۔ وہی کھانا، پینا، دولت کمانا، جنسی خواہشات کی تکمیل، عزت اور مقام حاصل کرنے جیسی عمومی خواہشات۔ کیونکہ ہر شخص انہی سب کے پیچھے بھاگتا ہے اس لیے اس روح کو نہایت آسانی سے رحمِ مادر دستیاب ہو جاتا ہے۔ تمام والدین، ہر ایک روح کو یہ تمام خواہشات پوری کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولیات فراہم کر سکتے ہیں مگر کوئی پاکیزہ روح اس قسم کی زندگی حاصل کرنے کے لیے زمین پر قدم رکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی جس میں وہ اپنی محبت سے کسی کی تکلیف کا باعث ہو یا اس کا پیار کسی کے لیے بوجھ بن جائے تو ہم کو ایسی روح کے قالب کی صورت میں آنے کے لیے بہت طویل انتظار کرنا ہوگا۔

اب ہم کو شام کے ارتکازِ توجہ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اور پہلے مجھے چند باتوں کی وضاحت کرنے دیجیے: میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ ایک دوسرے سے بالکل نزدیک ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ طریقہ آپ کو چوکنا ہو کر بیٹھے رہنے پر مجبور کرے گا کہ کہیں آپ کسی دوسرے پر نہ گر جائیں۔ ایسی کیفیت میں آپ گہرے استغراق میں نہیں جا سکیں گے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ کہ آپ ایک دوسرے سے فاصلہ پر کھلے کھلے ہو کر بیٹھیں۔ جو لوگ لیٹنے کو ترجیح دیتے ہیں وہ چاہیں تو لیٹ بھی سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعد میں جب آپ دھیان میں غرق ہو جائیں اور خود کو گرتا ہوا محسوس کریں تب بھی خود کو روکنے کی کوشش مت کریں۔ مکمل محو ہو جائیے، جسم گرتا ہے تو گرنے دیں۔

اب لائیٹیں بند کر دی جائیں۔

اپنی آنکھیں بند کر لیں ...... جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں ...... جسم کو مکمل طور پر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ ایسا جیسے اطراف میں کوئی موجود نہیں ہے۔ ایسا محسوس کریں کہ آپ کے جسم کی تمام تر توانائی اندر کی طرف منتقل ہو رہی ہے خود کو اپنے اندر داخل ہوتا ہوا محسوس کریں۔ آپ کو اپنی پوری توانائی اپنے اندر سمو لینی ہے۔ تین منٹ تک میں آپ کو ہدایات دوں گا کہ آپ کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے...... اور آپ کو یہ بات محسوس بھی کرنی ہے۔ اپنے جسم کو محسوس کرتے ہوئے اس کو ڈھیلا چھوڑ دینا ہے۔ آہستہ آہستہ آپ دیکھیں گے کہ آپ کو اپنے جسم پر قابو نہیں رہے گا...... پھر اگر آپ کا جسم گرنا شروع کرے تو اس کو گرنے دیں' اگر یہ پیچھے کی طرف گرتا ہے تو پیچھے گرنے دیں...... اس کو روکنے کی کوشش نہ کریں۔ اپنی طرف سے اپنے جسم کو قابو میں رکھنے کی کوشش مت کریں۔ اپنے جسم پر سے اپنا اختیار ختم کر دیں...... یہ پہلا مرحلہ ہے۔

اب اگلے تین منٹ تک میں آپ کو ترغیبات دوں گا۔ اسی طرح میں آپ کو سانس کے بارے میں ہدایات دوں گا...... پھر خیالات کے بارے میں...... اور آخر میں دس منٹ کے لیے ہم خاموشی میں گم ہو جائیں گے۔

آپ کا جسم سکون میں آ رہا ہے: اس کو محسوس کریں۔ آپ کا جسم پرسکون ہو رہا ہے۔ آپ کا جسم پرسکون ہو رہا ہے۔ آپ کا جسم پرسکون ہو رہا ہے۔ ہونے دیجیے۔ ایسے جیسے آپ کا جسم ہی نہیں ہے۔ جسم پر سے اپنا اختیار چھوڑ دیجیے۔ آپ کا جسم پرسکون ہو رہا ہے۔ جسم پر سے ہر قسم کا دباؤ ہٹا دیجیے...... یوں جیسے آپ کا جسم مر چکا ہے۔

اب آپ اپنے اندر جا چکے ہیں۔ تمام قوت اندر جذب کر لی گئی ہے...... اور اب جسم کو اس طرح پیچھے پھینک دیا گیا ہے جیسے چھلکا۔ آپ کا جسم پرسکون ہو رہا ہے۔ آپ کا جسم مکمل پرسکون ہو چکا ہے۔ ہو جانے دیں...... آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ کہیں دور چلا گیا۔ چلا گیا۔ چلا گیا۔ چلا گیا۔ اگر یہ گرتا ہے تو اس کو گرنے دیں۔ جسم پرسکون ہو چکا ہے۔ جیسے اب آپ مر چکے ہیں...... جیسے اب جسم نہیں ہے۔ جیسے آپ کا جسم لاپتہ ہو گیا ہے۔

اپنی سانسوں کو بھی پرسکون کر لیجیے۔ آپ کی سانسیں بھی سکون میں آ رہی ہیں۔ آپ محسوس کریں کہ آپ کی سانسیں سکون پذیر ہو رہی ہیں...... آپ کی سانسیں مکمل طور پر سکون میں

آ گئی ہیں...... اپنے جسم کو آزاد چھوڑ دیں...... اپنی سانسوں کو بھی آزاد چھوڑ دیں۔ آپ کی سانسیں پرسکون ہو گئی ہیں۔

آپ کے خیالات بھی سکوت اختیار کر رہے ہیں...... خیالات ساکت ہو رہے ہیں۔ اپنے خیالات کی مکمل خاموشی کو محسوس کیجیے...... اندر سے محسوس کریں کہ خیالات ساکت ہو رہے ہیں۔ جسم آزاد ہے۔ سانسیں آزاد ہیں...... خیالات پر خاموشی طاری ہے۔

آپ کے اندر کی ہر چیز خاموش اور پرسکون ہے۔ ہم اس خاموشی میں ڈوبتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم اس طرح گہرائی میں جا رہے ہیں جیسے کوئی کنویں میں گر رہا ہو۔ گہرائی میں گرنا جاری رکھیے' بالکل ایسے جیسے ہم خلا کی گہرائیوں میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔ صفر ہو رہے ہیں۔ ہونے دیں۔ مکمل طور پر اپنا اختیار چھوڑ دیجیے۔ خلا میں ڈوبتے چلے جائیے...... ڈوبتے جائیے...... اندر...... صرف ادراک باقی رہ جائے گا' جیسے کوئی شعلہ فروزاں ہو...... ایک چشم دید گواہ کی حیثیت میں صرف دیکھتے رہیے۔

مشاہدہ میں مصروف رہیے۔ اپنی ذات میں اندر کا مشاہدہ ...... خارج میں ہر چیز فنا ہو چکی ہے۔ جسم مکمل طور پر اندر مرکوز ہو چکا ہے۔ سانسوں پر سکوت چھا چکا ہے۔ خیالات آہستہ خرام ہو چکے ہیں...... اندر سے ہم خاموشی میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ دیکھتے رہیے...... دیکھتے رہیے مسلسل دیکھتے رہیے...... گہری خاموشی...... اور بھی زیادہ گہری خاموشی میں بدل جائے گی۔ اسی مشاہدے کی حالت میں میں بھی معدوم ہو جاؤں گا...... صرف ایک چمکتی ہوئی روشنی...... ایک جلتا ہوا شعلہ باقی رہ جائے گا۔

اب میں دس منٹ کی خاموشی اختیار کروں گا۔ اور آپ اپنے اندر گم ہوتے جائیں۔ گہرے...... اور گہرے۔ اپنا اختیار چھوڑ کر گم ہوتے جائیں۔ صرف مشاہدہ کیجیے۔ دس منٹ تک صرف شاہد رہیے۔

ہر چیز خاموش ہے...... اپنے اندر دیکھیے...... اپنے اندر دیکھتے رہیے۔ صرف دیکھتے رہنے میں مصروف رہیے۔ دماغ زیادہ سے زیادہ خاموش ہو رہا ہے ...... آپ اپنے جسم کو اپنے آپ سے دور پڑا ہوا دیکھیں گے...... جیسے یہ کسی اور کا جسم ہو...... آپ اپنے جسم سے دور چلے جائیں گے...... جیسے آپ نے اپنا جسم چھوڑ دیا ہے۔ ایسا لگے گا جیسے کوئی اور سانس لے رہا ہے۔

اپنی ذات کے اندر اور گہرائی میں چلے جائیں ...... اپنے اندر کی گہرائی میں۔ دیکھتے رہئے ...... اندر جھانکتے رہیں ...... آپ کا ذہن عدم میں ڈوبتا چلا جائے گا۔ گہرائی میں ...... اور بھی زیادہ گہرائی میں چلتے جایئے ...... دیکھتے رہئے ...... آپ کا ذہن مکمل پرسکون ہو چکا ہے۔

اپنے اندر دیکھیں۔ آپ کی 'میں' مکمل طور پر غائب ہو چکی ہے۔ صرف شعور بیدار ہے۔ صرف آگہی بچی ہے اس کے علاوہ ہر چیز گم ہو چکی ہے۔

آہستہ آہستہ چند گہرے سانس لیجئے۔ اب ذہن مکمل طور پر خاموش ہے۔ ہر سانس کا مشاہدہ کیجیے' آپ کو محسوس ہوگا کہ ذہن اور بھی زیادہ خاموشی کی طرف مائل ہے۔ آپ کو اپنی سانسیں بھی اپنے آپ سے علیحدہ محسوس ہوں گی۔ آپ سے بہت دور۔ آہستگی اور نرمی سے سانس لیجئے۔ دیکھیں کہ آپ کی سانسیں آپ سے کتنی دور ہیں۔ دیکھیں کہ آپ کے اور آپ کی سانسوں کے مابین کتنا فاصلہ ہے۔

آہستگی کے ساتھ چند گہری سانسیں لیجیے ...... پھر آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولئے۔ اٹھ بیٹھنے میں جلد بازی کرنے کی ضرورت نہیں ...... اگر آپ کو آنکھیں کھولنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے تو جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ آہستگی اور نرمی سے آنکھیں کھولئے ...... پھر ایک لمحے کے لیے باہر دیکھئے ....

ہمارا صبح کا استغراق پورا ہوا۔

☆

چوتھا باب

مراجعت

ایک دوست جاننا چاہتا ہے:

"آپ نے کس بنیاد پر کہا ہے کہ موت پر دھیان یا سادھنا کے ذریعے فتح حاصل کی جا سکتی ہے؟ جب ہم نیند میں ہوتے ہیں تو کیا وہی کیفیت نہیں ہوتی؟ اور اگر ہوتی ہے تو پھر موت پر نیند کے ذریعے فتح حاصل کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟

پہلے تو آپ کو یہ سمجھنا ہوگا کہ موت پر فتح حاصل کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ موت نام کی کوئی ایسی چیز موجود ہے جس پر فتح حاصل کرنے کا تصور پیدا ہو؟ موت پر فتح حاصل کرنے کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ آپ جان لیں کہ موت کا کوئی وجود نہیں۔ یہ جان لینا کہ موت موجود نہیں' یہی اس پر فتح پا لینا ہے۔ جیسے ہی ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ موت کا کوئی وجود نہیں' ہمارا موت سے ہار جیت کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ ہمارے کچھ ایسے دشمن ضرور ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں مگر لگتا ہے کہ وہ موجود ہیں۔ موت انہی دشمنوں میں سے ایک ہے جن کا کوئی وجود نہیں' مگر لگتا ہے کہ وہ موجود ہیں۔

اس لیے فتح پا لینے کو ان معنوں میں مت لیجیے کہ موت کا کہیں وجود ہے اور ہم اس پر فتح پا لیں گے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی آدمی پاگل ہو کر اپنے سائے سے لڑنا شروع کر دے حتیٰ کہ کوئی اس کو آگاہ کرے کہ "غور سے دیکھو! سائے کا کوئی مادی وجود نہیں ہے' یہ صرف ایک منظر ہے" اگر وہ شخص سائے کو دیکھ کر یہ اعتراف کر لے کہ وہ کیا کر رہا تھا تو وہ اپنے آپ پر ہنس پڑے۔ وہ اس بات کو حقیقت سمجھ لے گا کہ اس نے دراصل سائے پر فتح پا لی ہے۔ حالانکہ سائے پر فتح کا مطلب

یہ علم ہوگا کہ سائے کا کوئی وجود نہیں تھا جس کے ساتھ لڑا جاتا۔ جو ایسا کرے گا وہ دیوانہ ہو جائے گا۔ جو موت سے لڑے گا وہ ہار جائے گا۔ جو موت کی حقیقت جان لے گا وہ اس پر فتح حاصل کر لے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اگر موت نہیں ہے تو پھر ہم کو موت آنے کا کوئی امکان بھی نہیں...... خواہ ہم کو اس بات کا علم ہو یا نہیں۔ دنیا ایسے لوگوں پر مشتمل نہیں ہے جو یا تو مرتے ہیں...... یا نہیں مرتے۔ نہیں...... ایسا نہیں ہے! اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو کبھی مر سکے۔ البتہ یہاں دو قسم کے لوگ ضرور ہیں: ایک وہ جو اس حقیقت سے آگاہ ہیں اور ایک وہ جو یہ بات نہیں جانتے...... دونوں قسم کے لوگوں میں بس یہی ایک فرق ہے۔

نیند میں بھی ہم انہی مقامات پر جا سکتے ہیں جہاں استغراق کی حالت میں جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بس ایک ہی فرق ہے: نیند کے دوران ہم اپنے ہوش میں نہیں ہوتے جبکہ استغراق میں ہم بخوبی اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہیں۔ اگر کوئی نیند کی حالت میں بھی پورے ہوش میں رہ سکے تو اس کے لیے یہ بھی استغراق کا ہی تجربہ ہوگا۔

اس کی مثال یوں ہے کہ اگر ہم ایک انسان کو بیہوش کر کے اسی حالت میں اس کو اسٹریچر پر ڈال کر ایک ایسے باغیچے میں لے جاتے ہیں جہاں پھول کھلے ہوئے ہیں، ہواؤں میں خوشبو رچی بسی ہوئی ہے، سورج نکلا ہوا ہے، پرندے چہچہا رہے ہیں۔ وہ شخص وہاں موجود ہر چیز سے بے خبر رہے گا، جب ہم اس کو واپس لے آئیں اور اس کے ہوش میں آنے پر اس سے باغیچے کے متعلق معلوم کریں تو وہ ہم کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ پھر آپ اس کو بحالتِ ہوش و حواس اسی باغیچے میں دوبارہ لے جائیں تو وہ وہاں موجود ہر چیز سے آگاہ ہو جائے گا جہاں وہ پہلے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا تھا۔ پہلی بار وہ ان خوبصورت مناظر سے بے خبر رہا اور دوسری بار اس کو پھولوں، خوشبو، پرندوں کے چہچہوں اور نکلتے ہوئے سورج کا براہِ راست تجربہ ہوا۔ گو کہ آپ بیہوشی کی حالت میں بھی وہیں تک جا سکتے ہیں جہاں اپنے ہوش میں چلے جاتے ہیں لیکن بیہوشی کی حالت میں کہیں جانا بھی اس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ کہیں نہیں جائیں۔

ہم نیند میں بھی اس جنت تک پہنچ جاتے ہیں جہاں حالتِ استغراق میں جا سکتے ہیں فرق یہ ہوتا ہے کہ ہم اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہر رات ہم اس جنت کی سیر کر کے واپس آ جاتے ہیں...... مگر بے خبری میں۔ حالانکہ وہاں بھینی بھینی خوشبوئیں اور تازہ ہوا کے جھونکے ہمیں چھوتے

ہیں، اور پرندوں کے چہچہے ہمارے کانوں میں رس گھولتے ہیں، مگر ہم ان سے لاعلم رہتے ہیں۔ اور اس جنت سے واپسی پر لاشعور پر مرتب وہاں کے خوشگوار اثرات کی بنا پر، یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی لاعلمی کی بدولت کوئی یہ کہہ دے کہ "آج صبح تو بڑی خوش گوار ہے، مجھے بڑا سکون محسوس ہو رہا ہے، رات میں نیند بھی بڑی اچھی آئی"

تم کو کونسی چیز خوشگوار محسوس ہو رہی ہے؟ اچھی نیند کے دوران کونسی اچھی بات پیش آئی؟ یہ صرف سو جانے کا نتیجہ تو نہیں! یقیناً آپ نیند میں کہیں اور تھے، کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ مگر صبح آپ کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا، بس اچھا محسوس کرنے کا ایک ناقابلِ تشریح احساس موجود رہتا ہے۔ رات میں گہری نیند سونے والا صبح تازہ دم اٹھتا ہے۔ جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نیند کی بے خبری انسان کے لیے نئی توانائی فراہم کرنے کا باعث بنتی ہے، مگر وہ خود اس عمل سے لاعلم ہوتا ہے۔

اگر کوئی انسان رات میں گہری نیند نہیں سو سکتا تو وہ صبح اٹھنے پر خود کو اس سے زیادہ تھکا ہوا اور بوجھل محسوس کرے گا جتنا وہ گذشتہ رات تھا۔ اور اگر لگاتار چند دن تک کوئی ٹھیک سے سو نہ سکے تو اس کا بچنا آسان نہیں، کیونکہ زندگی کے سوتوں سے اس کا رابطہ قائم نہ ہو سکنے کی بنا پر وہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکے گا جہاں تک جانا اس کے لیے ضروری ہے۔

دنیا میں انتہائی سزا موت نہیں ہے۔ کیونکہ موت سزا کے طور پر تو بہت آسان ہے...... یہ لمحوں میں آ لیتی ہے۔ کسی کو سونے نہ دینا دنیا میں بدترین سزا ہے۔ یہاں تک کہ آج کے دور میں ایسے ممالک ہیں جہاں قیدیوں کو سونے نہیں دیا جاتا۔ اگر کسی کو لگاتار پندرہ دن تک سونے نہ دیا جائے تو اس کی اذیت کو تصور میں لانا بھی ممکن نہیں...... وہ تقریباً پاگل ہو چکا ہوگا۔ وہ ایسی ساری معلومات اگل دے گا جو دوسری صورت میں وہ اپنے کسی دشمن کو بتانا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر بڑبڑانا شروع کر دے گا۔

چین میں اصولی طریقۂ کار سے انحراف کیا جاتا ہے۔ قیدیوں کو چھ مہینے تک سونے نہیں دیا جاتا، نتیجے کے طور پر وہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ کون ہیں، ان کا نام کیا ہے، وہ کس مذہب کے پیرو ہیں، وہ کس شہر یا قصبے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا ملک کونسا ہے...... وہ ہر بات بھول جاتے ہیں۔ بے خوابی کی وجہ سے ان کے ہوش و حواس بالکل جاتے رہتے ہیں۔

ان پر مکمل بے فراموشی چھا جاتی ہے۔اس حالت میں ان کو کچھ بھی باور کرایا جا سکتا ہے۔

کوریا میں پکڑے جانے والے امریکی قیدی جب روس اور چین سے رہا ہو کر آئے تو نیند سے دور رہنے کی بنا پر ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ مکمل طور پر امریکہ کے مخالف اور کمیونزم کے حامی ہو چکے تھے۔ پہلے ان فوجیوں کو سونے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی' پھر جب ان کی ذہنی حالت ابتر ہو جاتی تو ان کے ذہن میں کمیونزم کی خوبیاں ٹھونسی جاتی تھیں۔ بار بار کی ترغیبات کے ذریعے جب ان کی یادداشت گم ہو جاتی تھی تو ان کو بتایا جاتا تھا کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔ اس لیے رہائی سے پہلے ان کی شخصیت تبدیل ہو جاتی تھی۔ان فوجیوں کو دیکھ کر امریکی ماہرینِ نفسیات گنگ ہو گئے۔

جب ایک انسان کو سونے نہیں دیا جاتا تو وہ زندگی کے دھارے سے کٹ جاتا ہے۔ جب تک انسان کی زندگی میں بے خوابی بڑھتی جائے گی تب تک لامذہبیت کو فروغ ملتا رہے گا۔ جن ملکوں کے لوگ نیند میں چوکنا رہتے ہیں وہاں خصوصیت کے ساتھ لامذہبیت کو عروج حاصل ہوتا رہے گا اور جہاں کے لوگ گہری نیند سوتے ہیں وہاں مذہبی نظریات بھی اسی تناسب سے بڑھتے رہیں گے۔ مگر لامذہبیت اور مذہبیت دونوں نظریات انسان کے لیے قطعی غیر معروف ہیں کیونکہ یہ لاشعوری طور پر پنپتے ہیں۔ جو شخص پچھلی رات گہری نیند سویا ہو گا وہ اگلا دن پرسکون گذارے گا۔ جبکہ بے آرامی میں رات گذارنے والا اگلے دن بے چین اور مضطرب رہے گا۔ بے سکون اور مضطرب دماغ خدا کی آماجگاہ کیسے بن سکتا ہے؟ منتشر الخیال' غیر مطمئن' اور غصیلا دماغ' خدا کو تسلیم نہیں کرتا' اس کے وجود کا منکر ہو جاتا ہے۔

مغرب میں لامذہبیت کی بنیادوں میں سائنس نہیں بلکہ کم خوابی' بے سکونی اور بے آرامی ہے۔ صرف نیویارک میں تیس فیصد لوگ مسکن دواؤں کے بغیر سو نہیں سکتے ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ اگر یہی حالات جاری رہے تو آئندہ سو سال میں خواب آور دواؤں کے بغیر شاید کوئی بھی نہیں سو سکے گا۔

لوگ سونے کی اہلیت کھو چکے ہیں۔ جو شخص یہ اہلیت کھو بیٹھے گا وہ آپ سے سوال کر سکتا ہے کہ "آپ کیسے سو جاتے ہیں؟" آپ کا جواب ہو گا" میں تو صرف تکیے پر سر رکھتا ہوں اور نیند مجھے آ لیتی ہے" وہ آپ کا یقین نہیں کرے گا' کیونکہ وہ اس کو امرِ محال سمجھتا ہے' اس کو شبہ ہو جائے گا

کہ آپ اس سلسلے میں کوئی ایسی ترکیب جانتے ہیں جو وہ نہیں جانتا...... کیونکہ تکیے پر سر تو وہ بھی رکھتا ہے مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

خدا معاف کرے...... مگر ہزار' دو ہزار سال میں ایک وقت ایسا ضرور آنے والا ہے جب ہر انسان قدرتی نیند سے محروم ہو جائے گا اور لوگ اس بات پر یقین نہیں کریں گے کہ ہزار' دو ہزار سال پہلے کا انسان تکیے پر سر رکھتا تھا اور اس کو نیند آ لیتی تھی۔ اس بات کو وہ بناوٹی اور دیومالائی کہانیوں کا حصہ سمجھیں گے۔ اس بات کو وہ ہرگز سچ نہیں مانیں گے اور کہیں گے "یہ ممکن ہی نہیں؛ کیونکہ جب اس کا اطلاق ہمارے اوپر نہیں ہوتا تو کسی دوسرے پر کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں آپ کو اس طرف اس لیے متوجہ کر رہا ہوں کہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے کے لوگ آنکھیں موند کر اتنی ہی آسانی کے ساتھ ارتکاز میں چلے جاتے تھے جتنی آسانی کے ساتھ آج آپ سو جاتے ہیں۔ آج سے دو ہزار سال بعد نیویارک میں سونا ممکن نہیں رہے گا...... گو کہ آج بھی آسان نہیں ہے۔ بمبئی میں بھی سونا محال ہوتا جا رہا ہے اور...... کچھ ہی وقت کی بات ہے کہ دوارکا میں بھی مشکل ہو جائے گا۔ آج اس بات پر بمشکل یقین کیا جائے گا کہ ایک وقت تھا جب لوگ آنکھیں بند کرتے ہی محویت میں گم ہو جاتے تھے کیونکہ آج جب آپ آنکھیں بند کر کے بیٹھتے ہیں تو...... اپنے اندرونِ ذات میں کہیں نہیں پہنچتے خیالات کی یلغار شروع ہو جاتی ہے اور آپ جہاں ہیں وہیں رہ جاتے ہیں۔

ماضی میں ان لوگوں کے لیے؛ جو فطرت کے نزدیک تھے؛ ارتکاز اتنا آسان تھا جتنا آج فطرت کے نزدیک رہنے والوں کے لیے نیند...... اب نیند ہم سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جو چیزیں شعوری حالت میں ہوتی ہیں وہ پہلے گم ہوتی ہیں' اس کے بعد' وہ جو غیر شعوری حالت میں ہوتی ہیں۔ محویت چھن جانے کی وجہ سے دنیا میں لامذہبیت پھیلتی جا رہی ہے۔ اور جب نیند چھن جائے گی تو مکمل لامذہبیت کا دور دورہ ہو جائے گا۔ نیند سے محروم دنیا میں مذہب کے لیے کوئی امید باقی نہیں۔

آپ شاید یقین نہ کریں کہ ہمارا نیند سے کتنا نزدیکی اور کتنا گہرا رشتہ ہے۔ وہ شخص اپنی زندگی کیسے گذارے گا جس کے پیشِ نظر سب سے بڑا مسئلہ نیند ہو؟ اگر وہ ٹھیک طرح سو نہیں سکے گا تو اس کی پوری زندگی ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ جائے گی۔ وہ تمام رشتے ناطوں سے بے تعلق ہو

جائے گا' اس کو ہر چیز زہر لگنے لگے گی' بات بات میں غصہ بھر آئے گا۔ اور جو شخص خوب گہری نیند سوتا ہے اس کی زندگی میں شگفتگی ہوگی...... امن اور مسرت اس کی زندگی میں موجزن ہوگی' اس کی رشتہ داریوں میں' اس کی محبت میں' ہر چیز میں سکون و اطمینان شامل ہوگا۔ اور اگر وہ نیند سے محروم ہوجائے گا تو اس کے تمام رشتے ناطے ہوا میں تحلیل ہوجائیں گے۔ اس کے خاندانی معاملات الجھ جائیں گے' اس کے بیوی بچے' ماں باپ' استاد شاگرد سب سے فاصلے پیدا ہوجائیں گے۔ نیند ہمیں بے ہوشی کی حالت میں اس نکتے تک لے جاتی ہے جہاں ایک مختصر وقت کے لیے ہی سہی' ہم خدا سے مل جاتے ہیں۔ ایک مکمل صحتمند انسان بھی اپنی رات کے آٹھ گھنٹوں کی نیند میں اتنی گہرائی تک بمشکل دس منٹ تک ہی رہ پاتا ہے۔ ان دس منٹوں کی نیند کے دوران وہ مکمل طور پر کھو جاتا ہے' یہاں تک کہ اس کے پاس کسی خواب کا گذر بھی نہیں ہوپاتا۔

نیند کا دورانیہ صرف وہاں تک ہی نہیں ہوتا جہاں تک ہم خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم نیند اور بیداری کے مابین چکر لگا رہے ہوتے ہیں۔ حالتِ خواب میں ہم آدھے جاگے اور آدھے سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ خواب میں ہونے کا مطلب ہے کہ آنکھیں بند ہوں لیکن آپ سوئے ہوئے نہ ہوں' خارجی اثرات آپ کو متاثر کر رہے ہوں۔ جن لوگوں سے آپ دن میں مل چکے ہوتے ہیں خواب میں ان سے ملاقات جاری رہتی ہے۔ نیند اور بیداری کے بیچ کے دورانئے میں خواب وہ جگہ پُر کرتے ہیں۔ ایسے کتنے ہی لوگ ہیں جو اپنی نیندیں گنوا چکے ہیں...... وہ نیند سے محروم صرف خواب کی حالت میں رہتے ہیں۔ اور ان کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ رات بھر وہ خواب میں کیا دیکھتے رہے' بہرحال یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ امریکہ میں نیند پر بہت تحقیق ہورہی ہے پچھلے دس سال سے تقریباً دس بڑی لیبارٹریاں ہزاروں افراد پر مختلف تجربات میں مصروف ہیں۔

امریکہ میں نیند سے محروم ہونے کی وجہ سے لوگوں کا رجحان اب استغراق کی طرف ہورہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاید اس عمل سے ان کی نیند لوٹ آئے' اور ان کی زندگی میں سکون در آئے۔ وہ ارتکاز کو خواب آور دوا سمجھتے ہیں۔ جب وِوک آنند نے پہلی بار امریکہ میں ارتکاز کو متعارف کرایا تو ایک معالج نے آکر ان سے کہا" میں آپ کے استغراق کے طریقے سے بہت متاثر ہوا یہ حقیقت میں غیر کیمیائی خواب آور ہے۔ اس میں کسی دوا کا کوئی عمل دخل نہیں پھر بھی یہ نیند لے آتا ہے...... یہ حیرت انگیز ہے۔ یہ صرف یوگی نہیں جو امریکہ میں مقبولیت حاصل کر رہے

ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ نیند سے محرومی ہے۔ ان کی نیند سے محرومی نے ان کی زندگی کو بوجھل کر کے ان کے ذہنی دباؤ اور الجھنوں میں اضافہ کردیا ہے۔ اس لیے امریکہ میں کسی نہ کسی طرح نیند لانے کے لیے خواب آور دواؤں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔

دنیا میں ہر سال' خواب آور ادویات پر لاکھوں ڈالر خرچ کیے جارہے ہیں۔ دس بڑی لیبارٹریاں ایسے لوگوں پر تحقیق کر رہی ہیں جو راتوں کو بےچینی اور کرب میں کروٹیں بدلتے ہیں۔ ہمہ اقسام الیکٹراڈ اور تاریں ان کے جسم کے ساتھ لگا کر ہر زاویئے سے ان کا معائنہ کیا جاتا ہے کہ ان کے اندر کیا تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔

ان تجربات کے نتیجے میں ایک نہایت قیمتی انکشاف ہوا ہے کہ لوگ عموماً تمام رات خواب دیکھتے ہیں۔ جبکہ جاگنے پر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے خواب دیکھا ہے اور کچھ لوگ اس سے لاعلم ہوتے ہیں۔ مگر اصل میں وہ سب ہی خواب دیکھتے رہے ہیں' فرق صرف یہ تھا کہ جن کے حافظے اچھے تھے ان کو خواب یاد رہ جاتے تھے اور کمزور یادداشت والے اپنے خواب یاد نہیں رکھ سکتے تھے۔ بہرحال یہ بھی پتہ چلا کہ جو لوگ مکمل طور پر صحتمند تھے وہ دس منٹ کے لیے گہری اور خوابوں سے عاری نیند میں غرق ہوجاتے تھے۔

مشینوں کے ذریعے خوابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ خواب کی حالت میں ہمارے دماغ کی شریانیں متحرک رہتی ہیں' اور جیسے ہی خواب موقوف ہوجاتا ہے وہ شریانیں بھی ساکت ہوجاتی ہیں اور مشین بتادیتی ہے کہ خواب میں وقفہ آگیا ہے۔ وقفہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس دوران وہ شخص نہ تو خواب دیکھ رہا تھا نہ کچھ سوچ رہا تھا...... بس وہ کہیں لاپتہ ہوگیا تھا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جب انسان محوِ خواب ہوتا ہے تو مشینیں اس کے اندر کی حرکات کو محفوظ کرتی رہتی ہیں۔ مگر جب وہ گہری نیند میں چلا جاتا ہے تو مشین اس دوران کچھ پتہ نہیں چلا پاتی کہ وہ کہاں ہے اور کن مراحل سے گذر رہا ہے۔ لہٰذا خواب سے خالی نیند کا مطلب ہے مشین کی پہنچ سے دور ہوجانا۔ اور اسی وقفہ کے دوران انسان لامحدودیت کے سمندر میں داخل ہوجاتا ہے۔

مشین اس وقفہ کے دوران کی مصروفیات دریافت کرنے سے قاصر ہے۔ یہ صرف اسی وقت تک دماغ کی سرگرمیوں سے واقف ہوسکتی ہے جب تک انسان خواب دیکھنے میں محو ہوتا

ہے۔ پھر جب وقفہ آ جاتا ہے تو انسان کہیں پنہائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ پھر دس منٹ کے بعد مشین دوبارہ حرکت پذیری کی نشاندہی کرتی ہے۔ تاحال یہ دریافت نہیں کیا جاسکا ہے کہ ان دس منٹوں کے درمیان انسان کہاں نکل جاتا ہے۔ امریکی ماہرین نفسیات اس وقفہ کے بارے میں بہت متجسس ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ وہ نیند کو ایک بہت پیچیدہ اسرار تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بعد نیند ہی سب سے بڑا اسرار ہے...... اس کے علاوہ کوئی نہیں۔

آپ روزانہ ہی سوتے ہیں اس کے باوجود نہیں جانتے کہ نیند کیا ہے؟ ایک شخص تمام زندگی سوتا ہے اور کوئی فرق رونما نہیں ہوتا...... وہ نیند کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نیند کے بارے میں کچھ نہ جاننے کا سبب یہ ہے کہ جب نیند طاری ہوتی ہے تو انسان خود کہیں نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے کہ آپ اسی وقت تک ہیں جب تک نیند نہیں ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں آپ بھی اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ مشین جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقفہ کے درمیانی عرصے میں مشین خاموش ہو جاتی ہے اور نہیں جانتی کہ انسان کہاں منتقل ہو گیا؟ اُس مقام سے چونکہ آپ بھی ناواقف ہیں اس لیے آپ بھی وہاں نہیں جاسکتے کیونکہ اس اعتبار سے آپ بھی اس مشین جیسے ہی ہیں۔

چونکہ آپ خود بھی اس وقفہ کی حقیقت نہیں جانتے اس لیے نیند بدستور ایک اسرار اور آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیند کے دوران آپ اپنی 'میں' سے نکل جاتے ہیں' لہٰذا 'انا' کو پھیلنے کا موقعہ مل جاتا ہے' جس کے نتیجے میں نیند کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک انا پرست انسان چوبیس گھنٹے انا کے حصار میں قید ہونے کی وجہ سے نیند کا استحقاق کھو بیٹھتا ہے۔ یہی 'میں' جو ہر وقت چلتے پھرتے اس کے ساتھ رہتی ہے اس کو جگائے رکھنے کا باعث بنتی ہے۔ انسان کی انا دن کے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ اس طرح رہتی ہے کہ نیند کے غلبے میں جب اس 'میں' سے چھٹکارا پانے کا وقت آتا ہے تو بھی اس سے نجات پانا ممکن نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں نیند کیسے آسکتی ہے۔ جب تک یہ 'میں' موجود ہوگی نیند آنا ممکن نہیں۔ اور جیسا میں نے آپ کو کل بتایا کہ جب تک آپ کی انا بیدار ہے' آپ لامحدودیت میں داخل نہیں ہو سکتے۔

سو جانا یا لامحدود پنہائیوں میں گم ہو جانا ایک ہی صورت کے دو نام ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ نیند کے ذریعے ہم آگہی کے بغیر خدا کے مصداق ہو جاتے ہیں جبکہ استغراق کے ذریعے ہم اپنے حواس میں رہتے ہوئے یہ مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہ کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔ آپ

نیند کے ذریعے اپنی ہزاروں زندگیوں میں خدا کے نزدیک ہو بھی جائیں تو آپ کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکے گی۔ لیکن اگر آپ ایک لمحے کے لیے بھی محوِ استغراق ہو جاتے ہیں تو آپ عین اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں جہاں آپ اپنی ہزاروں لاکھوں زندگیوں میں گہری نیند کے دوران پہنچتے رہے ہیں...... مگر ہمیشہ بے ہوشی کے عالم میں...... یہ تجربہ آپ کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دے گا۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص ایک مرتبہ استغراق میں محو ہو جاتا ہے تو فوراً ہی اس خلا میں داخل ہو جاتا ہے جس میں وہ گہری نیند کے دوران ہوتا ہے...... اور اس صورت میں وہ پوری طرح ہوش و حواس میں رہتا ہے' خواہ وہ سویا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ کرشن جی گیتا میں کہتے ہیں کہ جب تمام لوگ سو جاتے ہیں تب بھی یوگی جاگتا رہتا ہے...... اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کبھی سوتا ہی نہیں۔ دراصل اس انداز میں کوئی نہیں سوتا جس میں یوگی سوتا ہے۔ لیکن انتہائی گہری نیند میں بھی اس کا وہ حصہ جاگتا رہتا ہے جو عالمِ استغراق میں ہے۔ اور ہر رات یوگی اسی کیفیت میں سوتا رہتا ہے۔ اور اس کے لیے سونا اور جاگنا برابر ہوتا ہے۔ دونوں کیفیتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر عالمِ استغراق میں کوئی اپنے اندرونِ ذات میں پہنچ جاتا ہے تو وہ نیند کے دوران بھی کبھی بے خبر نہیں ہوتا۔

آنند گوتم بدھ کے ساتھ کئی سال رہا۔ اور بدھ کے برابر میں سویا۔ ایک صبح اس نے بدھ سے کہا "میں کئی سال سے آپ کو سوتا ہوا دیکھ رہا ہوں مگر کبھی آپ کو کروٹ بدلتے نہیں دیکھا' آپ پوری رات ایک ہی کروٹ سے سوتے رہتے ہو۔ صبح تک آپ کے بازو اسی حالت میں ہوتے ہیں جس حالت میں آپ کے لیٹتے وقت ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہوتی۔ میں کئی بار رات میں اٹھ کر یہ دیکھا کرتا تھا کہ آیا کوئی حرکت ہوئی۔ میں نے کئی بار پوری رات آپ کو دیکھنے میں گذاریں...... آپ کے ہاتھ...... آپ کے پاؤں کو اسی حالت میں پایا' آپ کبھی کروٹ نہیں بدلتے۔ کیا آپ اپنی نیند کو کسی ضابطے کا پابند رکھتے ہیں؟

"مجھے اپنی نیند کو ضابطوں میں قید کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی' میں چوکنا ہو کر سوتا ہوں' اس لیے مجھے کروٹ لینے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اگر چاہوں تو کروٹ لے بھی سکتا ہوں' کروٹیں بدلتے رہنا نیند کی ضروریات میں سے نہیں ہے' یہ بے آرام اور بے سکون

ذہن کی ضرورت ہے" بدھ نے جواب دیا۔ ایک منتشر دماغ ایک رات کے دوران بھی کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔ دن کے اوقات میں اس کو تنہا چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ رات میں سونے کے دوران بھی اس کا جسم بے آرامی کا مظاہرہ کرتا رہے گا۔

آپ کسی شخص کا رات میں سونے کے دوران مشاہدہ کریں، وہ آپ کو تمام رات بے چین دکھائی دیگا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ نیند میں بھی اپنے ہاتھوں کو اسی انداز میں حرکت دے رہا ہوگا جس طرح وہ دن میں جاگنے کے دوران دیتا ہے' خواب دیکھنے کے دوران وہ آپ کو دوڑتا اور اسٹیم انجن کی طرح تیز تیز سانس لیتا ہوا دکھائی دے گا' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ تھکا ہوا محسوس ہوگا۔ راتوں کو، اپنے خوابوں کے دوران وہ اسی طرح لڑتا ہوا دکھائی دیگا جس طرح وہ دن میں ایسا کرتا ہے۔ وہ رات میں بھی اتنا ہی غصیلا ہوگا جتنا دن میں۔ وہ دن کے وقت جس پریشانی میں مبتلا تھا' رات میں بھی اسی پریشانی میں رہے گا۔ ایسے انسان کے شب و روز میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ رات کے وقت وہ تھک کر لیٹ جاتا ہے...... حواس سے بیگانہ ......لیکن اس کے دیگر اعضاء حسبِ معمول کام کرتے رہیں گے۔ اس لیے گوتم بدھ نے کہا کہ: اگر میں چاہوں تو کروٹ بدل سکتا ہوں' لیکن مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

مگر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے ...... کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی شخص مسلسل اپنی ٹانگیں حرکت میں رکھتا ہے' ان کا حرکت میں رہنا اس وقت تو سمجھ میں آ سکتا ہے جب کوئی چل پھر رہا ہو' مگر جیسے ہی آپ اس کو ٹوک دیں گے' ان کی حرکت بند ہو جائے گی۔ اس کے بعد ایک لمحے کے لیے وہ بالکل بے حس و حرکت ہو جائے گا' مگر وہ اس بات کی توجیہ نہیں کر سکے گا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بے سکونی پورے جسم کو احتجاج پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جسم کے اندر مستقل مصروف دماغ ایک لمحے کے لیے بھی ایک حالت میں نہیں رہتا' یہ پورے جسم کو ہر وقت حرکت میں رکھتا ہے' سر اور ٹانگیں ہلتی رہیں گی' یہاں تک کہ اگر کوئی بیٹھا ہوا ہو تو وہ پہلو بدلتا رہے گا۔ اسی کی وجہ ہے کہ استغراق کے لیے آپ دس منٹ بھی بمشکل سکون سے بیٹھ پاتے ہیں۔ اور آپ کا جسم ہر زاویے سے آپ کو حرکت میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہم اگر استغراق میں چوکنے ہو کر بیٹھیں گے تو جسم کی اس کوشش سے مغلوب ہوتے رہیں گے۔ ہم کو تب پتہ چلے گا کہ ہمارا جسم کتنا بے چین ہے' یہ ایک لمحے کے لیے بھی ایک حالت میں قائم رہنا پسند نہیں

کرتا۔ دماغ کا تناؤ' الجھنیں اور تجسس پورے جسم کو ہلائے رکھتے ہیں۔

گہری نیند میں' تقریباً دس منٹ تک ہر شے مفقود ہو جاتی ہے' مگر ایسے دس منٹ صرف انہی کو نصیب ہوتے ہیں جو مکمل طور پر صحتمند ہوں' ہر ایک کو نہیں۔ دوسرے لوگوں کو ایسی نیند ایک سے پانچ منٹ تک ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر لوگ اتنی گہری نیند کا مزہ صرف ایک یا دو منٹ تک ہی لے پاتے ہیں۔ وہ تھوڑا سا سرور جو ہمیں محض ایک منٹ کے لیے منبعِ حیات تک پہنچنے سے حاصل ہوتا ہے وہ آئندہ چوبیس گھنٹے کے لیے ہماری زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہماری آگہی کا چراغ اس ایک لمحے میں جتنا جوہر کشید کر پاتا ہے وہ ہم آنے والے چوبیس گھنٹوں تک استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کی زندگی کا چراغ اسی حاصل شدہ تیل سے جلتا رہتا ہے۔ چراغ کی مدھم لو اس بات کی علامت ہے کہ اس کو ایک دم بہت سا تیل دستیاب نہیں ہو پاتا جس سے وہ روشن مشعل کی طرح نہیں جل سکتا۔

استغراق آپ کو بتدریج منبعِ حیات کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں آپ زندگی کی روانی کے لیے معتد بہ ایندھن حاصل نہیں کر پاتے ہیں' مگر خود اس منبع میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ اس چراغ میں بہت سا تیل انڈیل لیں' کیونکہ تیل کا پورا سمندر اب آپ کی تحویل میں ہے اور آپ کی زندگی براہِ راست اس سمندر سے فیضیاب ہو رہی ہے کس قسم کی زندگی؟ ...... جس میں آپ کی نیند غائب ہو جائے گی ...... ان معنوں میں نہیں کہ آپ سو ہی نہ سکیں۔ مگر ایسے کہ آپ خود تو سو رہے ہوں لیکن اندرونِ ذات کوئی ہوشیار رہے۔ اس حالت میں خواب گم ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایک یوگی جاگتا رہتا ہے' وہ سوتا تو ضرور ہے لیکن خوابوں سے دور ...... اس کے خواب مکمل طور پر لاپتہ ہو جاتے ہیں۔ جب ہم خوابوں سے دور ہو جاتے ہیں ...... ہمارے خیالات معدوم ہو جاتے ہیں' تب ہمیں ادراک ہوتا ہے کہ ہماری بیداری کی حالت کے خیالات' نیند کی حالت میں ہمارے خواب بن جاتے ہیں۔ خیالات اور خواب کے مابین بہت خفیف سا فرق ہے ...... خیالات قدرے مہذب خواب ہیں جب کہ خواب ابھی غیر مہذب ہیں۔ بہر حال دونوں میں سے ایک اصل خواب ہے۔

بچے یا ابتدائی دور کے غیر مہذب قبیلے صرف تصویروں کے ذریعے چیزوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں' الفاظ کے ذریعے نہیں۔ انسان کے ابتدائی خیالات تصویری خاکوں کی شکل

میں ابھرتے ہیں۔اس کی مثال یوں ہے کہ جب بچے کو بھوک لگتی ہے تو وہ لفظوں کی شکل میں یوں نہیں سوچتا کہ " مجھے بھوک لگی ہے" وہ تو چشمِ تصور میں ماں کی چھاتیاں دیکھے گا' اور خود کو انہیں چوستا ہوا پائے گا۔اس کے اندر اپنی ماں کی چھاتیوں تک پہنچنے کی شدید خواہش پیدا ہوگی' لیکن اس کیفیت کے لیے وہ الفاظ کا سہارا نہیں لے سکتا۔الفاظ کا سہارا بہت بعد میں حاصل ہوتا ہے' پہلے تصویری خاکے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔

جب ہم کسی خاص زبان سے واقف نہیں ہوتے تو اپنے مطمحِ نظر کے اظہار کے لیے تصویروں کا سہارا لیتے ہیں۔اگر آپ کسی غیر ملک میں گئے ہوں جہاں کی زبان آپ نہیں جانتے اور آپ کو پیاس لگی ہے تو آپ اپنی ہتھیلیوں کا پیالہ بنا کر بتائیں گے جس سے وہاں کے لوگ سمجھ سکیں گے کہ آپ پانی پینا چاہتے ہیں۔الفاظ کی غیر موجودگی یا ان سے عدم واقفیت کی صورت میں تصویروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔اس میں دلچسپی کا پہلو یہ ہے کہ الفاظ کی زبانیں تو مختلف جگہوں پر مختلف ہیں لیکن تصویروں کی زبان بین الاقوامی ہے...... کیونکہ ہر آدمی کی تصویری زبان ایک ہی ہے۔ہم نے لاتعداد الفاظ وضع کیے ہیں مگر تصویریں ہماری ایجاد نہیں ہیں۔تصویری زبان انسانی دماغ کے لیے پوری دنیا میں ایک ہی ہے۔لہٰذا ایک مصور کی تخلیق پوری دنیا میں سمجھی جاتی ہے۔کھاجوراہو کے مجسمے یا لیونارڈو کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے آپ کو اپنی زبان تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔کھاجوراہو کے مجسمے کو چینی' فرانسیسی یا جرمن بھی اسی طرح سمجھے گا جس طرح آپ اس کو سمجھتے ہیں۔اور اگر آپ فرانس میں لوور کے عجائب گھر جائیں گے تو وہاں کی تصاویر کو سمجھنے میں آپ کو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔آپ کو ان کے عنوانات سمجھنے میں البتہ مشکل محسوس ہوسکتی ہے...... اس لیے کہ وہ فرانسیسی زبان میں ہوں گے...... مگر تصویروں کو سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں ہوگی۔تصویری زبان ہر ایک کی زبان ہے۔

ایک بات اور!...... الفاظ کی زبان دن کے اوقات میں موثر ہے...... رات کے وقت نہیں...... کیونکہ ہم رات کے وقت دوبارہ غیر مہذب ہوجاتے ہیں۔ہم نیند میں گم ہوجاتے ہیں۔اپنی ڈگریاں' یونیورسٹی کی اسناد سب گم کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کبھی ابتدائی انسان کھڑا تھا۔یوں رات کے وقت تصویریں ابھرتی ہیں' اور الفاظ دن کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔دن کے وقت پیار کے اظہار کے لیے ہم الفاظ کا سہارا لیتے ہیں لیکن رات کے وقت نہیں۔

خیالات کو ہم خوابوں کی طرح زندہ اور چلتی پھرتی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔خواب میں ہم ہر چیز کو اپنے سامنے پھیلا ہوا دیکھتے ہیں۔ہم کوئی ناول پڑھ کر اس سے اتنا لطف اندوز نہیں ہوسکتے جتنا اس پر مبنی فلم دیکھ کر ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہی ہے کہ ناول الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ فلم تصویروں پر مبنی ہوتی ہے۔بالکل اسی طرح یہاں موجودگی اور میری باتیں سننے سے آپ کو جو استفادہ ہوسکتا ہے وہ ٹیپ ریکارڈر پر یہ سب سننے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔کیونکہ یہاں سب کچھ تصویری مناظر پر مشتمل ہے اور ٹیپ پر صرف الفاظ۔عکسی زبان ہمارے لیے فطری ہے۔رات کے وقت الفاظ تصاویر کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔

جس دن خواب معدوم ہوجاتے ہیں...... اس دن خیالات بھی معدوم ہوجاتے ہیں جس دن خیالات معدوم ہوجاتے ہیں اس دن خواب بھی معدوم ہوجاتے ہیں۔جو دن خیالات سے خالی ہوگا اس رات خواب نہیں دکھائی دیں گے۔یاد رکھیں کہ خواب آپ کی نیند میں رکاوٹ ہوتے ہیں اور خیالات آپ کو بیدار نہیں رہنے دیتے۔دونوں باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیجیے: خواب آپ کو سونے نہیں دیتے اور خیالات آپ کو جاگنے نہیں دیتے۔اگر خواب ختم تو نیند بھی ختم' اگر خیالات ختم تو بیداری بھی ختم۔جب بیداری اور نیند دونوں ختم ہوں گے تو دونوں کے مابین کیا فرق رہ جائے گا؟ محض اتنا کہ آنکھیں کھلی ہیں یا بند ہیں' اور جسم کام میں ہے یا آرام میں۔جو شخص مکمل بیدار رہتا ہے وہ مکمل سوتا بھی ہے اور دونوں صورتوں میں اس کی شعوری کیفیات یکساں رہتی ہیں۔شعور تبدیل نہیں ہوتا' صرف جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔جاگ رہا ہے تو مصروفِ عمل ہے...... سو رہا ہے تو آرام کر رہا ہے۔

جس دوست نے یہ پوچھا ہے کہ نیند کے ذریعے خدا تک رسائی کیوں نہیں ہوسکتی؟ ان کے لیے میرا جواب ہے: "اس حالت میں بھی اس تک رسائی ممکن ہے اگر آپ نیند کے دوران بھی جاگے رہ سکیں۔میرا استغراق کا طریقہ بھی نیند کا ہی طریقہ ہے...... نیند میں جاگے رہنے کا طریقہ۔نیند طاری ہوتے وقت اپنے ہوش میں رہنے کا طریقہ۔اور اسی وجہ سے میں آپ کو اپنا جسم ڈھیلا چھوڑنے کے لیے کہتا ہوں...... اپنی سانسیں پرسکون رکھنے کے لیے کہتا ہوں...... خیالات کو خاموش رکھنے کی تاکید کرتا ہوں۔یہ سب کچھ نیند میں کھو جانے کی تیاریاں ہیں۔اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض احباب اس دوران سو بھی جاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نیند کے لیے تو کیا جاتا

ہے۔اور اس تیاری کے دوران ان کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب سوجاتے ہیں۔اسی لیے میں تیسری ہدایت ایک بار پھر دہراتا ہوں: "اندرونی طور پر جاگے رہئے؛ چوکنے رہئے؛ جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیجیے؛ سانس کو مکمل آزاد چھوڑ دیجیے؛ اس سے بھی زیادہ آزاد جتنا کہ وہ نیند کے دوران رہتا ہے۔مگر اندر سے جاگے رہئے؛ اپنے اندر آگہی کا چراغ روشن رکھئے تو آپ نیند کی گرفت میں نہیں آئیں گے۔

استغراق اور نیند کی ابتدائی حالتیں کم وبیش یکساں ہوتی ہیں۔البتہ آخر میں ایک نمایاں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ابتدائی حالت میں جسم ڈھیلا ہونا چاہئے' اگر آپ بے خوابی میں مبتلا ہیں تو آپ کا ڈاکٹر سب سے پہلے آپ کو پرسکون ہونے کے لیے کہے گا۔وہ آپ کو وہی سب کہے گا جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں: "اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیجئے؛ جسم پر سے تناؤ بالکل ختم کردیجیے؛ جسم کو روئی کے گالے کی طرح نرم کرلیں۔کبھی آپ نے کسی کتے یا بلی کو سوتے دیکھا ہے؟ وہ بالکل بے خبر سوتے ہیں جیسے ہیں ہی نہیں۔کسی چھوٹے بچے کو نیند کی حالت میں دیکھا ہے؟ اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوتا۔اس کے ہاتھ اور پیر ناقابلِ یقین حد تک ڈھیلے ہوتے ہیں۔ایک جوان اور بوڑھے کو دیکھئے ...... دونوں میں آپ کو تناؤ اور دباؤ محسوس ہوگا۔لہٰذا ڈاکٹر آپ کو مکمل پرسکون رہنے کے لیے کہتا ہے۔

یہی شرائط نیند پر بھی لاگو ہوتی ہیں...... سانسیں پرسکون ہوں ...... گہری اور آہستہ۔
آپ نے یقیناً دیکھا ہوگا کہ جاگنگ کے دوران سانس تیز تیز چلنے لگتا ہے۔جب جسم کام میں مصروف ہوتا ہے تو سانس تیز چلتا ہے اور خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔نیند کے لیے ضروری ہے کہ خون کا دباؤ معمول سے کم ہو یعنی جاگنگ کے بالکل برعکس' تب ہی سانسیں سکون پذیر ہوں گی' لہٰذا دوسری شرط یہ ہے کہ اپنی سانسوں کو پرسکون کیجیے؛

جب خیالات کا بہاؤ تیز ہوتا ہے تو دماغ کو خون کی فراہمی میں تیزی آجاتی ہے' اور ایسی حالت میں نیند آنا ناممکن ہوجاتا ہے۔نیند کی ضروریات میں سے ایک یہ ہے کہ دماغ کی طرف خون کا بہاؤ بہت آہستہ ہوجائے۔ہم تکیے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لگاتے ہیں کہ سر کی طرف خون کا بہاؤ کم ہوجائے۔تکیوں کے بغیر سر اور جسم کا لیول ایک ہوتا ہے اور خون بھی سر کے ساتھ پورے جسم میں یکساں رفتار سے دوڑتا ہے۔جب سر باقی جسم سے بلند ہوجاتا ہے تو

خون کے بلندی کی طرف بہاؤ میں کمی واقع ہوجاتی ہے' دماغ کی طرف بہاؤ کم ہوجاتا ہے باقی جسم میں خون بدستور دوڑتا رہتا ہے۔لہٰذا جیسے جیسے سونے میں دشواری پیدا ہوتی جائے گی' تکیوں کی ضرورت زیادہ ہوتی جائے گی۔خون کے بہاؤ میں کمی آتی جائے گی' دماغ سکون میں آتا جائے گا اور سونا آسان ہوجائے گا۔

خیالات کے تیز بہاؤ کے ساتھ خون کو بھی تیز دوڑنا پڑتا ہے کیونکہ خیالات کی کارکردگی کا انحصار خون کے بہاؤ پر ہے۔دماغ کی شریانیں تیزی سے مصروفِ عمل ہوجاتی ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ غصے کی حالت میں انسان کی شریانیں پھول جاتی ہیں۔اس طرح شریانوں کو اضافی خون کے لیے گذرگاہوں کو کشادہ کرنا ہوتا ہے' جب دماغ ٹھنڈا ہوتا ہے تو خون کا دباؤ بھی معمول پر آجاتا ہے۔

غصے کی حالت میں چہرہ اور آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں۔یہ اس اضافی خون کی بدولت ہوتا ہے جو شریانوں میں دوڑتا ہے۔اس حالت میں چونکہ خیالات کی رفتار تیز ہوجاتی ہے اس لیے خون کو بھی تیز رفتاری سے دوڑنا پڑتا ہے اور سانسیں بھی تیز ہوجاتی ہیں۔جب دماغ پر جنسی ہیجان کا غلبہ ہوتا ہے تو سانسیں بہت تیز ہوجاتی ہیں اور خون کی رفتار بھی بے حد بڑھ جاتی ہے۔کیونکہ خیالات حدِ اعتدال سے بہت زیادہ تیزی سے آتے ہیں اس لیے دماغ کی کارکردگی کی رفتار بھی بہت بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے دماغ کی شریانیں خون کو تیزی سے گردش دینے لگتی ہیں۔

ارتکازِ توجہ کے لیے ابتدائی ضروریات وہی ہیں جو نیند کے لیے ہوتی ہیں۔جسم کو ڈھیلا چھوڑنا...... سانسوں کو سکون دینا...... خیالات سے پیچھا چھڑانا۔اگر کچھ فرق ہے تو آخری مرحلے میں۔پہلے مرحلے میں آپ گہری نیند میں ہوتے ہیں جبکہ دوسرے مرحلے یعنی استغراق میں مکمل ہوش وحواس میں۔

اس لیے ہمارے اس دوست کا سوال اپنی جگہ بالکل درست ہے؛ نیند اور استغراق (یا سمادھی اور سُشپتی) کا آپس میں گہرا شتہ ہے۔البتہ دونوں کے مابین ایک نہایت غیر معمولی فرق ضرور ہے: ہوش اور بے ہوشی کا۔نیند بیہوشی کا نام ہے اور استغراق ہوش کا۔

ایک اور دوست جاننا چاہتے ہیں کہ: استغراق اور خودتنویمی کے مابین کیا فرق ہے؟
جاننا چاہئے کہ ان کے درمیان بھی وہی فرق ہے جو نیند اور استغراق میں ہے۔اس کو

بھی تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

نیند وہ ہے جو قدرتی طور پر آ جاتی ہے۔ اور جو نیند کوشش کر کے لائی جائے وہ خود تنویمی کہلاتی ہے۔ دونوں کے مابین یہ ایک بنیادی فرق ہے۔ لفظ ہاپنوس کے معنی نیند ہی ہیں۔ ہاپنوسس کے معنی ہیں ٹنڈرا' نیند کی حالت۔ دونوں میں سے ایک تو وہ نیند ہے جو خود بخود آ جاتی ہے' دوسری کے لیے انتظام کرنا پڑتا ہے۔ جب کسی کو نیند نہیں آ رہی ہو تو اس کے لیے اس کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص لیٹ کر مسلسل یہ سوچنا شروع کر دے کہ اسے نیند آ رہی ہے' اور اگر یہ پیغام دماغ کو وصول ہو گیا تو جسم بھی اس کی تعمیل میں ڈھیلا پڑنا شروع ہو جائے گا۔ سانسیں آہستہ ہو جائیں گی' دماغ پر بھی سکوت طاری ہو جائے گا۔

اگر نیند کے لیے سازگار حالات جسم کے اندر سے پیدا ہوں گے تو وہ فوراً ہی اس پر عمل شروع کر دے گا۔ جسم کا زمینی حقائق سے واسطہ نہیں ہوتا وہ تو بس تعمیل کرنا جانتا ہے۔ اگر آپ کو روزانہ گیارہ بجے بھوک محسوس ہوتی ہے' اور اتفاقاً آپ کی گھڑی گذشتہ رات گیارہ بجے بند ہو گئی' تو ایک نظر گھڑی پر ڈالتے ہی آپ کا معدہ اعلان کر دے گا کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ خواہ اصل میں اس وقت دن کے آٹھ ہی کیوں نہ بجے ہوں۔ ابھی گیارہ بجے نہیں ہیں...... گیارہ بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی ہیں...... لیکن جب گھڑی نے گیارہ بجا دیے تو معدہ بھوک کا اعلان کر دے گا کیونکہ وہ خودکار طریقے پر عمل کرتا ہے۔ اگر آپ سونے کے لیے بستر پر آدھی رات کے وقت دراز ہوتے ہیں' اور اتفاقاً آپ کی گھڑی دو گھنٹے آگے ہے تو جیسے ہی وہ بارہ بجنے کا اعلان کرے گی تو آپ پر غنودگی چھانا شروع ہو جائے گی' چاہے ابھی رات کے دس ہی بجے ہوں۔ جسم فوراً ہی کہہ اٹھے گا کہ بارہ بج رہے ہیں...... بستر پر جانے کا وقت ہو گیا۔

جسم بیحد فرماں بردار ہے۔ اور جسم جتنا صحتمند ہو گا اتنا ہی فرماں بردار ہو گا۔ صحتمند جسم کا مطلب ہے ایک فرماں بردار جسم۔ بیمار جسم وہ جو آپ کا حکم نہ مانے۔ آپ سونا چاہتے ہوں اور آپ کا جسم سونے سے انکار کر دے۔ آپ بھوک محسوس کر رہے ہوں مگر آپ کا جسم کھانے سے منہ پھیر لے۔ جو جسم احکامات کی تعمیل کرنے سے انکار کر دے وہ بیمار جسم ہے اور جو جسم آپ کے احکامات کی تعمیل کرے وہ صحتمند جسم ہے...... جسم ہمارے پیچھے ہمارے سائے کی طرح چلتا ہے۔ جب جسم حکم ماننے سے انکار کرتا ہے تو مشکلات پیش آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے خود

تنویمی کے ذریعے جسم کو احکامات کا پابند بنایا جاتا ہے۔

ہماری بیشتر بیماریاں مصنوعی ہیں' کم و بیش پچاس فیصد ابتلائیں جھوٹی ہوتی ہیں۔ دنیا میں بیماریاں نہیں بڑھی ہیں' ان کے بڑھنے کا سبب انسان کا روزمرہ بڑھتا ہوا علم ہے۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ بڑھا ہوا علم اور بہتر معاشی حالات بیماریوں میں کمی کا باعث ہونے چاہئیں لیکن ایسا نہیں ہوا' کیونکہ انسان میں جھوٹ بولنے کی خرابی میں بھی روزافزوں ترقی ہو رہی ہے' وہ صرف دوسروں سے ہی نہیں خود اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتا ہے' اس بنا پر وہ اپنے لیے نئی نئی بیماریاں خود تخلیق کرتا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کاروبار میں گھاٹے کا شکار ہو کر دیوالیہ ہونے کو ہے' مگر وہ خود کو دیوالیہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں جس کی وجہ سے وہ بازار میں جانے سے بھی خوف کھاتا ہے؛ اس کو معلوم ہے کہ بازار میں قرض خواہ اس کو گھیر لیں گے۔ اچانک اس کو سوجھتا ہے کہ وہ بیماری میں مبتلا ہو کر صاحبِ فراش ہو گیا ہے۔ یہ بیماری اس کے ذہن نے تخلیق کی ہے' جس سے اس کو دوہرا فائدہ ملے گا' ایک تو وہ دوسروں کو باور کرا سکے گا کہ بیماری کی وجہ سے وہ کاروبار پر پوری توجہ نہیں دے پا رہا ہے' اس بات پر اس نے خود کو تو قائل کر لیا ہے اب وہ دوسروں کو بھی قائل کر سکے گا...... یہ بیماری ناقابلِ علاج ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ قطعی بیمار نہیں ہے...... اور دوسری یہ کہ اس کا جتنا علاج کرایا جائے گا اتنا ہی وہ بیمار ہوتا جائے۔

اچھی طرح جان لیں کہ اگر آپ کے علاج میں دواؤں سے فائدہ نہیں ہوا تو ان کا مزید استعمال فضول ہو گا۔ بیماری کی وجہ کچھ اور ہے۔ اس کا دواؤں سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ دواؤں کو برا بھلا' ڈاکٹروں کو احمق سمجھیں...... جو آپ کی بیماری کے لیے صحیح دوا تجویز نہیں کر سکے...... آپ آئیورویدک علاج کرا لیں' قدرتی طریقہ علاج اختیار کر لیں ایلوپیتھی یا ہومیوپیتھی کوئی بھی طریقہ اپنا لیں...... کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ آپ کے لیے ہر ڈاکٹر بیکار ہے' کیونکہ ڈاکٹر صرف حقیقی بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ مصنوعی بیماریوں کا ان کے پاس کوئی توڑ نہیں اور مزے کی بات یہ کہ آپ خود ہی یہ بیماریاں ایجاد کرتے ہیں اور ان کو جاری بھی رکھنا چاہتے ہیں۔

خواتین کی پچاس فیصد بیماریاں قطعی جھوٹی ہوتی ہیں۔ انہوں نے بچپن سے ہی سیکھا ہوتا ہے کہ جب وہ بیمار ہوتی ہیں تو ان پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے' ورنہ نہیں۔ جب بیوی بیمار ہوتی ہے

تو شوہر اپنے کام میں سے وقت نکال کر اس کے بستر کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ایسا کرنا خواہ اس کی طبیعت کے خلاف ہو، مگر اس کو کرنا پڑتا ہے۔لہٰذا جب کسی عورت کو اپنے شوہر کی توجہ درکار ہوتی ہے تو وہ فوراً بیمار پڑ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عورتوں کو عموماً بیماری میں مبتلا ہی دیکھا جاتا ہے۔ان کو معلوم ہے کہ بیمار ہونے سے گھر پر مکمل کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے۔

بیمار انسان ایک آمر ...... ایک جارح کے مثل ہوتا ہے۔ایسا انسان اگر کہدے کہ ریڈیو بند کر دو تو اس کو فوراً بند کر دیا جاتا ہے۔اگر وہ کہے کہ لائٹیں بند کر دو اور سو جاؤ' یا سب لوگ گھر میں رہیں' کسی کو باہر جانے کی ضرورت نہیں ...... تو افرادِ خانہ وہی کرتے جو وہ کہتا ہے۔جیسے جیسے اس میں آمرانہ رجحانات فروغ پاتے رہیں گے ...... وہ اتنا ہی بیمار بنتا جائے گا۔کیونکہ کسی بیمار انسان کے احساسات کو کون مجروح کرنا پسند کرتا ہے؟ لیکن یہ خطرناک رجحان ہے۔اس طرح اپنی دانست میں ہم اسکی تیمارداری کرتے ہیں ...... اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک شوہر اپنی بیوی کی بیماری میں اس کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ جائے' یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔مگر اس کی تیمارداری کی خاطر آفس سے ناغہ کرنے کی ضرورت نہیں ...... یہ ایک مہنگا سودا ہے۔

ایک ماں کو اپنے بیمار بچے پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں اس طرح جب اس بچے کو توجہ کی ضرورت ہو گی تو وہ بیمار پڑتا رہے گا۔جب ایک بچہ بیمار ہو جائے تو اس کے بارے میں زیادہ فکرمند نہ ہوں کہ کہیں اس کے ذہن میں بیماری اور پیار کے مابین کسی رشتے کا تصور پختہ نہ ہو جائے۔بچے کے ذہن میں یہ بات نہیں بیٹھنی چاہئے کہ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو اس کی ماں اس کا سر دباتی ہے اور اس کو کہانیاں سناتی ہے۔اس کے بجائے جب وہ خوش و خرم ہو اس وقت اس کو گود میں لیں تا کہ پیار کا رشتہ خوشی اور مسرت کے ساتھ وابستہ ہو۔

ہم نے پیار کو دکھوں کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے۔یہ بیحد خطرناک روش ہے' جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جب بھی کسی کو پیار حاصل کرنے کی خواہش ہو گی وہ بیمار ہو جائے' کیونکہ اس کے لاشعور میں یہ بات بیٹھ چکی ہو گی کہ پیار بیماری کے ساتھ وابستہ ہے۔مگر پیار کبھی بیماری کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا۔یاد رکھئے بیماری رحم کا سبب بنتی ہے ...... پیار کا نہیں۔اور ہمدردی کا مستحق بن جانا توہین کے مترادف ہے۔اپنے آپ کو نظروں سے گرا لینا کبھی مستحسن نہیں ہو سکتا۔پیار ایک قطعی مختلف صورت کا نام ہے۔ہم پیار سے واقف تک نہیں۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جسم ہماری ترغیبات پر عمل کرتا ہے۔اگر ہم بیمار پڑنا چاہیں تو یہ غریب بیمار پڑ جاتا ہے۔اسی قسم کی بیماری کا علاج خود تنویمی کے ذریعے کیا جانا ممکن ہے۔مطلب کیا ہوا؟ یہ کہ ایک مصنوعی بیماری کے لیے ایک مصنوعی دوا ہی کارگر ہو سکتی ہے اصلی نہیں۔اگر ہم خود کو یقین دلا سکتے ہیں کہ ہم بیمار ہیں تو یہ یقین بھی دلا سکتے ہیں کہ ہم بیمار نہیں ہیں اور خود کو اس بیماری سے نجات دلا سکتے ہیں۔اس نکتۂ نظر سے خود تنویمی بہت اہم ہے۔آج' کسی ترقی یافتہ ملک میں شاید ہی کوئی ہسپتال ایسا ہو گا جس کے عملہ میں ہپناٹسٹ نہ ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی بیماریوں میں روایتی ڈاکٹر کام نہیں آتے۔صرف ماہرِ تنویم ہی ان پر قابو پا سکتا ہے۔وہ مریض کو اپنے زیرِ اثر لے کر اس کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ بہتر ہو رہا ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ صرف تین فیصد سانپ ہی زہریلے ہوتے ہیں؟ اور عام طور پر ایک بے ضرر سانپ کے کاٹے سے بھی انسان ہلاک ہو جاتا ہے اگر اس کو معلوم ہو کہ سانپ کے کاٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔اسی کی بدولت جھاڑ پھونک کے ذریعے بھی سانپ کے کاٹے کا علاج ہو جاتا ہے۔دوسرے الفاظ میں منتر پھونکنا اور آسیبی عمل نرے جھوٹے علاج ہیں۔ایک ایسا شخص جس کو زہریلے سانپ نے کاٹا ہو اس کو صرف یہ یقین دلانا کافی ہے کہ سانپ کے زہر کا توڑ کر دیا گیا ہے؛ اس کے بعد زہر اس کے اوپر اثر انداز نہیں ہو گا۔ایسا ہو جائے گا جیسے زہر کبھی تھا ہی نہیں۔اور اگر اس کو حتمی طور پر یہ باور کرا دیا جائے کہ اس کو سانپ نے حقیقت میں کاٹا ہے تو وہ مر جائے گا۔اس کی موت کا سبب سانپ کا کاٹنا نہیں ہو گا بلکہ سانپ کے کاٹے کا یقین اس کی موت کا سبب بن جائے گا۔

میں نے سنا ہے:

ایک مرتبہ ایک شخص رات بھر کے لیے ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔اس نے وہاں رات کا کھانا کھایا اور علی الصبح وہاں سے روانہ ہو گیا۔ایک سال کے بعد دوبارہ اس کا وہاں جانا ہوا تو ہوٹل کے مالک نے اس کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا: کیا آپ ٹھیک ٹھاک ہیں؟

اس نے جواب میں کہا "ہاں میں ٹھیک ہوں! کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"ہم خوفزدہ تھے' جب پچھلی بار آپ یہاں ٹھہرے تھے' اس رات ایک سانپ برتن میں گرا اور اس کھانے کے ساتھ پک گیا جو آپ کو دیا گیا تھا۔مزید چار آدمیوں کو بھی وہی کھانا

دیا گیا تھا جو کچھ دیر بعد مر گئے۔ آپ صبح بہت جلدی روانہ ہو گئے تھے اس لیے آپ کے بارے میں ہم نہیں جان سکے۔ اس کے بعد سے ہم آپ کے بارے میں بہت فکرمند تھے" ہوٹل کے مالک نے کہا۔

اس شخص نے یہ سنا تو گر کر مر گیا۔ ایک سال کے بعد وہ صرف خوف سے مر گیا۔

اس قسم کے آزار میں تنویم بہت مفید ہے۔ اس کا مقصد اس جھوٹ کے حصار کو توڑ ڈالنا ہے جو ہم اپنے اوپر تان لیتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اگر آپ کے پیر میں کوئی فرضی کانٹا چبھ گیا ہو تو اس کو اصلی کانٹے سے نکالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ فرضی کانٹا کبھی نہیں نکل سکے گا؛ مزید یہ کہ اصلی کانٹا آپ کے پیر کو زخمی کرنے کا باعث بنے گا۔ فرضی کانٹے کو فرضی کانٹے کی ذریعے ہی نکالا جا سکتا ہے۔

لہٰذا استغراق اور تنویم میں فرق کیا ہوا؟

صرف یہ کہ آپ کے جسم میں پھنسے ہوئے فرضی کانٹے کو نکالنے کے لیے تنویم کی ضرورت پڑتی ہے۔

"جب میں کہتا ہوں کہ اپنے جسم کو ڈھیلا ہوتا ہوا محسوس کریں"۔ یہ تنویم ہے۔ جبکہ آپ کا شعور آپ کو بتاتا ہے کہ جسم ڈھیلا نہیں پڑ سکتا۔ اس احساس کو زائل کرنے کے لیے تنویم ضروری ہے، ورنہ نہیں۔ کیا یہ مغالطہ نہیں تھا کہ آپ نے سمجھ لیا کہ جسم ڈھیلا نہیں پڑ سکتا حالانکہ ایک بار محسوس کرنے سے وہ ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ جو ہدایات میں آپ کو دیتا ہوں وہ اصل میں آپ کے جسم کو ڈھیلا کرنے کے لیے نہیں دیتا بلکہ آپ کا یہ یقین چھین لینے کے لیے دیتا ہوں کہ "جسم ڈھیلا نہیں پڑ سکتا"۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کے ذہن میں ایک ذیلی یقین قائم نہیں کر لیا جائے کہ جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آپ کا جھوٹا گمان اس جھوٹ کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے، اور جب آپ کا جسم ڈھیلا پڑ جائے گا تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ یہ ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ نرمی جسم کی ایک قدرتی خوبی ہے۔ مگر اب اس میں اتنا تناؤ بھر لیا گیا ہے کہ اس سے نجات کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔

یہ تنویم کی انتہائی پہنچ ہے۔ جب آپ محسوس کرنا شروع کریں کہ جسم ڈھیلا پڑنے جا رہا ہے، سانس پُرسکون ہونے لگا ہے، دماغ ساکت ہونے کو ہے؛...... یہی تنویم ہے۔ مگر صرف اسی حد

تک۔ یہاں تک آنے میں استغراق کا کوئی عمل دخل نہیں، استغراق اس کے بعد شروع ہوتا ہے جب کہ ابھی آپ اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ جب آپ اپنی اندرونی کیفیات سے آگاہی رکھتے ہوں، جب آپ اس بات کی گواہی دے سکیں کہ آپ کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے، آپکی سانس آہستہ ہو رہی ہے، اور یہ کہ آپ کے ذہن میں خیالات آنا بند ہو چکے ہیں یا ابھی آ رہے ہیں جب آپ یہ دیکھنا شروع کر رہے ہوں...... صرف دیکھنا...... اس مشاہدہ کا مشاہدہ کرنا...... اس کیفیت کا نظارہ کرنا ہی استغراق (ارتکازِ توجہ) ہے۔ اس سے قبل جو کچھ بھی تھا وہ تنویم تھا۔

اس لیے تنویم ایک اختراعی نیند ہے۔ جب ہم کو نیند نہیں آتی، ہم اس کے لیے سعی کرتے ہیں، اس کو بلاتے ہیں، نیند کو اس وقت بھی بلایا جاتا ہے جب ہم اس کے لیے تیاری کر کے اس کی آغوش میں جانے والے ہوتے ہیں، مگر استغراق اور تنویم دو علیحدہ کیفیات ہیں۔ ازراہِ کرم اس کو پوری توجہ کے ساتھ سمجھیے۔ جب تک آپ کے احساسات میری ہدایات کے مطابق ہیں...... وہ تنویم ہے۔ اگر ایک بار آپ محسوس کریں کہ میری ہدایات بند ہو گئی ہیں اور آگہی شروع ہو رہی ہے...... وہی ارتکاز کا آغاز ہے۔ جیسے ہی آپ گواہ کی حیثیت سے کیفیات کا مشاہدہ شروع کرتے ہیں ویسے ہی استغراق کا آغاز ہوتا ہے۔

تنویم کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب آپ خود کو الٹ تنویم میں ڈال لیتے ہیں۔ سائنسی اصطلاح میں یہ تنویم نہیں ہے بلکہ برعکس تنویم ہے۔ ہم تو پہلے سے زیرِ تنویم ہیں، گو کہ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کیفیت ہم پر کیسے طاری ہوئی ہے اور اس کو طاری کرنے کے لیے ہم نے کونسی ترکیب استعمال کی ہے۔ ہم اپنی زندگی کا بڑا حصہ تنویم کے زیرِ اثر گذار چکے ہیں، اور جب ہم زیرِ تنویم آنے کی خواہش کرتے ہیں تو ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم اپنی پوری زندگی اسی طرح گذار دیتے ہیں۔ اگر ہم کو اس بات کا علم ہو جائے تو ہم پر سے تنویم کا اثر زائل ہو جائے گا، اور جب ایسا ہو جائے تو اپنے آپ میں داخل ہو جانا ممکن ہو جاتا ہے، کیونکہ تنویم بنیادی طور پر ایک غیر حقیقی دنیا ہے۔

ایک مثال دیتا ہوں: "ایک آدمی سائیکل چلانا سیکھ رہا ہے۔ مشق کرنے کے لیے وہ ایک کشادہ سڑک منتخب کرتا ہے جو ساٹھ فٹ چوڑی ہے جس کے ایک جانب سنگِ میل نصب ہے، اگر وہ شخص اس سڑک پر اندھادھند سائیکل چلائے تو بھی اس بات کا کم امکان نہیں کہ وہ سنگِ میل

سے جاٹکرائے گا۔ مگر اس آدمی کو تو ابھی تک سائیکل چلانی بھی نہیں آتی۔ ابھی اس نے سڑک کی طرف دیکھا بھی نہیں کہ سنگِ میل پر نظر پڑتے ہی اس سے ٹکرا جانے کا خوف اس کے دل میں بیٹھ جاتا ہے...... جیسے ہی اس کے دل میں سنگِ میل سے ٹکرانے کا خوف پیدا ہوا' وہ تنویم میں مبتلا ہو گیا۔ یہ کہنا کہ اس پر تنویم کا اثر ہو گیا' یعنی اب اس کو سڑک تو دکھائی ہی نہیں دے رہی بلکہ اس کے اعصاب پر وہ پتھر چھا گیا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے اور اس کی سائیکل کا ہینڈل پتھر کی طرف مڑنے لگتا ہے۔ ہینڈل جیسے جیسے مڑتا جاتا ہے اس کے خوف میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یقینی بات ہے کہ ہینڈل اسی طرف مڑتا جائے گا جس طرف اس کی توجہ ہوگی اور اس کی پوری توجہ اس پتھر کی طرف ہے جس سے ٹکرا جانے کا خوف اس کے دل میں بیٹھ چکا ہے' لہٰذا سڑک اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور صرف پتھر ہی دکھائی دیتا رہا۔ تنویم کے زیر اثر وہ اس پتھر کی جانب کھنچتا چلا گیا' وہ جتنا اس کی طرف کھنچتا اتنا ہی اس کے خوف میں اضافہ ہوتا رہا' اور جتنا وہ خوفزدہ ہوتا گیا اتنا ہی وہ اس کی طرف کھنچتا گیا۔ آخر کار وہ اس سے ٹکرا ہی گیا

اس کو دیکھ کر ایک ذہین آدمی کو حیرت ہوگی کہ اتنے کشادہ روڈ پر کوئی آدمی سنگِ میل سے کیسے ٹکرا گیا؟ وہ خود کو اس سے دور کیوں نہیں رکھ سکا؟ واضح طور پر وہ زیرِ تنویم آچکا تھا۔ اس کی پوری توجہ اس پتھر پر مرکوز ہو گئی کہ کہیں وہ اس پر گر نہ پڑے۔ جب اس کا دماغ پوری طرح پتھر پر مرتکز ہو گیا تو اس کے ہاتھ خود بخود سائیکل کو پتھر کی طرف لے جاتے رہے۔ کیونکہ جسم دماغ کے ہدف کے تعاقب میں اسی طرف جانے کا پابند تھا۔ وہ جتنا خوف زدہ ہوا اتنا ہی اس کا دھیان پتھر پر جمتا گیا۔ وہ پتھر کے زیرِ تنویم آچکا تھا۔ اس کا خوف اس کو پتھر کی طرف کھینچتا رہا' نتیجہ کے طور پر وہ اس میں جا گھسا۔

عام طور پر ہم زندگی میں وہی غلطیاں کرتے رہتے ہیں جن سے ہم کو بچنا چاہیے۔ ہم زیرِ تنویم ہو کر ایسا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو اندیشہ ہے کہ وہ اپنا سکون کھو بیٹھے گا اور غصہ میں آجائے گا۔ ایسی حالت میں وہ خود کو چوبیس گھنٹوں میں چوبیس بار غصے میں محسوس کرے گا۔ وہ غصہ ہونے سے جتنا ڈرتا رہے گا اتنا ہی غصہ کی تنویم میں آتا جائے گا۔ پھر وہ چوبیس گھنٹے غصہ میں ہونے کی تاویلیں کرتا رہے گا۔

ایک اور شخص جو حسین عورتوں کو دیکھنے سے خائف ہے کہ وہ اس کے جنسی جذبات

بھڑکانے کا سبب بنیں گی' وہ چوبیس گھنٹے حسین عورتیں ہی دیکھتا رہے گا۔ اور کبھی کبھی نہایت بدصورت عورت بھی اس کو حسین محسوس ہونے لگے گی یہاں تک کہ بعض مرد بھی اس کو عورت کی طرح لگنے لگیں گے۔ اگر وہ پیچھے کی طرف سے بڑے بالوں والے سادھو کو بھی دیکھ لے گا تو پہلے اس بات کی تصدیق کرے گا کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ نتیجۃً اس پر تنویمی عمل کرنے کے لیے پوسٹروں اور تصویروں والی عورتیں بھی اس کی توجہ کھینچنے لگیں گی۔ وہ برہنہ عورتوں کی تصویریں گیتا اور قرآن میں چھپا کر رکھے گا اور بلا کسی تعجب کے یہ بھی نہیں سوچے گا کہ وہ محض رنگوں اور لکیروں کی تنویم کے زیر اثر کیسے آ گیا۔ اس نے ہمیشہ عورتوں سے بچنے کی کوشش کی ہے اور اب ان سے خوف زدہ ہے۔ اب اسکو ہر طرف عورتیں ہی عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ مندر جا رہا ہو یا مسجد' یا کہیں اور اس کو عورتوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی تنویم ہے۔

جس معاشرہ میں جنس پر پابندی ہوگی وہ معاشرہ جنسیات میں ڈھل جائے گا۔ کوئی ایسا معاشرہ جو جنس کا مخالف ہو...... جو جنس کو معاشرتی برائی سمجھتا ہو...... اس کا مزاج جنسیاتی ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ اس کی تنویم کے زیر اثر آ جائے گا۔ جس چیز پر وہ تنقید کرتا رہا ہے' اس کی تمام تر توجہ اسی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جو معاشرہ پاکیزگی کی جتنی اشاعت کرے گا اس میں پیدا ہونے والے افراد اتنی ہی گندی ذہنیت اور خواہشات کے اسیر ہونگے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ جہاں پاکیزگی پر زیادہ زور دیا جائے گا وہاں دماغ پر جنس کا غلبہ بڑھتا جائے گا۔ یہ سب کچھ ہماری پیدا کردہ تنویم کے اثرات ہیں۔ اور انہی میں ہم زندہ ہیں۔ پوری دنیا اسی تنویم کے اثر میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کے اثرات زائل کرنا مشکل ہے' کیونکہ ہماری ہر کوشش کے ساتھ اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا رہے گا۔

خدا کو معلوم کہ اس طرح ہم تنویم کی کتنی قسمیں اب تک اپنے لیے بنا چکے ہیں اور کتنے ابھی بنانے میں مصروف ہیں۔ پھر ان کے ساتھ ہم رہتے بھی ہیں۔ ان کو توڑنا ضروری ہے تاکہ ہم ہوش میں آ جائیں۔ مگر اس مصنوعی جال کو توڑنے کے لیے ہمیں مصنوعی ذرائع دریافت کرنے پڑیں گے۔

ایک طرح سے سادھنا سمیت تمام روحانی عمل اپنے اردگرد موجود اس حصار کو توڑنے کے لیے ہیں۔ اس نظریے کے تحت سادھنا بھی ایک فریبِ نظر ہے اور وہ تمام طریقے جو ہمارے لیے خدا تک رسائی کے لیے رائج ہیں وہ سب مصنوعی ہیں اس لیے کہ ہم تو اس سے کبھی دور ہی نہیں

رہے۔اپنے خیالوں میں ہم بیشک اس سے دور رہتے ہوں۔

یہ ایسا ہوگا کہ ایک شخص دوارکا میں سوکر خود کو کلکتہ میں دیکھے۔اور اپنے خواب میں وہ پریشان ہونا شروع کردے کہ اس کی بیوی بیمار ہے اور وہ یہاں کلکتہ میں ہے؛ اس کو لازماً دوارکا واپس جانا چاہیئے۔وہ اپنے اطراف موجود لوگوں سے ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کی پرواز کے بارے میں معلومات کرتا ہے تاکہ وہ جلد از جلد دوارکا پہنچ سکے۔مگر دوارکا پہنچنے کی ہر تجویز غلط ہوگی اور اس کے لیے پریشانیوں کا سبب بنے گی' کیونکہ وہ کلکتہ میں ہے ہی نہیں' وہ کبھی کلکتہ گیا ہی نہیں' وہ تو تنویم کے زیر اثر' خواب دیکھ رہا تھا' اس کو دوارکا پہنچنے کے بارے میں جو بھی تجویز دی جائے گی وہ اس کو پریشانیوں میں ڈالنے کے علاوہ کچھ نہیں کرے گی۔

دوارکا جانے کے کسی راستے کے کوئی معنی نہیں' سارے راستے جھوٹ ہیں' یہاں تک کہ اگر وہ شخص دوارکا پہنچ بھی جائے' تو جو راستہ وہ منتخب کرے گا وہ جھوٹا ہوگا' وہ کبھی صحیح راستہ دریافت نہیں کر سکے گا کیونکہ اس کے لیے ایسے کسی راستے کا وجود ہی نہیں ہوگا۔کیونکہ وہ تو کلکتہ گیا ہی نہیں......اس کے لیے وہاں کا راستہ تلاش کرنا ہی بے معنی ہے۔دوارکا کے لیے جو گاڑی بھی وہ پکڑے گا وہ بھی اتنی ہے جھوٹ ہوگی جتنا کلکتہ۔وہ ہاؤڑا اسٹیشن جائے اور ٹکٹ خرید کر دوارکا جانے والی گاڑی بھی پکڑ لے تو یہ سب بھی جھوٹ ہوگا۔پھر وہ دوارکا واپس آجاتا ہے اور خوش و خرم جاگ اٹھتا ہے؛ لیکن یہ دیکھ کر حیران ہوجاتا ہے کہ وہ کہیں گیا ہی نہیں......تمام وقت وہ اپنے بستر میں رہا ہے۔پھر وہ کیسے واپس آیا؟ چونکہ اس کا جانا فریب تھا اس لیے اس کا واپس آنا بھی ایک فریب ہی تھا۔

خدا ایک ازلی حقیقت ہے! کوئی انسان کبھی اس سے باہر نہیں رہا۔کوئی رہ بھی نہیں سکتا' کیونکہ وہ ایک ناقابل تردید ہستی ہے......ایسا کوئی راستہ نہیں کہ کوئی اس سے دور ہوسکے۔اس سے دور جانا بھی فریب......اس کے پاس واپس آنے کا تصور بھی فریب۔مگر چونکہ ہم پہلے ہی اس تصوراتی سفر پر نکلے ہوئے ہیں اس لیے ہمیں واپس تو آنا ہے......اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہیں۔ہم کو واپسی کے طریقے تلاش کرنے ہوں گے۔اور جب ہم واپس آجائیں گے تو احساس ہوگا کہ تمام طریقے فریب تھے۔تمام ریاضتیں فریب تھیں۔سادھنا صرف ہماری خواب کی دنیا سے واپسی کے لیے ضروری تھی۔جب یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے گی' اس کے بعد

شاید کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے اور اچانک علم ہو کہ ہم واپس آچکے ہیں۔مگر چونکہ آپ کے خیال میں آپ ابھی کلکتہ میں ہیں اس لیے ایسا سمجھنا آپ کے لیے مشکل ہوگا۔آپ تو بس یہی کہیں گے " جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے' مگر میں چونکہ کلکتہ میں ہوں اس لیے مجھے واپسی کا راستہ بتائیں"

ایک دوسرے دوست نے پوچھا ہے" کیا آپ کی خدا سے ملاقات ہوئی؟"

یہ عین ویسا ہی سوال ہے جو کلکتہ کا مسافر پوچھ سکتا ہے۔میں اپنے دوست سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں" کیا کبھی آپ خدا سے جدا ہوئے؟" کیونکہ اگر میں کہوں کہ مجھے خدا ملا تو بادی النظر میں اس کا مطلب ہوگا کہ میں نے اس کو گمشدہ فرض کر لیا تھا۔وہ تو پہلے سے ملا ہوا ہے۔یہاں تک کہ اگر ہم ایسا محسوس کریں کہ ہم اسے کھو بیٹھے ہیں' پھر بھی وہ ہمارے ساتھ ہوگا۔سادہ سی بات ہے کہ ہم زیر تنویم ہیں اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ ہم اسے کھو چکے ہیں۔اس لیے اگر کوئی کہتا ہے کہ اس نے خدا کو تلاش کر لیا ہے' تو وہ غلط کہتا ہے۔اول تو وہ ابھی سمجھ ہی نہیں پایا ہے کہ وہ کبھی کھویا بھی تھا۔اس لیے جو خدا کو جانتے ہیں وہ کبھی نہیں کہیں گے کہ ان کو خدا مل گیا ہے۔بلکہ وہ کہیں گے "وہ کبھی کھویا ہی نہیں"

جس روز بدھ کو عرفان حاصل ہوا' لوگوں نے اس کو گھیر لیا اور پوچھا" تم کو کیا مل گیا؟"

بدھ نے جواب میں کہا" مجھے کچھ نہیں ملا! بس یہ ہوا ہے کہ میں نے اس کو دیکھ لیا ہے جو کبھی مجھ سے دور نہیں تھا۔مجھے وہ مل گیا ہے جو میرے پاس پہلے سے موجود تھا"

اس پر گاؤں کے لوگوں نے اظہار ہمدردی کے طور پر یہ کہا" یہ تو بہت برا ہوا! آپ کی محنت رائیگاں ہوئی"

بدھ نے کہا" ہاں! ان معنوں میں یہ بات صحیح ہے کہ میں نے بیکار اتنی مشقتیں اٹھائیں جس کی اب ضرورت نہیں رہی! لہٰذا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اب اس کی تلاش میں نکلنے کی ضرورت نہیں رہی۔اب میں تلاش میں بھٹکوں گا نہیں۔اب مزید کسی سفر پر نہیں نکلوں گا۔میرے لیے یہی سب سے بڑا فائدہ ہے! اب میں جان چکا ہوں کہ میں وہیں ہوں جہاں پہلے تھا"

ہم اپنے خوابوں میں دور چلے جاتے ہیں۔مگر درحقیقت وہاں نہیں پہنچ پاتے جہاں ہم خود کو پہنچا ہوا سمجھتے ہیں۔اور ایک طرح سے تمام مذاہب' سادھنائیں' روحانی مشقتیں تمام یوگ

سب جھوٹ ہیں۔ وہ اس اعتبار سے جھوٹ ہیں کہ وہ سب واپسی کے طریقے ہیں؛ اس کے باوجود وہ مفید بھی ہیں۔

منتروں کے جاپ سے سانپوں کے زہر کا علاج کرنے والا گاؤں کا جادوگر ان لوگوں کے لیے نہایت کارآمد ہے جن کو سانپ نے کاٹ لیا ہو...... خواہ ان کو کسی مفروضہ سانپ نے ہی کیوں نہ کاٹا ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر لوگ اس مفروضہ سانپ کے کاٹنے سے مرتے رہتے جو وہاں کبھی موجود نہیں ہوتے۔

ایسا ہی ایک شخص میرے پڑوس میں رہا کرتا تھا، وہ اب مر چکا ہے، اس کے پاس دور دور سے لوگ سانپ کا زہر نکلوانے کے لیے آتے رہتے تھے۔ وہ بہت ہوشیار انسان تھا۔ اس نے کچھ سانپ پالے ہوئے تھے۔ جب سانپ کا کاٹا ہوا کوئی آدمی اس کے پاس آتا تو وہ اپنی فن کارانہ مہارت کام میں لاتے ہوئے تحقیقات کرتا" وہ سانپ کیسا تھا؟ اس نے کہاں کاٹا؟ آیا وہ سانپ مر گیا یا زندہ تھا؟ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی ترکیب استعمال کرتے ہوئے سانپ کو بلاتا ...... ہر بات پہلے سے طے شدہ ہوتی تھی...... کونسے سانپ کو کس اشارے پر نمودار ہونا ہے، وغیرہ............ تقریباً ایک گھنٹے میں مریض کے بیان کردہ حلیہ کا سانپ پھنکارتا ہوا دروازے سے داخل ہوتا۔ پورے ماحول میں سراسیمگی پھیل جاتی، سانپ کا کاٹا ہوا شخص گنگ ہو جاتا۔

جس شخص کو سانپ کاٹتا ہے وہ بمشکل ہی تمام تفصیلات یاد رکھ سکتا ہے: اسے کس نے کاٹا؟...... وہ کیسا دکھائی دے رہا تھا؟...... وہ کہاں تھا؟ سانپ کے کاٹے جانے کی وجہ سے وہ اتنا پریشان ہوتا ہے کہ اس دوران اس کو ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ ان تفصیلات پر دھیان دے سکے۔ اگر وہ سانپ مارا جا چکا ہوتا تو سپیرا اس کی روح کو اپنے سانپ کا ساتھ دینے کے لیے بلاتا۔ پھر وہ سانپ کو اس کی حرکت پر ڈانٹتا اور بدلے کا تقاضہ کرتا۔ پھر وہ سانپ اپنا پھن زمین پر مارتا گویا وہ معافی کا طلبگار ہے۔ اسی دوران اس شخص کے زخم سے خون رسنا شروع ہو جاتا۔ پھر سانپ سے زہر چوسنے کے لیے کہا جاتا۔ سانپ فوراً ہی اس شخص کی طرف رخ کر لیتا جس کو کاٹا گیا تھا، اور اپنا منہ اس کے زخم پر رکھتا اور مریض ٹھیک ہو جاتا۔

بدقسمتی سے ایک بار ایسا ہوا کہ سانپ نے اس کے بیٹے کو ڈس لیا۔ جب اس کا کوئی طریقہ کارگر ثابت نہیں ہوا تو پریشان ہو کر وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور مدد کا طالب ہوا۔ کہنے لگا

"میری مدد کرو، میں بہت پریشان ہوں، مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میرے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا ہے، وہ میرے پالتو سانپوں کو بخوبی پہچانتا ہے! میں کتنا بدنصیب ہوں! مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں، میں بہت بے بس ہوں! میرا بیٹا مر جائے گا"

مجھے بہت حیرت ہوئی اور میں نے اس سے پوچھا کہ تمھارا علاج کیا ہوا؟ تمھارے پاس تو لوگ دور دور سے علاج کے لیے آتے ہیں؟

"وہ تو ٹھیک ہے!" اس نے کہا" لیکن سانپ تو اگر مجھے بھی ڈس لے گا تو میں بھی مشکل میں آ جاؤں گا، میں تو خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا پاؤں گا، مجھے اپنے کاروبار کے رموز خوب آتے ہیں، میں اپنے اس طریقۂ علاج کے سلسلے میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا"...... وہ اپنے بیٹے کو نہیں بچا سکا اور اس کا بیٹا مر گیا۔

جھوٹ کو ختم کرنے کے لیے جھوٹے طریقے ہی اختیار کیے جاتے ہیں، جن کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ ہم چونکہ پوری طرح جھوٹ میں ڈوب چکے ہیں، اس لیے وہ مزید اہمیت اختیار کر جاتے ہیں ابتداً تمام مراحل تنویم کے ہوتے ہیں: صرف آخری مرحلہ استغراق پر مبنی ہوتا ہے...... اور وہی سب سے قیمتی مرحلہ ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ وہاں تک پہنچیں، یہ پس منظر جاننا آپ کے لیے بیحد ضروری ہے...... تاکہ آپ جھوٹ کے اس حصار سے باہر آ سکیں جس میں آپ بری طرح سے گھرے ہوئے ہیں۔

معلوم کرنے میں کبھی مت ہچکچائیں لیکن کبھی ایسے سوال مت کریں: "آپ کو خدا ملا یا نہیں ملا؟" یہ سوالات درست نہیں۔ کون ڈھونڈنے چلا ہے؟ کیا ڈھونڈا جا رہا ہے؟ وہ جو ہے؟ وہ ہے۔ جس دن آپ کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی! آپ دیکھیں گے کہ آپ نے کبھی کچھ کھویا نہیں ہے ...... نہ آپ کہیں گئے ہیں، نہ کبھی کوئی مرا ہے۔ جو ہے! وہ ہے۔ اس دن ساری مسافتیں۔ ادھر ادھر بھٹکنا سب موقوف ہو جائے گا۔

اور اب یہ سوال: آواگون کے چکر سے آزادی سے کیا مراد ہے؟

جینے مرنے کے چکر سے نجات کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں آپ دوبارہ پیدا ہی نہیں ہونگے...... اس کا مطلب ہے کہ اب کہیں آنا جانا نہیں ہے۔ کہیں نہیں...... کسی جہاز پر بھی نہیں۔ یعنی اب آپ اپنی جڑوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ دن ہوگا جب چاروں طرف خوشیاں

پھوٹ پڑیں گی۔ہم کسی تصوراتی پرچھائیں میں خوشیوں کا احساس نہیں کر سکتے' ہم اصل میں جہاں ہیں وہیں مسرت اور شادمانی پاسکتے ہیں۔ہم اپنی ذات میں ہی خوشیاں پاسکتے ہیں' جو کچھ ہم نہیں ہیں اس سے مسرت اور شادمانی کا بھی کوئی ناطہ نہیں ہے۔لہٰذا موت اور زندگی کے درمیان چلتے رہنا' خیال وخواب کے مابین گردش کا نام ہے۔ہم کہیں ایسی جگہ گم ہیں جہاں ہم کبھی گئے بھی نہیں۔ہم ایسی جگہ بھٹک رہے ہیں جہاں کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔اور جہاں ہم ہیں وہاں ہماری نظر نہیں ٹھہرتی۔لہٰذا موت وحیات کے چکر سے نکل جانے کا مطلب ہے ہماری اصل مقام پر واپسی......اپنے گھر کو واپسی۔

خدا میں جاملنا مترادف ہے اس بات کا کہ ہم خود اصل میں کیا ہیں؟ ایسا نہیں کہ کسی روز اچانک آپ خدا کو کہیں کھڑے ہوئے دیکھ کر سلام کریں اور کہیں " شکر ہے کہ آپ مل گئے " اس قسم کا کوئی خدا نہیں ہے' اور اگر بالفرض محال کوئی ایسا مل جائے تو سمجھ لیں کہ وہ تنویم ہے۔ایسا خدا صرف آپ کی اپنی تخلیق ہوگا اور اس سے ملنا اتنا ہی فریب ہوگا جتنا کہ اس کو کھودینا تھا۔یہ ہرگز وہ طریقہ نہیں جس سے آپ کبھی خدا کو پاسکیں۔

ہماری زبان بعض اوقات مغالطے پیدا کردیتی ہے کیونکہ جب ہم کہتے ہیں " خدا کو پانا " یا " خدا کو حاصل کرلینا " یہ ایسا تاثر دیتے ہیں جیسے کوئی خدا کو آمنے سامنے دیکھ سکتا ہے۔اس قسم کے الفاظ بہت گمراہ کن ہیں۔ان کو سن کر یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کوئی خدا کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کرسکتا ہے' اس سے بغلگیر ہوسکتا ہے۔یہ سب فضول ہے۔اگر اس قسم کا خدا آپ کے سامنے آئے تو ہوشیار رہنا! ایسا خدا صرف آپ کے تخیل کی پیداوار ہوگا' وہ تنویم کا نتیجہ ہوگا۔

ہمیں ان تمام تنویمات' تمام فرضی مناظر سے باہر آکر الٹے پیروں اس نکتے تک آنا ہوگا جہاں کوئی نیند نہیں ہے' کوئی تنویم نہیں ہے جہاں ہم مکمل طور پر اپنی ذات سے آگہی رکھتے ہیں پھر جو تجربہ ہمیں حاصل ہوگا وہ اجتماعی حیات کا تجربہ ہوگا' ناقابلِ تقسیم اکائی کا تجربہ......اسی تجربے کا نام خدا ہے۔

اب ہمیں صبح کے استغراق کی تیاری کرنی چاہئے۔اس سلسلے کی مزید کچھ باتیں میں رات کے استغراق کے وقت گوش گذار کروں گا۔آپس میں تھوڑا تھوڑا فاصلہ پیدا کرنے کے لیے تھوڑا تھوڑا سرک جائیں۔گفتگو کیے بغیر' خاموشی سے کھسک جائیں۔اپنے چاروں طرف

تھوڑی تھوڑی جگہ بنالیں۔جو لوگ لیٹنا چاہیں وہ لیٹ سکتے ہیں' ان کو بھی اپنے دونوں جانب فاصلہ قائم رکھنا ہوگا۔اور استغراق کے دوران اگر کوئی گر رہا ہو تو اسے خود کو روکنے کی کوشش کیے بغیر گر جانا چاہئے۔

ہاں! اپنے لیے راستہ بنا کر آپ اوپر برآمدے میں بھی جاسکتے ہیں' کیونکہ بعد میں اگر آپ کسی کے اوپر گریں گے تو خود آپ کو برا محسوس ہوگا اور اس دوسرے شخص کی توجہ بھی ارتکاز سے ہٹ جائے گی۔اس لیے آپس میں فاصلہ رکھیں۔

آنکھیں بند کرلیں ...... کوئی بچہ بات نہیں کریگا......وہ دس منٹ کے لیے بالکل خاموش بیٹھیں گے۔آنکھیں بند کرلیں......جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں......جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں جیسے اس میں جان نہیں ہے......اپنی تمام قوت جمع کر کے اپنے اندر مرتکز کریں......جسم کی تمام توانائی سمٹ کر آپ کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے......آپ کی ذات میں جمع ہورہی ہے......ہم اندر سے سکڑتے جارہے ہیں...... ہمارا جسم خالی ہوکر ایک چھلکے کی طرح باہر پڑا ہوا ہے۔یہ چاہے بکھرے چاہے مجتمع رہے' یہ لباس کی طرح ایک خارجی چیز ہے۔ذات میں غوطہ زن ہوجائیں...... جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑے رہیں......اب میں آپ کو ہدایات دوں گا' آپ اس تجربہ میں میرے ساتھ رہئے۔

ایسا تجربہ کہ جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے......جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے......جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے...... اس کو محسوس بھی کریں اور جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں......جسم نہایت تابعدار ہے۔جب آپ دل سے محسوس کریں گے تو وہ آپ کو نعش کی طرح محسوس ہوگا۔محسوس کریں کہ جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے...... جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے......جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے......جسم ڈھیلا پڑتا ہی جارہا ہے...... پڑنے دیں...... ہر قسم کی گرفت سے آزاد کردیں......اندر سے جسم کو سنبھالا دینے کی کوشش مت کریں...... پوری طرح آزاد کردیں......اس پر سے اپنا ہر قسم کا اختیار ختم کردیں...... جیسے وہ آپ کا اپنا جسم ہی نہیں......اب اس پر جو کچھ گذرنا ہے' گذرنے دیں۔اگر یہ گرتا ہے تو گر جائے۔اگر کوئی اس سے جدا ہوتا ہے' جدا ہوجائے۔اس سے مکمل طور پر دور ہوجائیں...... اپنے خیالات اس کی طرف سے ہٹالیں۔

سانسوں پر سکوت چھارہا ہے......سانسوں کے پرسکون ہونے کو محسوس کریں

سانسوں پر سکوت چھا رہا ہے...... سانسوں پر سکوت چھا رہا ہے...... سانسوں پر سکوت چھا رہا ہے...... سانسوں پر سکوت چھا رہا ہے...... سانسوں پر سکوت چھا رہا ہے...... سانسیں بتدریج پرسکون ہو رہی ہیں...... پرسکون ہو رہی ہیں...... ہونے دیں...... سانسوں کو بھی ہونے دیں...... اپنی ذات میں تھوڑا اور اندر جائیں۔ سانسیں پرسکون ہوگئی ہیں...... سانسیں پرسکون ہوگئی ہیں...... سانسیں پرسکون ہوگئی ہیں...... سانسیں پرسکون ہوگئی ہیں...... آپ ان سانسوں کو چھوڑ کر اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ سانسیں پرسکون ہوگئی ہیں......

خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے...... خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے...... خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے......' خیالات سے بھی دور نکل جایئے۔ خیالات کو بھی سکون میں آنے دیں۔ خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے...... خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے...... خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے...... خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے...... خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے...... خیالات میں بھی ٹھہراؤ آ رہا ہے......۔ خیالات کو سکون میں آنے دیں' خیالات سکون میں آ رہے ہیں۔ خیالات سکون میں آ رہے ہیں۔ خیالات سکون میں آ رہے ہیں۔

جسم پرسکون ہے...... خیالات پرسکون ہیں...... اب دس منٹ کے لیے اپنے اندر بیدار رہیں' اب سے دس منٹ تک اپنی ذات میں بیدار رہیں۔ دس منٹ کے لیے ہر چیز فنا ہو چکی ہے۔ ہم اپنی ذات میں ایک شمعِ فروزاں کی طرح روشن ہیں۔ جسم ہم سے دور پڑا ہوا ہے۔ سانسوں کی آواز بھی کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی ہیں۔ خیالات پر خاموشی طاری ہے...... اندر ہماری آگہی ان سب کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ سونا نہیں...... اندرونِ ذات بیدار رہیے۔

اپنے اندر بیدار رہیے...... اپنے اندر مشاہدے میں مصروف رہیے۔ دیکھتے رہیے۔ ایک گواہ بن جایئے اور دیکھئے کہ ایک عمیق گہرائی شروع ہو رہی ہے...... مکمل سکوت طاری ہو جائے گا۔ ایک لامحدود خلا شروع ہو جائے گا۔ اب دس منٹ تک خاموشی کے ساتھ اپنی ذات میں مشاہدہ جاری رکھئے۔

دماغ خاموش ہے۔ دماغ مکمل طور پر خاموش ہے۔ ایک خلا' ایک لامحدود خلا محیط ہے۔ ان خلاؤں میں گہرا غوطہ لگایئے۔ جیسے ایک گہرے کنویں میں گر رہے ہیں۔ گرتے چلے جایئے...... گرتے چلے جایئے۔ اپنی ذات کے اندر جاگے رہیے اور اس خلا کا حصہ بن جایئے اندر

ہوش میں رہیے۔ جاگے رہیے اور دیکھتے رہیے۔ ہر چیز جیسے مر چکی ہے۔ جسم کہیں دور پڑا ہوا ہے' سانسیں کہیں دور رہ گئی ہیں۔ خیالات معدوم ہو چکے ہیں...... صرف ہم بچے ہوئے ہیں۔ بیداری کی کیفیت میں صرف دیکھتے رہیے۔ دیکھتے رہیے...... دماغ بتدریج خالی ہوتا جائے گا۔

آہستگی سے چند گہری سانسیں لیجیے اور استغراق سے باہر آ جایئے۔ اپنی آنکھیں آہستگی اور نرمی کے ساتھ کھول دیجیے؛ ہمارا صبح کا استغراق اب پورا ہوا۔

☆

پانچواں باب

اپنا راستہ خود تلاش کیجیے

ایک دوست کا سوال ہے:

ایک موقعہ پر آپ نے کہا تھا کہ موت سے بڑا کوئی سچ نہیں۔ آپ نے کہیں یہ بھی کہا تھا کہ موت نام کی کوئی چیز نہیں۔ دونوں میں سے کونسا بیان سچ سمجھا جائے؟

دونوں ہی مبنی برحق ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ موت سب سے بڑا سچ ہے تو میں آپ کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ موجودہ زندگی کے خاتمے کا موقعہ اس کا سب سے بڑا سچ ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ اور کسی کی شخصیت کا وہ پہلو جو زندگی کہلاتا ہے جسے میں 'میں' کا نام دیا کرتا ہوں' اس شخصیت کو ختم ہونا ہے' مرجانا ہے اور جس کو ہم زندگی کا نام دیتے ہیں وہ بھی ختم ہو جانی ہے موت ناگزیر ہے۔ یقیناً مجھے بھی مرنا ہے اور آپ کو بھی' اور موجودہ زندگی بھی فنا ہو جائے گی۔ خاک میں تبدیل ہو جائے گی۔ مٹ جائے گی۔

اور جب میں کہتا ہوں کہ موت سے بڑا کوئی سچ نہیں تو میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم سب کو مرجانا ہے۔ اور جب میں کہتا ہوں کہ موت ایک مکمل فریب ہے تو میں یاددہانی کرانا چاہتا ہوں کہ اِس 'میں' کے اندر اور اِس 'تم' کے اندر کوئی ایسا ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔ اور جس کو آپ زندگی کہتے ہیں' اس سے بالکل مختلف ایک زندگی اور ہے جس میں موت کا گذر نہیں۔ یہ دونوں باتیں سچ ہیں' یہ دونوں ہی یکساں سچ ہیں۔ اگر آپ دونوں میں سے کسی ایک کو درست مانتے ہیں تو آپ پورے سچ کو قبول نہیں کر سکتے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ سایہ ایک حقیقت ہے' اور اندھیرا بھی حقیقت ہے' تو وہ صحیح کہتا ہے۔ کیونکہ جس طرح اندھیرے کا وجود ہے اسی طرح سائے کا بھی وجود ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا یہ

کہتا ہے کہ اندھیرا موجود نہیں ہے۔ تو وہ بھی حق بجانب ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اندھیرے کا کوئی مثبت' راست' وجود نہیں ہے۔ اگر میں آپ کو اندھیرے سے بھرے دو عدد تھیلے لانے کے لیے کہوں' تو آپ یقیناً نہیں لاسکیں گے۔ ایک کمرے میں اندھیرا گھپ ہے' اور آپ سے کہا جائے کہ اس اندھیرے کو اٹھا کر باہر پھینک دو' تو آپ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ یا میں کہوں کہ اگر وہاں اندھیرا موجود ہے تو اسے باہر لے کر آؤ! تب بھی آپ نہیں لاسکیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اندھیرا ایک منفی اور غیر حقیقی وجود ہے۔ جو صرف روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

گو کہ اندھیرا موجود ہے' مگر وہ صرف روشنی کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اندھیرا نہیں ہے...... وہ بھی غلط نہیں ہے۔ روشنی موجود بھی ہے اور موجود نہیں بھی ہے۔ مگر اندھیرا بہرحال نہیں ہے۔ اس لیے ہم اپنے کام روشنی کی موجودگی میں تو کر سکتے ہیں' مگر اندھیرے کی موجودگی میں نہیں۔ اگر آپ اندھیرا دور کرنا چاہتے ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ آپ وہاں روشنی لائیں۔ اور جب آپ اندھیرا لانا چاہیں گے تو روشنی بند کرنے سے لاسکیں گے' اندھیرا ہونے کی صورت میں آپ براہِ راست کچھ نہیں کر سکتے۔

آپ سڑک پر جاگنگ کر رہے ہیں۔ آپ کے پیچھے آپ کا سایہ ہے۔ یہ آپ کے ساتھ دوڑتا بھی ہے۔ ہر کوئی اس سائے کو دیکھ سکتا ہے۔ کوئی اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سایہ نہیں ہے کیونکہ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ سایہ اس لیے ہے کہ آپ کا جسم روشنی کو روک رہا ہے۔ جب روشنی آپ کے جسم کے ذریعے رک جاتی ہے تب سایہ وجود میں آتا ہے۔ جب سورج آپ کے سر پر آجاتا ہے تو سایہ نہیں پڑتا کیونکہ سورج کی شعاؤں کو آپ کے جسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ اگر ہم انسانی جسم کو شیشے کا بنا سکتے تو کوئی سایہ وجود میں نہیں آتا کیونکہ کرنیں شیشے میں سے گذر جاتیں۔ جب روشنی کو روکا جاتا ہے تو سایہ وجود میں آتا ہے' سایہ صرف روشنی کی غیر موجودگی کا نام ہے۔ اس لیے اگر کوئی کہتا ہے کہ سایہ موجود ہے تو اس کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ مگر یہ آدھا سچ ہے۔ اس کو آگے یہ بھی کہنا چاہئے کہ سایہ کا وجود نہیں ہے۔ پھر یہ مکمل سچ ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سایہ ایک ایسی چیز ہے جو وجود رکھنے کے باوجود غیر موجود ہے۔ مگر اپنے طرزِ فکر کے مطابق ہم کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے جب تک اس کو دو علیحدہ اور مستقل حصوں میں تقسیم نہ کیا جا سکے۔

ایک بار ایک شخص کے اوپر قتل کا مقدمہ چلا۔ اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا اور جن لوگوں نے قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا وہ اس وقوعے کے گواہ بن گئے۔ ایک گواہ نے کہا" جرم کھلے آسمان کے نیچے کیا گیا اور آسمان میں تارے چمک رہے تھے' میں نے ستارے بھی دیکھے اور قتل ہوتے ہوئے بھی دیکھا"۔ اس کے بعد ایک دوسرے گواہ نے کہا" جرم گھر کے اندر' دروازے سے نزدیک' دیوار کے پاس کیا گیا۔ دیوار پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں' اور کیونکہ میں دیوار کے ساتھ ہی کھڑا تھا اس لیے میرے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے آئے' یہ واقعہ گھر کے اندر پیش آیا"

جج الجھن میں پڑ گیا۔ دونوں گواہوں کے متضاد بیانات کو سچ کیسے مانا جائے۔ یقیناً ان دونوں میں سے کوئی ایک جھوٹ بول رہا تھا۔ ملزم ہنسنے لگا۔ جج نے اس سے ہنسنے کی وجہ معلوم کی تو اس نے کہا" میں بتاتا ہوں کہ یہ دونوں صحیح کہہ رہے ہیں۔ گھر کی چھت ابھی نہیں ڈالی گئی تھی جس کی وجہ سے ستارے دیکھے جاسکتے تھے۔ قتل کھلے آسمان کے نیچے کیا گیا۔ مگر دروازے اور دیوار کے نزدیک جس پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ مکان کی دیواریں اٹھادی گئی تھیں' چھت ڈالنا ابھی باقی تھا اس لیے دونوں سچ کہہ رہے ہیں۔

زندگی میں بڑی پیچیدگیاں ہیں' ہم جن چیزوں کو حقائق کے برعکس سمجھتے ہیں وہ آگے چل کر درست ثابت ہو جاتی ہیں۔ زندگی اضداد کا مجموعہ ہے ...... یہ ایسی نہیں ہے جیسی ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اس کے اندر بہت پیچیدگیاں ہیں۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔

ایک نکتۂ نظر سے موت ہی سب سے بڑا سچ ہے ...... ہم جس طرح جی رہے ہیں اس کا اختتام تو یقیناً ہوگا۔ ہم کو اسی طرح مرنا بھی ہے جس طرح ہم جی رہے ہیں اور جو لائحہ عمل ہم اختیار کیے ہوئے ہیں وہ بھی تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ہماری دنیا جن ستونوں پر کھڑی ہوئی ہے: شوہر' بیوی' باپ' بیٹے' دوست احباب سب کو مر جانا ہے اس کے باوجود موت ایک فریب ہے۔ دھوکہ ہے۔ بیٹے کے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو خود بیٹا نہیں ہے' وہ لافانی ہے۔ باپ میں کوئی ایسی چیز ہے جو خود باپ نہیں ہے' وہ لافانی ہے۔ باپ کو بہر صورت مر جانا ہے' مگر اس کے اندر باپ سے بڑھ کر' تمام رشتے ناطوں سے بڑھ کر کوئی ایسی چیز ہے جسے موت نہیں ہے۔

جسم ضرور فانی ہے مگر اس جسم کے اندر کچھ ایسا بھی ہے جس کو موت نہیں آتی۔ دونوں باتیں شانہ بشانہ درست ہیں۔ اس لیے موت کی حقیقت سمجھنے کے لیے ان دونوں باتوں کو ذہن

میں رکھنا ضروری ہے۔

ایک اور دوست کا سوال ہے:

جن چیزوں کو ہم تباہ کر دینا چاہتے ہیں جیسے اندھے عقیدے اور توہمات ...... آپ کی باتوں سے تو ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کے کہنے کے مطابق موت کے بعد پھر زندگی ہے ...... خدا اور مافوق الفطرت مخلوقات بھی موجود ہیں ...... روحوں کا دوسرے اجسام میں داخل ہو جانا ...... ایسی صورت میں توہمات سے پیچھا چھڑانا کیسے ممکن ہے؟ ...... کیا اس طرح ان توہمات کو مزید تقویت نہیں ملے گی؟

یہاں دو باتوں کو بطور خاص سمجھنے ضرورت ہے۔ اگر کسی بات کو بغیر تحقیق اور تصدیق کے مافوق الفطرت مان لیا جائے تو یہ صورت اس سے بھی زیادہ توہمات کے فروغ کا باعث ہوگی۔ یہ بہت زیادہ وہمی دماغ کی علامت ہے۔ ایک شخص بھوتوں اور بدارواح پر یقین رکھتا ہے' آپ اس کو توہمات میں مبتلا کہتے ہیں ...... آپ کو یقین ہے کہ ایسی کوئی چیز نہیں' اور خود کو بہت زیادہ عقلمند محسوس کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ: توہمات ہیں کیا؟ اگر کوئی تحقیق و تصدیق کیے بغیر بھوت پریت پر یقین رکھتا ہے وہ توہمات میں مبتلا ہے۔ اور کوئی دوسرا جو بغیر تحقیق و تصدیق ان کے وجود سے انکار کرتا ہے وہ بھی توہمات کا شکار ہے۔ کسی چیز کی حقیقت جانے بغیر اس کو تسلیم کر لینا یا تردید کرنا ہی توہمات کے زمرے میں آتا ہے۔ آپ کے اپنے عقائد سے کسی دوسرے کے اختلاف کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہی توہمات میں مبتلا ہے۔

خدا پر یقین رکھنے والا بھی اتنا ہی لاعلم ہو سکتا ہے جتنا اس سے انکار کرنے والا۔ ہمیں فوق الادراک چیزوں کی واضح پہچان قائم کرنی ہوگی۔ بلا تصدیق کیے اندھی عقیدت قائم کر لینا وہم ہے۔ روسی اپنی فکر میں توہماتی طور پر لامذہب ہیں ...... انڈین اپنی فکر میں توہماتی حد تک مذہب پرست ہیں۔ دونوں ہی اندھے عقیدوں میں گرفتار ہیں۔ نہ تو روسیوں نے اپنے عقیدے کی صداقت کے لیے کبھی تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ " خدا نہیں ہے" اور نہ ہی ہندوستانیوں نے خدا کو ماننے سے قبل ضروری سمجھا کہ وہ پہلے تصدیق کر لیں کہ " خدا موجود ہے" اس لیے ایسی غلط فہمی دل سے نکال دیں کہ اکیلے مذہب پرست ہی توہمات کا شکار ہیں' نہیں! لامذہب کے بھی اپنے توہمات ہیں۔ اور زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ سائنسی توہمات بھی موجود ہیں۔ بظاہر یہ دعویٰ

ناقابلِ فہم نظر آتا ہے کہ سائنسی توہمات کی بنیاد کیا ہوگی؟

اگر آپ نے ریاضی پڑھی ہے تو یوکلڈ کے اس نظریے سے بھی ضرور واقف ہوں گے کہ ایک لائن کی لمبائی ہوتی ہے مگر چوڑائی نہیں۔ اب بتائیے کہ اس سے زیادہ وہم کی شکل اور کیا ہوگی؟ چوڑائی کے بغیر کسی لکیر کا تصور کیسے ممکن ہے؟ بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ نکتہ میں نہ تو لمبائی ہوتی ہے اور نہ چوڑائی' یہاں تک کہ بڑے بڑے سائنسدان اسی مفروضے کو بنیاد سمجھتے ہوئے اس پر کام کرتے ہیں۔ کیا کوئی نقطہ لمبائی اور چوڑائی کے بغیر ہو سکتا ہے؟

ہم سب ایک سے نو تک ہندسے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی بھی یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوگا کہ کیا یہ کسی توہم پرستی سے کم ہے؟ نو ہندسے کیوں؟ کوئی سائنسدان نہیں بتا سکتا کہ صرف نو ہندسے ہی کیوں؟ سات کیوں نہیں؟ سات میں خرابی ہے؟ تین کیوں نہیں؟ بہت سے ریاضی دان ہیں جن میں سے ایک 'لائبنز' بھی تھا جو تین ہندسوں تک محدود تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک۔ دو۔ تین کے بعد دس۔ گیارہ۔ بارہ۔ تیرہ...... آتے ہیں' پھر بیس۔ اکیس۔ بائیس اور تئیس وہ اسی نمبر شمار پر عمل کرتا تھا۔ اور بغیر کسی پریشانی کے اسی کو استعمال کرتا رہا۔ اور جو اس کے طریقے کو غلط کہتے تھے وہ چیلنج کر کے ان کو غلط ثابت کر دیتا تھا۔ وہ نو ہندسوں کی ضرورت کا قائل نہیں تھا۔

آگے چل کر آئن اسٹائن نے تین ہندسوں کو بھی غیر ضروری قرار دیا۔ وہ ایک کے بعد صرف دو کو ہی کافی کہتا تھا؛ کیونکہ صرف ایک ہندسے کے ساتھ آگے نہیں چلا جا سکتا البتہ دو تک سب کچھ قابلِ عمل رہ سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ نو تک ہندسوں کی ضرورت صرف سائنسی توہم پرستی ہے۔ مگر سائنس دان اپنے نظریے کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں "نو سے کم ہندسوں کے ساتھ کیسے کام کیا جا سکتا ہے؟" لہٰذا یہ بھی ایک عقیدہ ہی ہے...... اس 'سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

سائنسی نکتۂ نظر سے ہم ہزاروں ایسی باتوں کو درست مانتے ہیں جو درحقیقت توہم پرستی ہے۔ سائنسدان بھی توہم پرست ہیں۔ آج کے دور میں مذہبی توہم پرستی ختم ہوتی جا رہی ہے اور سائنسی توہم پرستی کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ان دونوں کے مابین فرق کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کسی مذہب پرست سے یہ سوال کریں کہ تم نے خدا کو کیسے پہچانا؟ تو وہ کہے گا کہ یہ گیتا میں لکھا ہوا ہے۔ اور جب آپ اس سے پوچھیں کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ حساب میں نو ہندسے

ہوتے ہیں؟ تو وہ ریاضی کی کتابوں کا حوالہ دے دیگا۔

دونوں کے درمیان کونسا واضح فرق ہے؟ ایک سوال کا جواب گیتا اور قرآن سے دیا جاتا ہے' دوسرے کا حساب کی کتابوں سے۔ پھر بھی کچھ فرق تو ہوگا؟ اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ ہم کو توہم پرستی کی حقیقت جاننے کی ضرورت ہے۔ توہم پرستی وہ ہے جو ہم عدم واقفیت کی بنا پر صحیح یا غلط سمجھتے ہیں۔ ہم بہت سی باتوں کو صحیح اور بہت سی باتوں کو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بھی توہم پرستی ہے۔

فرض کریں ایک گاؤں میں ایک آدمی بھوت کے قبضے میں ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ کہیں گے کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ آیئے ہم تعلیم یافتہ انسانوں کو توہم پرست فرض کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم پہلے ہی ان لوگوں پر توہم پرستی کی چھاپ لگا دیتے ہیں جو سادہ اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر اپنے عقیدے کے حق میں دلائل نہیں دے سکتے۔ اس لیے گاؤں کے تمام تعلیم یافتہ لوگ اس کے اوپر بدروحوں کے تسلط کو جھوٹا قرار دیتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک شعبہ بھوتوں اور بدارواح کے مسئلے پر تحقیق کرنے میں مصروف ہے۔ اس شعبے نے ان کی تصاویر بھی جاری کی ہیں۔ ایسے لوگوں کو قطعی علم نہیں کہ دورِ حاضرہ میں بہت سے نامی گرامی سائنسدان بھوتوں اور بدارواح کے سلسلے میں بہت گہرائی میں جانے کی کوششوں میں مصروف ہیں' اور ایسے بہت سے نتائج نکال لیے ہیں جو جلد یا بدیر یہ ثابت کر دیں گے کہ وہ تعلیم یافتہ لوگ توہم پرست تھے جو ان لوگوں کو بلا تحقیق جھوٹ قرار دیتے تھے جو اپنے عقائد کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوئے جو کچھ کہتے تھے وہ صحیح تھا۔

اگر آپ ریان یا اولیور لاج کا مطالعہ کریں تو آپ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اولیور لاج ایک نوبل انعام یافتہ سائنسدان تھا۔ اپنی پوری زندگی اس نے بھوتوں اور روحوں کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے گذار دی۔ اپنی موت سے قبل اس نے ایک دستاویز تیار کی جس میں اس نے انکشاف کیا" سائنس کے جتنے حقائق میں نے دریافت کیے ان میں بھوتوں اور روحوں کے بارے میں آدھی سچائی بھی نہیں ہے۔ کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ تعلیم یافتہ وہی لوگ اُن دریافتوں کے بارے میں کچھ جاننا ہی نہیں چاہتے جو دنیا میں رونما ہو رہی ہیں"

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ دوسروں کے خیالات پڑھ سکتا ہے تو ہم اس کو توہم پرست

کہہ دیں گے۔روس! جہاں بہت قابل سائنسدان موجود ہیں وہاں ماسکو میں فیودوف نام کا ایک بہت بڑا سائنسدان بھی رہتا ہے جس نے ماسکو میں بیٹھے ہوئے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع طفلس کے مقام پر ایک شخص کے ذہن میں کسی ظاہری وسیلے کے بغیر اپنے خیالات منتقل کر دیے۔سائنسی جائزے کے بعد اس کو صحیح تسلیم بھی کیا گیا۔اب دیگر سائنسدان اس نوع کے تجربات میں مصروف ہیں کیونکہ جلد یا بدیر اس طریقے کو خلائی سفر کے دوران استعمال کیا جا سکتا ہے خلائی جہاز میں کسی فنی خرابی کے باعث سائنسدان اس کو آپس کے رابطوں میں استعمال کر سکتے ہیں' دوسری صورت میں خلائی جہاز ہمیشہ کے لیے خلاؤں میں گم ہو سکتا ہے۔اس سے قطعِ نظر روسی سائنسدان ٹیلی پیتھی (لاسلکی مواصلات) کے شعبے میں بہت سے تجربات کر رہے ہیں اور بہت سے مفید نتائج بھی حاصل کر چکے ہیں۔

فیودوف اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر تحقیقات میں مصروف ہے۔ہزاروں میل کی دوری پر واقع طفلس میں اس کا دوست وائرلیس سیٹ لے کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رہے۔کچھ دیر بعد اس کے دوست نے فیودوف کو آگاہ کیا کہ ایک شخص پارک میں آ کر بنچ نمبر دس پر بیٹھ گیا ہے۔اس نے فیودوف سے کہا کہ اس آدمی کو پیغام بھیجے کو وہ تین منٹ کے اندر سو جائے۔وہ شخص مکمل بیدار تھا' اور تمباکو نوشی کے ساتھ خود کلامی میں مصروف تھا۔فیودوف نے اس کو ہدایات بھیجنی شروع کیں......وہی ہدایات جو میں آپ کو دیتا ہوں: "تم سکون محسوس کر رہے ہو......تم سکون محسوس کر رہے ہو!" ہزاروں میل کی دوری سے فیودوف اس کو تین منٹ تک انہماک سے ہدایات دیتا رہا" سو جاؤ......سو جاؤ" اور بنچ نمبر دس پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے مسلسل یہی پیغام بھیجتا رہا کہ سو جاؤ......سو جاؤ۔پورے تین منٹ میں اس شخص کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا اور وہ نیند کی دنیا میں جا کھویا۔

یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔شاید بنچ پر بیٹھا ہوا وہ آدمی تھکا ہوا ہو جس کی وجہ سے اس کو نیند آ گئی۔اس وجہ سے فیودوف کے دوست نے کہا کہ بنچ پر بیٹھا ہوا آدمی یقیناً سو چکا ہے لیکن یہ ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔اس لیے اس کے دوست نے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ اب اس آدمی کو کل سات منٹ میں بیدار کیا جائے۔پھر فیودوف اس کو سات منٹ میں بیدار ہو جانے کے پیغامات بھیجتا رہا اور عین سات منٹ بعد اس شخص نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔بنچ پر

بیٹھا ہوا وہ آدمی بالکل اجنبی تھا۔اس کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔اور فیودوف کے دوست نے اس کے پاس جا کر پوچھا کہ کیا کوئی غیر معمولی بات رونما ہوئی ہے؟

اس آدمی نے جواب دیا کہ ہاں! میں بہت حیران ہوں' میں یہاں کسی کے انتظا میں آ کر بیٹھا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نیند آ رہی ہے۔مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہا اور میں سو گیا۔پھر مجھے شدید احساس ہوا کہ کوئی مجھے سات منٹ میں اٹھ جانے کے لیے کہہ رہا ہے۔میں اس سارے واقعہ کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتا۔" اس شخص کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔

بغیر کسی وسیلے کے خیالات کی ترسیل ایک سائنسی حقیقت بن چکی ہے۔مگر کوئی تعلیم یافتہ شخص اس کو توہم پرستی کہہ سکتا ہے۔اب یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دور افتادہ مقام پر ایک بیمار آدمی کا علاج کسی دوسرے قصبے میں بیٹھ کر بھی کر دیا جائے' اب یہ کوئی مشکل کام نہیں رہا۔یہ بھی ممکن ہے کہ سانپ کے کاٹے کا علاج ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے کیا جا سکے۔اس میں بھی کوئی قابلِ ذکر مشکل نہیں۔مگر توہم پرستی کی اور بھی بہت سی قسمیں ہیں۔اور یہ بھی خیال رہے کہ ایک تعلیم یافتہ انسان کی توہم پرستی ایک غیر تعلیم یافتہ شخص کے مقابلے میں خطرناک ہے' کیونکہ وہ اپنی توہم پرستی کو توہم پرستی ماننے کے لیے تیار نہیں۔اس کے لیے وہ اس نتیجے کی حیثیت رکھتی ہے جو بہت گہرے سوچ بچار کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔

اب ہمارے اس دوست نے کہا ہے کہ ہم کو توہم پرستی کی یہ زنجیر توڑنی ہو گی۔مگر پہلے اس بات کا فیصلہ کر لیا جائے کہ ایسی کوئی زنجیر موجود ہے؟ ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں آپ کسی کے ہاتھ پاؤں توڑ بیٹھیں۔زنجیریں اسی وقت توڑی جا سکتی ہیں جب وہ موجود ہوں۔اگر وہ موجود ہی نہ ہوں تو؟ اس بات کا بھی یقین کر لیں کہ جس کو آپ زنجیر سمجھ رہے ہیں وہ کوئی ایسا زیور تو نہیں جو آپ کو دوبارہ بنانا پڑے؟ یہ تمام باتیں گہرے سوچ بچار کا تقاضہ کرتی ہیں۔

میں خود توہم پرستی کے بالکل خلاف ہوں...... میں چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے توہمات ختم کیے جانے چاہئیں اور اس بات کا یہ مطلب بھی نہ لیا جائے کہ ان کے خاتمے کے بارے میں کسی وہم میں مبتلا ہوں۔میں نہیں چاہتا کہ کوئی بلا سوچے سمجھے ان کے خاتمے پر تل جائے۔کیونکہ مکمل آگہی کے بغیر کوئی بھی ان کے خاتمے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔پھر یہ متفقہ خاتمہ بھی توہم پرستی کا شاہکار بن جائے گا۔

ہر عمر کے اپنے توہمات ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ توہم پرستی کی کئی شکلیں ہیں۔ ہر عمر میں توہمات مختلف شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لوگ پرانے توہمات کو چھوڑ کر نئے توہمات اختیار کر لیتے ہیں مگر ان سے ہمیشہ کے لیے پیچھا نہیں چھڑاتے' بلکہ ردوبدل کر کے ان کو جاری رکھتے ہیں۔ مگر ہم تسلیم نہیں کرتے۔

مثلاً ایک وقت میں یہ واہمہ تھا کہ ماتھے پر تلک لگانے والا ایک مذہبی شخص ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پیشانی پر نشان لگا لینے سے مذہب کا کیا واسطہ؟ مگر اس کو ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور جو تلک نہیں لگاتا تھا اس کو غیر مذہبی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب اس پرانے توہم کا رواج نہیں ہے۔ مگر اب ہم نئے نئے توہمات کا شکار ہیں جو پہلے کی طرح ہی احمقانہ ہیں۔ اگر کوئی شخص ٹائی باندھتا ہے تو اس کو ممتاز خیال کیا جاتا ہے' ورنہ ایک معمولی انسان سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی کسی فرق کے بغیر وہی بات ہے۔ ٹائی نے تلک کی جگہ لے لی ہے' جبکہ آدمی وہی کا وہی ہے۔ بتائیے کوئی فرق ہے؟

ٹائی کس حیثیت میں تلک سے بہتر ہے؟ بلکہ یہ تو شاید اس سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ تلک لگانے سے کچھ تو مراد لی جاتی تھی۔ اس ملک میں ٹائی لگانا تو بالکل بے معنی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی اور ملک میں اس کے کچھ معنی لیے جاتے ہوں۔ سرد ممالک میں تو بہرحال اس سے گلے کو سردی سے محفوظ رکھنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ ان ملکوں میں اگر کسی کو ٹائی کی استطاعت نہ ہو تو یقیناً اس کو غریب آدمی سمجھا جاتا ہوگا۔ صاحب حیثیت آدمی تو گلے کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹائی استعمال کرسکتا ہے' لیکن جب اس جیسے گرم ملک کا کوئی باشندہ ٹائی باندھے ہوئے دکھائی دیتا ہے تو اچنبھا ہوتا ہے...... کہ یا تو وہ کوئی بہت امیر کبیر شخص ہے یا اپنے حواس میں نہیں ہے۔

مگر امیر کبیر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں گرمی سے مرتا رہے مگر اپنی گردن میں یہ پھندہ ضرور ڈالے رہے۔ ٹائی کا مطلب ہے پھندہ؛ ٹائی سے مراد ہے گانٹھ۔ اس کو کسی سرد ملک میں استعمال کرنا تو سمجھ میں آتا ہے' مگر کسی گرم ملک میں یہ بالکل بے معنی ہے۔ پھر بھی ایسے لوگ جو اس کو اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ سمجھتے ہیں' جیسے کوئی مجسٹریٹ' اٹارنی' سیاست دان...... اپنی گردن میں یہ پھندا لٹکائے پھرتے ہیں۔ اور اسی قسم کے لوگ تلک لگانے والے کو وہمی قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ کیا ٹائی باندھنے کے پیچھے کوئی توہم کارفرما نہیں ہے؟ آپ کونسے

سائنسی کلیے کی بدولت اس پھندے کو اپنے گلے میں ڈالے پھر رہے ہیں؟ مگر کیونکہ ٹائی آج کے دور کا رائج واہمہ ہے اس لیے قابل قبول ہے۔ اور تلک چونکہ پرانے وقت کا واہمہ ہے اس لیے قابلِ قبول نہیں۔

جیسا میں نے پہلے کہا کہ جس طرح سرد ممالک میں ٹائی باندھنے کا کچھ مقصد سمجھ میں آتا ہے' اسی طرح تلک لگانے کا بھی کچھ نہ کچھ مقصد ہوسکتا ہے' مگر اس کو جانے بغیر یہ کہہ دینا کہ یہ توہم پرستی ہے' احمقانہ اور غلط ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کو اس کے پس منظر کے بارے میں کبھی کچھ بتایا ہی نہیں گیا ہو۔ لوگ اس کو توہم پرستی کی وجہ سے ہی لگاتے ہیں' لیکن جب پہلی بار تلک لگایا گیا تو اس کے پیچھے سائنسی توجیہ موجود تھی۔ تلک پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان اس جگہ لگایا جاتا ہے جہاں 'آ گیا چکر' یا 'تیسری آنکھ' کا چکر واقع ہے۔ معمولی استغراق سے ہی اس جگہ حدت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ گرمی صندل کی لکڑی لگانے سے کافور بھی ہو جاتی ہے۔ صندل کی لکڑی لگانا ایک اعلیٰ درجے کی سائنسی ترکیب ہے' جو اب متروک ہو چکی ہے۔ لوگوں کا اس سائنس سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب صرف وہی لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں جن کو آ گیا چکر کے بارے میں کچھ علم ہو یا اگر کبھی انھوں نے استغراق کی مشق کی ہو۔

گرم ممالک میں لوگوں کو ٹائی استعمال کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جس طرح سرد ممالک میں ٹائی کے استعمال کے پیچھے کوئی سائنسی وجہ ہوسکتی ہے' اسی طرح جو لوگ آ گیا چکر کے لیے توجہ مرتکز کرتے وقت تلک لگاتے ہیں اس کی بھی سائنسی وجہ موجود ہے کہ صندل کی لکڑی اس مقام کو ٹھنڈا رکھتی ہے۔ آ گیا چکر کے لیے استغراق کرنے سے ایک تحریک پیدا ہوتی ہے جو اس مقام پر حدت پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے...... اس کو ٹھنڈا رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ دماغ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ تمام تلک صاف کر دیے جائیں تو ہم یقیناً ان لوگوں سے اسے واپس لے لیں جو اس کو بلاوجہ لگاتے ہیں۔ مگر ہمیں اس غریب آدمی کی پیشانی سے بھی اس کو ہٹانا پڑے گا جس نے اپنی کسی غرض سے اس کو لگایا ہوگا۔ اور اگر وہ اسے ہٹانے کے لیے آمادہ نہ ہوسکے تو ہم اس کو توہم پرست کہیں گے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم یہ جاننا نہیں چاہتے کہ کیا چیز توہم پرستی ہے' اور کیا نہیں ہے۔ ایک چیز جو بعض مخصوص حالات میں توہم پرستی کے زمرے میں آتی ہے بعض دوسرے

حالات میں وہی سائنسی حقیقت بن جاتی ہے۔ کوئی چیز جو بعض حالات میں سائنسی لگتی ہے وہی دوسرے حالات میں غیر سائنسی لگتی ہے۔

مثال کے طور پر تبت میں عام رواج ہے کہ وہاں لوگ سال میں ایک مرتبہ غسل کرتے ہیں...... یہ بات اس لیے قابلِ قبول ہے کہ تبت میں گرد و غبار نہیں ہوتا اور موسم ٹھنڈا رہتا ہے' لوگوں کو پسینہ نہیں آتا جس کی وجہ سے ان کو نہانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ روزانہ نہانے سے ان کے جسم کو نقصان پہنچتا ہے' ان کے جسم کی حدت کم ہونے سے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ اس حدت کا متبادل ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ تبت میں برہنہ تن پھرنا آسان نہیں ہے' وہاں اگر ایک آدمی تمام دن برہنہ پھرتا رہے تو اس کو زائل شدہ کیلوریز کے حصول کے لیے معمول سے چالیس فیصد زائد خوراک کی ضرورت پڑے گی۔ جو وہاں ایک مہنگا سودا ہے۔ اگر انڈیا جیسی جگہ پر کوئی شخص برہنہ نکل آئے تو اس کو قابلِ احترام سمجھتے ہوئے کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا۔ مہاویر سمجھدار تھا...... وہ برہنہ تن پھرتا تھا' اور اس جیسے کسی گرم ملک میں جتنی حدت جسم سے خارج ہوتی ہے' اتنا ہی اندر ٹھنڈک کا احساس بڑھتا ہے۔ لیکن مہاویر کا کوئی چیلا اگر برہنہ تن تبت آ جائے تو اس کے لیے ذہنی ہسپتال داخلے کے لیے موزوں ترین جگہ سمجھا جائے گا۔ تبت میں اس طرح نمودار ہونا قطعی غیر انسانی' غیر سائنسی' اور پاگل پن ہے۔ مگر کیا کریں کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے۔

جب کوئی لامہ ہندوستان آتا ہے تو وہ کبھی نہیں نہاتا۔ ایک بار میں بدھ گیا میں تبت کے لاماؤں کے ساتھ ٹھہرا۔ ان کے پاس سے اتنی بدبو اٹھ رہی تھی کہ ان کے ساتھ بیٹھنا اذیت کے مترادف تھا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ ایسے کیوں ہیں؟ تو کہنے لگے کہ ہم سال میں ایک مرتبہ نہانے کے اصول پر کاربند ہیں۔ یہی وہ موقعہ تھا جب مجھ پر سائنس اور توہم پرستی کے درمیان فرق منکشف ہوا۔ جو بات تبت میں سائنس ہے وہی بات انڈیا میں توہم پرستی ہے۔ یہاں یہ لاما بے نیازی کے ساتھ پسینے میں شرابور ناخوشگوار بو خارج کر رہے ہیں یہ جانے بغیر کہ یہاں کی فضا میں ہر طرف گرد و غبار چھایا ہوا ہے۔

دنیا میں ایسے ممالک ہیں جہاں گرد و غبار بالکل نہیں ہوتا۔ جب خروشیف پہلی بار انڈیا آئے تو ان کو تاج محل دکھانے کے لیے آگرہ لیجایا گیا راستے میں انہوں نے گرد و غبار کا بھنور بنتا ہوا دیکھا تو انھوں نے کار رکوائی اور عین اس بھنور کے درمیان جا کھڑے ہوئے۔ وہ بہت خوش تھے اور

کہنے لگے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ اس سے پہلے مجھ کو کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔ ہم لوگ ایسے گرد و غبار میں گھر جانے کو خوش قسمتی نہیں قرار دے سکتے' مگر وہ جہاں سے آئے تھے وہاں گرد و غبار کے بجائے برف کے نیزے ہوتے ہیں۔ یہ ان کے لیے ایک ایسا ہی دلچسپ تجربہ تھا جیسا ہم کو برفانی علاقوں میں ہو سکتا ہے۔ ہمیں ہمالیہ کی برف پر چلنے سے کتنا لطف آتا ہے۔

لہٰذا بغیر سوچے سمجھے چیزوں کی توڑ پھوڑ شروع نہیں کر دینی چاہئے۔ پہلے ان کی عمر' ان کی کیفیات اور ان کی منفعت کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

ایک سائنسی ذہن رکھنے والا انسان کبھی عجلت میں یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ یہ صحیح ہے یا یہ غلط ہے۔ وہ ہمیشہ یہ کہتا ہے کہ شاید یہ صحیح ہو' لیکن پہلے مجھے مزید چھان پھٹک کر لینے دو! یہاں تک کہ چھان بین کے ذریعے حاصل ہونے والے حتمی نتیجے کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں ہوتا اور کسی چیز کو ترک کر دینے کا حامی نہیں ہوتا۔ زندگی اتنی پراسرار ہے کہ اس کے بارے میں فیصلہ کن لہجے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ "اب تک ہم اتنا ہی جان سکے ہیں' اور حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں فلاں فلاں چیز غلط دکھائی دیتی ہے" اور بس! سائنسی رجحان رکھنے والا کوئی شخص کہے گا "اب تک کی حاصل شدہ معلومات کے تحت فلاں اور فلاں چیز آج تک تو صحیح نہیں لگتی' البتہ مزید تحقیقات کے بعد ممکن ہے کہ کل صحیح لگنے لگے' جو چیز آج صحیح لگتی ہے ممکن ہے کہ کل وہ غلط لگنے لگے" ایسے لوگ جلد بازی میں کبھی فیصلہ نہیں کرتے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ وہ ہمیشہ متجسس ذہن کے ساتھ جانچتے رہنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔

توہمات میں مبتلا رہنا بھی لطف اندوزی کا باعث ہوتا ہے اور اس کی مخالفت بھی۔

توہمات میں مبتلا رہنا ان معنوں میں پر لطف ہوتا ہے کہ اس سے ہمارا ذہن سوچنے سمجھنے کی طرف سے بے نیاز ہو جاتا ہے...... بس ہم وہی سب مانتے ہیں جو دوسرے مانتے ہیں۔ ہم اس کی وجہ تسمیہ تک جاننا نہیں چاہتے' نہ اس کی غرض و غایت۔ پیچیدگی میں کیوں جائیں؟ بس جدھر بھیڑ جا رہی ہے ادھر ہی چلے جانا ہے۔ توہمات میں مبتلا رہنا بہت آسان ہے۔

کچھ لوگ تو اول درجے کے وہمی ہوتے ہیں...... یہ بھی بہت آسان ہے...... جو لوگ ان کے وہم کا باعث ہوتے ہیں وہ دانشمند نہ ہونے کے باوجود بظاہر دانشمند دکھائی دیتے ہیں' دانشمند ہونا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہر چیز کو باریک بینی سے دیکھنے کے لیے تمام اعصاب

نچوڑنے پڑتے ہیں۔ایسے لوگ ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرنے کے باوجود ان کو ترتیب وار بیان نہیں کر سکتے۔اوران کا بیان مشروط ہوتا ہے۔وہ کہتے ہیں "ایسی حالت میں یہی بہتر ہے کہ تبت میں نہایا نہ جائے' اور دیگر حالات میں یہ محض توہم پرستی ہوگی کہ انڈیا میں نہانے سے بچا جائے۔جو لوگ فلسفیانہ طرزِ فکر کے حامل ہیں وہ ایسی ہی گفتگو کرتے ہیں۔

دوسری طرف اصلاحِ معاشرہ کے کارکن اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؛ ان کو بس چیزوں کی توڑ پھوڑ سے دلچسپی ہوتی ہے' وہ تو بس کچھ چیزوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں؛ میں کہتا ہوں کہ آگے آؤ اور ان کو تباہ کر دو...... بہت سی ایسی چیزیں جن کو ختم کر دینا چاہئے۔جیسے سمجھ بوجھ سے محرومی۔کسی چیز کے بارے میں پیشگی غور وفکر کیے بغیر اس کو تباہ کر دینے کا رجحان وہ اولین ترجیحات ہیں جن کو تباہ ہونا چاہئے۔لہٰذا مطلب یہ ہے کہ: اگر آپ بلا سوچے سمجھے کسی چیز کو تباہ کرنے کے درپے ہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔معقول طرزِ فکر اختیار کرنا اور بے عقلی کی باتوں سے اجتناب کرنا وقت کی ضرورت ہے۔اس سے ہم بدلے ہوئے تناظر میں بہتر نتائج حاصل کر سکیں گے۔پھر ہم بہتر کھوج لگانے اور سوچ سمجھ کر استدلال دینے کے قابل ہو سکیں گے۔پھر ہمارے پیشِ نظر ہر قسم کے امکانات باقی رہ سکیں گے۔

مغرب میں تحلیل نفسی کا بہت رجحان ہے' اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تحلیل نفسی بالکل اسی طرز پر کام کر رہی ہے جیسے ماضی میں گاؤں کا جادوگر ڈاکٹر کیا کرتا تھا۔ان دنوں فرانس میں کووئیر نے ایک نئی مذہبی تنظیم متعارف کرائی ہے۔کووئیر انہی اصولوں پر کام کر رہا ہے جس پر جادوگر ڈاکٹر عمل کیا کرتے تھے' سوائے اس کے کہ کووئیر ایک سائنسدان ہے اور سائنس کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔اس کے علاوہ کسی فرق کے بغیر ہر چیز جوں کی توں ہے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ایک سادھو' گاؤں کا ایک سادہ سا آدمی' جسے علم الادویہ سے کوئی علاقہ نہیں کسی بیمار کو اللہ کے نام پر ایک چٹکی راکھ دیتا ہے تو اس کو توہم پرستی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اتنی ہی موثر ہوتی ہے جتنی کسی ایلو پیتھک ڈاکٹر کی دوا۔حیرت انگیز طور پر اسی تناسب سے۔اس سلسلے میں اس علاقے میں تجربات بھی کیے جا رہے ہیں۔

اپنی طرز کا ایک منفرد تجربہ لندن ہسپتال میں کیا گیا۔ایک ہی بیماری میں مبتلا سو مریضوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا' پچاس کو معمول کے انجکشن دیے گئے' اور پچاس کو سادہ پانی

کے انجکشن لگائے گئے۔اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں گروپوں میں صحت یاب ہونے والے مریضوں کا تناسب یکساں تھا۔جس پر سوال اٹھایا گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

اس تجربے کی روشنی میں یہ ضروری ہو گیا کہ معاملے کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھا جاتا اور جو نتیجہ نکالا گیا وہ یہ تھا کہ دوا سے زیادہ یہ بات اثر کرتی ہے کہ مریض کو دوا مل گئی۔اور یہاں تک کہ دوا مل جانا اتنا موثر نہیں ہوتا جتنا یہ خیال کہ دوا کتنی مہنگی ہے اور ڈاکٹر کتنا مشہور ہے۔ایک غیر معروف ڈاکٹر علاج میں اس لیے ناکام نہیں ہوتا کہ وہ اپنے کام سے واقف نہیں ہے' مگر اس لیے کہ وہ زیادہ مشہور نہیں ہے۔مشہور ڈاکٹر اپنے مریض کو فوراً متاثر کر لیتا ہے۔اپنے مرعوب کن حلیہ سے...... شاندار سیٹ اپ سے ......اپنی فیس سے ...... لمبی کار سے ...... ملاقات کے لیے لمبے انتظار سے......بھیڑ سے ......لمبی قطار سے آپ پہلے ہی مرعوب ہو جاتے ہیں اس سے قطعِ نظر کہ وہ جو کچھ آپ کو دے رہا ہے وہ موثر بھی ہے یا نہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اچھا ڈاکٹر ہونے کے لیے دواؤں کے بارے میں اچھی معلومات ضروری نہیں۔بلکہ آپ کو پبلسٹی کے موثر طریقوں سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔آپ کو اپنی پبلسٹی کیسے کرنی ہے؟ دوائیں اتنی فائدہ مند نہیں جتنی کہ پبلسٹی۔

حال ہی میں ایک طبی سروے سے معلوم ہوا کہ فرانس میں اسی ہزار معالج ہیں اور کم و بیش سولہ ہزار عطائی۔جب کوئی مریض سند یافتہ معالج سے علاج کرا کر عاجز آ جاتا ہے تو ان کے علاج سے ٹھیک ہو جاتا ہے جو دواؤں کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے۔لیکن مریضوں کا علاج کرنے کی ترکیب ان کو خوب آتی ہے۔یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر قسم کے طریقۂ علاج دستیاب ہیں۔آپ تصور کریں کہ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ طریقۂ علاج خوب پنپ رہے ہیں۔قدرتی طریقۂ علاج زیرِ استعمال ہے...... پیٹ پر مٹی کا لیپ کام کر رہا ہے...... پانی کا انیما کام کر رہا ہے...... جادوگر ڈاکٹر کے منتر کام کر رہے ہیں۔یہاں تک کہ ہومیو پیتھی بھی جو چھوٹی چھوٹی میٹھی گولیوں کے سوا کچھ اور نہیں۔ان سب کا کام بھی چل رہا ہے اور ایلو پیتھی کا بھی۔

اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مریض صحت یاب کیسے ہو رہے ہیں؟ اگر گاؤں کا سنیاسی ویدراکھ کی چٹکی سے مریض کا علاج کر رہا ہے' تو ہم پر لازم ہے کہ اس بارے میں سنجیدگی سے غور کریں۔بطورِ خاص ہم کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اس نوعیت کے توہمات کو ختم کرنا چاہیے یا

نہیں۔ اگرچہ گردن میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے اور ایک بڑی سی کار میں سوار ایک آدمی سائنسی طریقے سے مریضوں کا علاج کر رہا ہے ......مگر جادو وہاں بھی کام کر رہا ہے......کار کا جادو...... اسٹیتھو اسکوپ کا جادو!

ایک عطائی سے میں بھی واقف ہوں! اس کے پاس کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں ہے' اس کے باوجود اس نے میرے بھیجے ہوئے کئی مریضوں کا کامیاب علاج کیا' جن کو دوسرے ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ وہ ہوشیار آدمی ہے اور انسانی نفسیات میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ اور اصل میں یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے پیشہ ور معالج بنا جا سکتا ہے۔ بنابریں جب آپ اس کے مطب میں علاج کے لیے جائیں گے تو آپ کا معائنہ اس طرح کیا جائے گا کہ آپ کا آدھا مرض تشخیص کے دوران ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ حد سے زیادہ ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ دوسرے ڈاکٹر اس سے حسد محسوس کرتے ہیں۔

اس کا معائنہ کا کمرہ خاصا بڑا اور پروقار ہے جس میں ایک بڑی سی میز پر مریض کو لٹایا جاتا ہے۔ مریض کے سینے کے اوپر کوئی ایسی چیز لٹکی ہوتی ہے جو اسٹیتھو اسکوپ سے مشابہ ہے۔ یہ عجیب و غریب اختراع دو عدد شیشے کی شفاف نلکیوں سے جڑی ہوئی ہے جن میں رنگین پانی بھرا ہوا ہے۔ جب وہ اسٹیتھو اسکوپ نما یہ اختراع مریض کے سینے سے لگاتا ہے تو وہ رنگین پانی اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ اوپر نیچے ہوتا ہے۔ مریض جب رنگین پانی کو نلکی میں اچھلتا دیکھتا ہے تو اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعتاً ایک بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس آ گیا ہے۔ ایسا ڈاکٹر اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو آلہ وہ اسٹیتھو اسکوپ کی طرح استعمال کرتا ہے اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسے کان میں نہیں لگاتا اس کے بجائے وہ نلکیوں میں پانی کو اوپر نیچے ہوتا ہوا دیکھتا ہے اور مریض کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی معمولی ڈاکٹر نہیں ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ایلو پیتھک ڈاکٹر اپنا نسخہ عجیب و غریب لکھائی میں کیوں لکھتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ ان کی تحریر پڑھ سکتے تو وہ معمولی سی دوا آپ خود جا کر بازار سے خرید لیتے۔ جبکہ وہ تحریر دانستہ ایسے لکھی جاتی ہے کہ آپ کوشش کے باوجود اسے پڑھ نہیں سکتے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ وہ نسخہ دوبارہ اس کے پاس لے جائیں تو وہ خود بھی نہیں سمجھ پائے گا کہ اس نے کیا لکھا تھا۔ دوسری دلچسپ بات یہ کہ دواؤں کے نام ہمیشہ لاطینی یا یونانی زبان میں

لکھے جاتے ہیں۔ وجہ سادہ سی ہے کہ اگر وہ انگلش یا ہندی میں لکھ دے تو آپ اس کو ایک انجیکشن کے دس اور پندرہ روپے کیوں دینے لگے؟ آپ جان جائیں گے کہ وہ زیرہ کے پانی کے سوا کچھ اور نہیں۔

یہ سب جادوئی ترکیبیں ہیں۔ جیسے ایک دیہاتی اپنے مریض کو راکھ کی چٹکی دیتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اس کو اپنے حلیہ میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے' اگر وہ سرخ چولا زیب تن کرے تو زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر اس کی شہرت ایماندار' نیک' رحمدل اور سچے کے طور پر ہو تو راکھ کی چٹکی اور بھی زیادہ اثر کرے گی۔ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ کوئی پیسہ پائی نہیں لیتا' بلکہ وہ تو پیسوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا' پھر تو وہ راکھ کی چٹکی بجلی کی طرح کام کرے گی۔ لہٰذا یہ راکھ کی چٹکی کام نہیں کرتی بلکہ در پردہ کچھ اور عوامل کام کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہوشمندی سے فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس قسم کے علاج جاری رکھنا مفید ہیں یا نہیں؟ اگر آپ اس قسم کے علاج پر پابندی لگائیں گے تو اسی نوع کے دوسرے علاج ان کی جگہ لے لیں گے۔ اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو دانشمندی سے غور کرنا چاہئے کہ وہ اپنے اوپر مصنوعی بیماریاں مسلط نہ کریں۔ جب تک مصنوعی بیماریوں کا رواج رہے گا تب تک جھوٹے معالج بھی موجود رہیں گے۔ اگر آپ پرانے غیر رسمی طریقے ترک کر دیں تو ان کی جگہ نئے طریقے پیدا ہو جائیں گے......اور اگر آپ ان کو بھی ختم کر دیں تو اس کے بعد بھی نئے نئے علاج سامنے آتے رہیں گے۔ دنیا میں بے شمار طریقہ علاج ہیں' لیکن یہ فیصلہ ممکن نہیں کہ کونسا درست ہے۔ سب کا ہی دعویٰ ہے کہ وہ کامیاب علاج کرتے ہیں۔ اور یہ دعویٰ غلط نہیں ہے کیونکہ وہ واقعی علاج کرتے ہیں۔

ہم جتنا انسانی نفسیات کا کھوج لگائیں گے اتنا ہی واضح ہوتا جائے گا کہ ہر بیماری انسانی دماغ کے کسی پوشیدہ حصے میں ہوتی ہے۔ اور جب تک بیماری وہاں موجود رہے گی تب تک جعلی طریقے بھی جاری رہیں گے۔ میں جعلی طریقہ علاج سے کوئی پرخاش نہیں رکھتا' البتہ مجھے بطور خاص انسانی دماغ میں موجود بیماریاں دور کرنے سے دلچسپی ہے۔ اگر انسان کے دماغ سے بیماری دور ہو جائے' اگر انسان کا شعور بیدار ہو جائے' اگر وہ فرق جاننے کا اہل ہو جائے' تو وہ پریشان کن حالات میں نہ گھرا رہے۔ سو اگر آپ جا کر راکھ لا رہے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ گاؤں میں ایک

شخص راکھ بانٹ رہا ہے......نہیں!...... بلکہ آپ اس راکھ کے لیے اس وجہ سے مضطرب ہیں کوئی شخص اسے کسی وجہ سے تقسیم کرر ہا ہے۔

کوئی شخص خود بخود آپ کا لیڈر نہیں بن جاتا...... یہ آپ خود ہیں جو اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے۔ اسی وجہ سے کوئی نہ کوئی آپ کا لیڈر بن جاتا ہے۔ اگر آپ ایک لیڈر سے پیچھا چھڑا لیں گے تو دوسرا اور اس کے بعد تیسرا اس کی جگہ لیتا رہے گا۔ اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ جب آپ ایک لیڈر کو مسترد کرتے ہیں تو اس سے پہلے کسی دوسرے کو اس کی جگہ دے چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے پوری دنیا میں لیڈروں کو اس بات کا علم ہے اور وہ اپوزیشن پارٹیوں کی سربراہی کرتے رہتے ہیں۔ انہیں پورا اعتماد ہے کہ جب لوگ ایک لیڈر سے اکتا جاتے ہیں تو وہ خود بخود دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں' اور جب دوسرے سے اکتا جاتے ہیں تو پھر پہلے والے کو ہی منتخب کر لیتے ہیں۔ یہ اسی کی وجہ ہے کہ ہر ملک میں عموماً دو پارٹیاں ہی سیاست کرتی ہیں۔ ہر جگہ ایک جیسے لوگ ہوتے ہیں۔

پچھلے انتخابات کے موقعہ پر میں راجپور میں تھا' میرا ایک دوست جو راجپور کا پرانا باشندہ ہے' پارلیمنٹ کے کئی گذشتہ انتخابات میں کامیاب ہو چکا تھا' مگر اس بار اسے شکست ہوگئی۔ میرا ایک دوسرا دوست جو بالکل غیر معروف بھی تھا اور راجپور میں نیا نیا آیا تھا' وہ اس کی جگہ منتخب ہوگیا۔ میں نے اپنے دوست سے اس کی وجہ پوچھی کہ وہ کیوں ہار گیا اور ایک بالکل اجنبی کیسے کامیاب ہوگیا؟

اس نے کہا" یہ کوئی نئی بات نہیں! لوگ باگ میرے عادی ہو گئے تھے' یہ شخص بالکل نیا ہے' لوگ اس کو پوری طرح نہیں جانتے۔ آپ بے فکر رہیں' ذرا اس کو تھوڑا معروف ہونے دیں پھر وہ بھی ہار جائے گا۔ تب تک میں اپنا وقت گذار لوں گا' اور ان کے حافظے سے اتر جاؤں گا تو مجھے پھر وہی حیثیت حاصل ہو جائے گی"

کہیں بہت گہرائی میں سوال کسی لیڈر کو ہٹانے کا نہیں ہے' نہ کسی واہمے سے پیچھا چھڑانے کا...... اصل مسئلہ یہ نہیں ہے...... مسئلہ ہے انسان میں بنیادی تبدیلی لانے کا۔ ایک سائنسی ذہن' روشن خیال انسان تو کسی واہمے کی پرواہ نہیں کرتا...... مگر توہمات اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک انسان اپنی عقل کے اندھے پن پر مطمئن ہے۔ جب تک انسان اپنے

شعور کی آنکھیں نہیں کھولے گا تب تک یہ اندھا پن بھی جاری رہے گا۔

کوئی مجھے بتائے! کہ ہم میں سے کون اپنی آنکھیں کھولنے پر آمادہ ہے؟ کسی کو بھی آنکھیں کھولنے کی جرأت نہیں' کیونکہ اگر ہم نے آنکھیں کھول لیں تو ہمیں وہ سب دیکھنا پڑے گا جو ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔ اس وجہ سے ہم آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں اور جو چیز ہم کو پسند ہے بس وہی دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کیسی ہے؟ کھلی آنکھوں سے کبھی خود کو بھی دیکھا ہے؟ یہ سب آپ دیکھنا نہیں چاہتے کیونکہ پھر آپ کو اپنی خواہش کے خلاف بہت کچھ دیکھنا پڑے گا۔

ہر کوئی اپنے آپ کو بہت نیک پارسا اور مہاتما سمجھتا ہے۔ اگر وہ کھلی آنکھوں سے اپنے اندر دیکھے تو خوفناک حد تک خود کو سب سے بڑا گناہگار پائے گا۔ کیونکہ یہ صورت وہ دیکھنا نہیں چاہتا' جس کے نتیجے میں اپنے آپ کو مہاتما سمجھنا دشوار ہو جائے گا' اس لیے وہ اپنی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں' بلکہ آنکھیں بند رکھنے میں لوگ بھی اس کی معاونت کرتے ہیں۔ وہ اپنے گرد ایسے ہی لوگ جمع رکھتا ہے جو اس کو ہر وقت بہت بڑا مہاتما کہتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسے عقیدت مندوں کو جمع رکھتا ہے۔ اپنے ارد گرد وہ ان لوگوں کو جمع رکھتا ہے جو اس کی آنکھیں بند رکھنے میں تعاون کرتے ہیں۔

لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھنے کے لیے کئی حیرت انگیز طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر وقت لوگوں کے پیچھے چلاّتے رہئے کہ میرے نزدیک کوئی نہ آئے! میں کسی کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ عام آدمی اس ترکیب سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے گرد بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ وہ جتنا لوگوں کو دور بھگاتا ہے لوگ اس کو اتنا ہی بڑا مہاتما سمجھتے ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی عام سا مہاتما تو لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہے مگر یہ اپنے خدام کے ذریعے ان کو دور بھگاتا ہے۔ وہ کسی سے بھی کسی قسم کا تعلق ظاہر نہیں کرتا۔

میں نے ایک شخص کے بارے میں سنا ہے جو برسوں تک کیلفورنیا کے ساحل پر مٹر گشت کیا کرتا تھا۔ وہ لوگوں کی عمومی دلچسپی کا باعث بن گیا تھا۔ اس کے بارے میں کہانی مشہور تھی کہ وہ اتنا سادہ آدمی ہے کہ اگر آپ اس کو ایک دس ڈالر کا نوٹ اور ایک دس پیسے کا سکہ دیں تو وہ خوش ہو کر دس کا سکہ اٹھا لیتا تھا' یعنی وہ اتنا معصوم تھا۔ ایک شخص تجسس کی بنا پر اس کے پاس پانچ

چھ بار گیا اور ہر بار اس کو لوگوں میں گھرا ہوا پایا۔ لوگ اس سے پوچھتے رہتے کہ بابا' آپ کو کیا چاہئے؟ یہ چاہئے؟ کہ وہ چاہئے؟ مگر یہ کہتے ہوئے وہ فوراً دس کا سکہ اٹھالیتا کہ اس کو یہ پسند ہے۔ اس کی چمک پسند ہے۔ لوگوں کی نظروں میں وہ اتنا ہی معصوم اور سادہ تھا۔

اس متجسس شخص کو یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی اتنا معصوم ہوسکتا ہے کہ برسوں کے بعد بھی وہ دس ڈالر کو دس ڈالر جاننے سے قاصر ہے۔ یہ معصومیت کی انتہا ہے۔ ایک شام جب اس کے گرد سے بھیڑ چھٹ گئی' یہ شخص اس کے پاس گیا اور بولا "میں تم کو پچھلے بیس سال سے دیکھ رہا ہوں اور مجھے حیرت ہے کہ یہ کھیل اتنے لمبے عرصے سے جاری ہے۔ کیا تم ابھی تک دس ڈالر کا نوٹ نہیں پہچانتے؟"

وہ شخص ہنستے ہوئے کہنے لگا "مجھے اول دن سے معلوم ہے کہ یہ دس ڈالر کا نوٹ ہے' لیکن اگر میں یہ ظاہر کر دیتا کہ میں اسے پہچانتا ہوں' تو یہ کھیل اسی دن اسی لمحے اپنے اختتام کو پہنچ جاتا' مگر میں نے ہزاروں تماش بینوں سے ڈھیروں ڈائم جمع کر لیے ہیں۔ پھر دس ڈالر کا محض وہی ایک نوٹ میرے ہاتھ میں رہ جاتا' اس کے بعد مجھے کوئی دوسرا نوٹ نہیں ملتا' اگر مجھے دولت جمع کرنی ہوتی تو میں امیروں کو ٹھوکر مارتا اور وہ میرے اوپر نوٹوں کی بارش کر دیتے...... مجھے تمام باتوں کا بخوبی علم ہے' میرا کام اطمینان بخش طریقے سے چل رہا ہے' پورے دن میں اس مجمعے سے مجھے کم وبیش پانچ سو ڈالر مل جاتے ہیں' اور مجھے یقین ہے کہ یہ کھیل اسی طرح چلتا رہے گا"

یہ نام نہاد مہاتما پیسے کی قدر سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب آپ ان سے اس بارے میں بات کریں گے تو وہ یہ تاثر دیں گے کہ وہ اس کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے۔ مگر اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کا چیلا آپ کا دیا ہوا پیسہ اٹھا کر تجوری میں رکھ دے گا کیونکہ مہاتما تو اس کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

اگر کوئی انسان خود سے اندھا بنا رہنا چاہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ کون اتنا پاگل ہے جو ان کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولنے کی جسارت کر سکے' اس بارے میں کوئی قدم اٹھا سکے؟ وہ ساحل کا مداری ہی اس ساری شرارت کا ذمہ دار نہیں ہے۔ شرارت کو فروغ دینے والے وہ لوگ ہیں جو اس کو گھیرے ہوئے ہین۔ یہ ان کی شرارت کی وجہ ہے کہ غریب لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں۔ آپ یہ بھی جان لیں کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو کوئی دوسرا شخص کرتا۔ اور لوگ بیوقوف ہیں' وہ جہاں بھی

ہونگے وہی کریں گے جو اس کے ساتھ کیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان سے ان کی دولت چھین لے۔ بہرحال اس قسم کے کھیل جاری رہیں گے۔ ان کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم لوگوں کا پاگل پن ختم کر پائیں۔

اس لیے توہمات کی زنجیروں کو توڑنے کے سلسلے میں فکر مند نہ ہوں' جو شخص ان کو پہنے ہوئے ہے وہ جب تک زندہ رہے گا نئی سے نئی زنجیریں بناتا رہے گا۔ وہ ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسا آدمی نئی زنجیریں بناتا ہی رہے گا۔

ہر مذہب نے ایسی زنجیریں توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے' لیکن سب نے ہی نئی زنجیریں بھی بنائی ہیں ...... اس لیے سب کچھ جوں کا توں ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب آئے سب نے ہی اصلاحات کیں' سب نے ہی توہمات کے خاتمے کا دعویٰ کیا' مگر ان کے خاتمے کے لیے جو کچھ بھی کیا گیا کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ البتہ جو لوگ پرانے توہمات سے اکتا جاتے ہیں وہ ان کو نئے توہمات سے بدل لیتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں کہ وہ کوئی تبدیلی لے آئے ہیں۔

فطری تقاضہ بھی یہی ہے کہ سمجھدار آدمی یکسانیت سے جلد اکتا جائے' یہاں تک کہ عقائد کی یکسانیت سے بھی' توہمات کی تو بات ہی کیا ہے؟ وہ پوری سمجھداری سے کام لیتے ہوئے کسی ایک چیز پر قانع نہیں رہتا۔ وہ کسی قسم کی زنجیریں نہیں بناتا کیونکہ وہ آزاد رہنے کی اہمیت سمجھتا ہے اور کوئی زنجیر بنانے سے باز رہتا ہے۔

اس لیے اصل مسئلہ فرد میں آگہی کا ایسا شعور اجاگر کرنا ہے جو اس کے اندر آزاد رہنے کی خواہش پیدا کر سکے' جو اس کو عقلِ سلیم کا مالک بنا سکے' جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکے۔ اگر اندھے پن کے رجحان کا' اندھی تقلید کا' شخصیت پرستی کا کچھ سدِ باب ہو جائے تو تمام توہمات خاک میں مل جائیں۔ اور ایسا تب تک نہیں ہوگا کہ ایک واہمہ سے پیچھا چھڑائیں تو دوسرا اس کی جگہ لے لے۔ اگر سب فنا ہو جائیں' سب ایک ساتھ دم توڑ سکیں تو ممکن ہے' ورنہ وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔

ہم کو سمجھنا ہوگا کہ صرف لباس تبدیل کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب کو من بھاتا پہننے دیا جائے۔ اگر کوئی سرخ چولا پہننا پسند کرتا ہے تو خوشی سے پہنے' اسے کون روکتا ہے؟ اگر کوئی کالے کپڑے پہننا چاہے تو کسی کو کیا اعتراض؟ مگر جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ محض کپڑے تبدیل کر

لینے سے زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آ جاتا۔ اگر ایک بار یہ بات سمجھ میں آ جائے تو کپڑے بدلنے کی ضرورت ہی نہ رہے‘ اس لیے کہ جو شخص آج آپ کو کپڑے بدلنے پر مجبور کر رہا ہے وہ کل کوئی دوسری قسم کا لباس پہنانے پر بضد ہو گا۔

سرخ کپڑے زیب تن کیے ہوئے ایک سنیاسی گاندھی سے ملنے گیا اور کہا کہ وہ ان کے خیالات سے بہت متاثر ہے اور وہ بھی ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ جواب میں گاندھی نے جو کچھ کہا وہ بہت اہم ہے۔ اس نے کہا" یہ بہت اچھی بات ہے! مگر پہلے تم کو اپنا یہ لباس تبدیل کرنا ہو گا‘ یہ تمھارے کام میں رکاوٹ کا سبب بنے گا۔ عموماً لوگ ایسے کپڑے پہننے والوں سے خدمت لینے کے بجائے ان کی خدمت کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ بات ہے تو بالکل صحیح لیکن گاندھی نے اس کے کپڑے اتروا کر اس کو ہاتھ کی بنی ہوئی کھادی کے کپڑے پہنا دیئے۔

اب کھادی پہننے والے لوگ ایسے کام کر رہے ہیں جن کا سرخ کپڑے پہننے والے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بتائے کہ اس سے کیا فرق پڑا؟ اب تو کھادی پہننے والے بھی دوسروں سے خدمت لے رہے ہیں۔ لال چولا پہننے والوں کی کبھی اتنی خدمت نہیں کی گئی جتنی اب کھادی پہننے والوں کی کی جاتی ہے۔ لہٰذا کھادی اب اس ملک میں بہت مہنگی مانی جاتی ہے۔ وہ سنیاسی بہت خوش تھا کہ اس نے لال کپڑوں کے واہمے سے نجات حاصل کر لی‘ مگر اب وہ کھادی کے واہمے میں مبتلا ہے۔ دونوں میں کیا فرق ہوا؟

بنیادی سوال لوگوں سے ایک چیز چھڑا کر ان کو دوسری چیز پر لگانے کا نہیں ہے۔ بلکہ ان کی ذہنیت بدلنے کا ہے جو ان کو بعض عادتوں کا اسیر بناتی ہے۔

گاندھی نے اس کی عقل کو پالش نہیں کیا‘ وہ ویسے کا ویسا بدھو ہی رہا۔ اس نے صرف اس کے کپڑے تبدیل کرا دیئے‘ اور وہ شخص اس میں ہی خوش ہو گیا۔ مگر اس سے فرق کیا پڑا؟

ہم ہمیشہ سے اسی طریق پر چل رہے ہیں۔

پچھلے پانچ ہزار سال سے انسانیت بڑی بدنصیبی میں مبتلا ہے۔ توہمات کے خاتمے کی کوشش میں انسان کبھی بدلا نہیں جا سکا۔ ہم تو بس سادگی سے ایک وہم ترک کر دیتے ہیں لیکن فوراً ہی کوئی دوسرا واہمہ ہمیں گھیر لیتا ہے۔ ہم ایک کی جگہ جب دوسرا اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی قابلِ قبول ہو جاتا ہے‘ اور ہم خوش ہو جاتے ہیں۔

میرے پاس ایک نوجوان آتا تھا۔ وہ دن رات مقدس تحریروں کے بارے میں ہی بات کیا کرتا تھا۔ اس کو اپنیشد‘ گیتا اور وید زبانی یاد تھے۔ میں نے اسکو کہا" یہ فضولیات بند کرو‘ ان سے تمھیں کچھ حاصل نہیں ہو گا!" اس بات پر وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گیا لیکن میرے پاس آنا نہیں چھوڑا۔ اگر کوئی آپ سے ناراض ہو جاتا ہے تو وہ آپ سے رابطہ منقطع نہیں کرتا کیونکہ ناراضگی بھی ایک قسم کا رشتہ قائم کرتی ہے۔ وہ یقیناً مجھ سے ناراض تھا لیکن وہ بدستور میرے پاس آتا رہا۔ اسی طرح کچھ دن گذرے کہ اس کو میری باتیں سننے کے دوران نہ جانے کیا احساس ہوا؟ پھر جب وہ دوبارہ میرے پاس آیا تو کہنے لگا کہ اس نے سارے اپنیشد‘ وید اور گیتا کا بنڈل بنا کر کنوئیں میں پھینک دیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ میں نے تم سے ان کو کنوئیں میں پھینکنے کے لیے کب کہا؟

اس نے کہا" میں نے اپنی الماری میں آپ کی کتابیں رکھنے کے لیے جگہ بنائی ہے‘ اب میں آپ کی باتوں سے بالکل متفق ہوں!"

میں نے کہا کہ اس طرح تو مزید پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ بدلا تو کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو تم سے صرف یہ کہا تھا کہ کسی کتاب پر یقین مت کرو۔ میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ فلاں فلاں کتابیں پھینک کر میری کتابیں پکڑ لو۔ اس سے فرق کیا پڑا؟

نام نہاد گرو اُس وقت بہت خوشی محسوس کرتے ہیں جب لوگ ان کے پھیلائے ہوئے توہمات کو مانتے ہیں۔ اس طرح توہمات میں تبدیلیاں تو آتی رہتی ہیں مگر لوگ بدستور توہم پرست ہی رہتے ہیں۔

لہٰذا میں نے اس نوجوان سے کہا کہ میری کتابیں بھی اسی کنوئیں میں پھینک دے۔ وہ کہنے لگا کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں‘ اور زور دے کر کہا کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ جس پر میں نے کہا کہ پھر تو سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ تمھارے لیے اب میری کتابیں گیتا بن گئیں۔ کرشن کی گیتا میں کیا خرابی تھی؟ اگر تم کچھ ساتھ رکھنا ہی چاہتے تھے تو گیتا اس کے لیے کافی تھی...... اس سے تمھارا مقصد حل ہو رہا تھا...... وہ میری کتاب سے زیادہ ضخیم تھی...... اور تمھارے وزن میں خاصا اضافہ کرتی تھی۔ اب بھلا چیزوں میں کیا تبدیلی رونما ہو گئی؟ کیا میں نے کبھی کرشن پر کوئی اعتراض کیا؟

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ بس ہوا یہ ہے کہ انسان تو وہی ہے' اس کے کھلونے بدل گئے۔ ہاں اگر کوئی میرے کھلونے لے گا تو مجھے خوشی ضرور ہوگی کہ کسی نے میرا طرزِ فکر اپنایا۔ میری انا کی تسکین ہو جائے گی کہ کسی نے کرشنا سے زیادہ مجھ پر اعتماد کیا۔ مگر اس سے انسانیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی' انسانیت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اس بات کی فکر کرنی چاہئے کہ انسان کے اندر سے تبدیلی کیسے لائیں؟ اس ذہنیت کو کیسے بدلیں جو چیزوں پر عقیدے جما دیتی ہے؟ انسان اپنے اندھے پن پر کیسے قابو پا سکے گا؟

اس نوجوان کو میں نے مشورہ دیا: توہمات کو توڑنے کی طرف توجہ دینے کے بجائے توہمات میں مبتلا ذہن کو بدلنے کی کوشش کرو۔ اس ذہن کو بدل ڈالو جو توہمات کی افزائش کرتا ہے' تا کہ ایک نیا انسان پیدا ہو۔ مگر یہ ایک نہایت مشکل کام ہے؛ اس کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ ہرگز آسان کام نہیں ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لیے ایک مکمل سائنسی رویہ درکار ہے۔

بھوتوں اور بدارواح کے وجود سے انکار مت کرو۔ وہ تمھارے اپنے وجود سے کہیں زیادہ حقیقت ہیں۔ ان کے وجود میں کوئی دھوکہ نہیں ہے...... ہاں مگر آپ کے اندر ان کا کھوج لگانے کی ہمت ہونی چاہئے۔ اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ بھوت پریت سے ڈرتے ہیں وہ ان کے وجود کے منکر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے نہیں کہ ان کو بہت زیادہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔ بلکہ واحد وجہ ان کی خواہش کی تکمیل ہے...... وہ بھوتوں کا وجود دیکھنا نہیں چاہتے...... کیونکہ اگر بھوت موجود ہوں گے تو ان کا کسی اندھیری گلی سے گذرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے وہ بلند آواز سے دہراتے رہتے ہیں "بھوتوں کا کوئی وجود نہیں ہے' سب کچھ نرے توہمات ہیں۔ ہم توہم پرستی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے" جبکہ اصل میں وہ کہہ رہے ہیں: "وہ بھوتوں سے بہت خوفزدہ ہیں۔ اگر بھوت حقیقت میں موجود ہیں تو بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی...... اس لیے انہیں ہونا ہی نہیں چاہئے...... یہ اندر دبی ہوئی خواہش ہے۔ اس قسم کے اذہان بھوتوں کو کبھی فنا نہیں سکتے۔

اگر بھوت ہیں؟ تو پھر وہ ہیں۔ اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ ان پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں۔ جو ہے...... وہ ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم ان کی تفتیش کریں۔ کیونکہ جو

چیز موجود ہے کسی نہ کسی طور اس کا ہم سے تعلق ہے۔ ایسا ہونا لازمی ہے۔ پھر بھی یہ زیادہ قابل فہم ہے کہ ہم اس کو سمجھ لیں...... اس کو پہچان لیں۔ اور ایسے طریقے دریافت کریں کہ ہم ان سے رابطہ پیدا کر سکیں۔ ان سے میل جول کے ذرائع سے واقف ہو سکیں۔ جو یقیناً آسان کام نہیں ہے۔

دو آدمیوں کے مابین جو خالی جگہ آپ دیکھتے ہیں' ضروری نہیں کہ وہ خالی ہی ہو! ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی تشریف فرما ہو! یہ دوسری بات ہے کہ آپ اسے نہیں دیکھ پاتے۔ مگر یہ خیال آپ کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہاں کوئی ہے۔ اس لیے ہم کوئی جگہ خالی نہیں چھوڑتے' آپس میں ایک دوسرے کے نزدیک بیٹھتے ہیں۔ ہم کو خالی جگہوں سے بہر حال ڈر لگتا ہے اس لیے ہم اپنے کمروں کو فرنیچر' کیلنڈرز' دیوی دیوتاؤں کی تصویروں غرض یہ کہ کسی بھی چیز سے بھرتے رہتے ہیں' خالی جگہ' خالی گھر ہمارے لیے خوف کا سبب بنتے ہیں' ہم ان کو لوگوں اور فرنیچر وغیرہ سے بھرتے ہیں کہ کوئی جگہ خالی نہ رہے۔ اس کے باوجود کافی جگہ خالی رہتی ہے جو بہر حال خالی نہیں ہوتی۔ اور اس کی اپنی سائنس ہے۔

اس سمت میں اگر کوئی کام کرنا چاہے تو میدان خالی ہے۔ یہ کام باضابطہ طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اپنے سائنسی اصول ہیں' اس کے اپنے قانون اور طور طریقے ہیں' لیکن اس میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ان کی موجودگی یا عدم موجودگی کے خیال کو دل سے نکالنا ہوگا' اپنے کسی پیشگی فیصلے کو پسِ پشت ڈالنا ہوگا۔ اپنے یقین کو وقتی طور پر ایک طرف رکھ دینا ہوگا...... اس کے بارے میں آپ ناواقفیت کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ بھوت وغیرہ موجود ہیں یا نہیں؟ تو سائنسی ذہن کا مظاہرہ کرنا بہترین طرزِ عمل ہوگا جو کچھ اس طرح کا ہوگا "مجھے معلوم نہیں! کیونکہ میں ان کی حقیقت کے بارے میں نہیں جان سکا ہوں' اور یہ کہ میں تو ابھی اپنے اندر کا حال بھی نہیں جان پایا ہوں۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ بھوت نام کی کوئی چیز موجود ہے یا نہیں؟" تو مثبت یا منفی جواب میں جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو جواب دینے میں جلدی کرتا ہے وہ دراصل توہم پرست ہوتا ہے۔ ایک سمجھدار آدمی ارادتاً ناواقفیت کا مظاہرہ کرے گا۔

ایک بار آئن اسٹائن سے کسی شخص نے سوال کیا کہ وہ توہم پرست اور سائنسدان میں کیسے امتیاز کرے گا؟ اس نے کہا "اگر کسی توہم پرست آدمی سے آپ سو سوالات کریں گے تو وہ

ان کے ایک سوایک جواب دے گا' اور اگر آپ کسی سائنسدان سے ایک سو سوالات کریں گے تو وہ اٹھانوے سوالات سے قطعی لاعلمی ظاہر کرے گا اور جن دو سوالات کے جواب دے گا تو بھی وہ کہے گا کہ اس بارے میں اسے بہت کم علم ہے' اور وہ بھی حتمی نہیں، ممکن ہے کہ کل اس میں بھی تبدیلی آجائے"

یاد رکھئے کہ ایک سائنسی ذہن بالکل معصوم ہوتا ہے۔ اور توہم پرست ہرگز نہیں۔ مگر بظاہر توہم پرست بالکل سادہ دکھائی دیتا ہے جبکہ وہ ہوتا نہیں' وہ بہت ہوشیار اور چالاک ہوتا ہے۔ ایسے ذہن کی چالاکی کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ وہ ان باتوں کی بھی تصدیق کر دیتا ہے جن کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس قسم کے ذہن کے مالک کو اپنے دروازے پر لگے پتھر تک کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ مگر اپنے خدا کو صحیح اور آپ کے خدا کو غلط ثابت کرنے کے جنون میں وہ لوگوں کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ جب اسے پتھر کے بارے میں کچھ علم نہیں' اور وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ پتھر ہندو ہے یا مسلمان' تو وہ کیسے بتا سکتا ہے کہ خدا خود ہندو ہے یا مسلمان؟ مگر نہیں وہ آگے بڑھ کر انسانوں کو قتل کر سکتا ہے۔ خیال رہے کہ جب ہم اس تشدد کی تہہ میں جاتے ہیں تو اس کی جڑیں توہم پرستی سے جا کر ملتی ہیں۔

علم کی بنیاد پر لوگ جھگڑوں میں نہیں پڑتے ...... قطعی نہیں! جہاں کہیں بھی آپ اختلافات دیکھیں تو یقین کر لیں کہ وہاں توہم پرستی کام کر رہی ہوگی۔ کیونکہ ایک توہم پرست انسان جھگڑا کر کے ہی اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اپنی تلوار میرے حلق پر رکھ کر مجھے کہے کہ کہو میں صحیح ہوں ورنہ میں تمھارا سر قلم کر دوں گا' یقیناً وہ ایسا کر سکتا ہے' مگر اس طرح وہ اپنے آپ کو درست ثابت نہیں کر سکتا۔ آج تک کسی کا سر قلم کر کے کوئی اپنے آپ کو درست ثابت نہیں کر سکا۔

یہاں تک کہ اگر سارے مسلمان ایکا کر کے تمام ہندوؤں کو ملیا میٹ کر دیں' تو وہ خود کو حق پر ثابت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح سارے ہندو مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے باوجود خود کو کبھی درست نہیں منوا سکتے۔ وہ خود کو احمق کے علاوہ اور کچھ نہیں کہلا سکتے۔ کیا تلوار کے زور پر کبھی کوئی صحیح بات کو صحیح منوا سکا ہے؟ مگر توہم پرستوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے پاس اپنی بات کو سچ تسلیم کرانے کے لیے دیگر کوئی ذریعہ نہیں۔ اس کے پاس کوئی نظریہ نہیں'

اس نے کبھی تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی' اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں' کوئی متعین سمت نہیں' وہ تو بس ایک ہی بات جانتا ہے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔

پوری دنیا میں ہر شخص یہی کر رہا ہے۔ صرف مذہبی رہنما ہی تشدد کی راہ پر گامزن نہیں ہیں' سیاستدان بھی کسی طور ان سے کم نہیں۔ کیا ہائیڈروجن بموں کے ذریعے امریکا اور روس کے درمیان یہ فیصلہ ممکن ہے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط؟ بظاہر اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں۔ یہ بھی اسی طرز کی احمقانہ حرکت ہے۔ کیا فیصلہ کرنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔ یہ کیسے طے ہوگا کہ مارکس صحیح ہے یا غلط؟ یہ تلوار کے ذریعے ممکن ہے؟ یا ہائیڈروجن بم گرانے سے؟ دونوں میں سے کونسا طریقہ موثر اور مددگار ثابت ہو سکتا ہے؟ حالانکہ اس کا فیصلہ صرف مذاکرات کے ذریعے ممکن ہے...... مگر انسان کو ابھی اس کی فرصت نہیں ہے۔ وہ ابھی توہمات میں گھرا ہوا ہے۔

لہٰذا یاد رکھئے کہ میرا زور زنجیریں توڑنے پر نہیں ہے۔ میرا سارا زور اس بات پر ہے کہ زنجیریں بنانے والے توہم پرست ذہنوں کو تبدیل کیا جائے۔ اگر ایسے ذہن باقی رہیں گے' تو آپ خواہ کتنی ہی زنجیریں توڑ ڈالیں' یہ لوگوں کو نئی زنجیروں میں جکڑتے رہیں گے۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ نئے بندھن زیادہ خوبصورت' زیادہ قابلِ توجہ' اور زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ پرانی کے مقابلے میں نئی زنجیریں زیادہ مضبوط بھی ہوتی ہیں' کیونکہ وقت کی پیش رفت نے اس صنعت میں بھی بے شمار نئے رجحانات متعارف کرائے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ توہمات کے خاتمے میں مصروف لوگ پرانے توہمات کے مقابلے میں نت نئے توہمات مہیا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتے۔

توہم پرست ذہنیتوں کا خاتمہ کئے بغیر نئے توہمات پیدا ہوتے رہیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔ حقیقت پسندی کا مطلب ہے: غور و فکر' تحقیق' جستجو۔ زبان اس وقت کھولیں جب پوری طرح تحقیق کر چکے ہوں' اپنی بات کے مطلقاً درست ہونے پر بھی اصرار نہ کریں' کیونکہ آپ کا نکتۂ نظر غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ آنے والے دنوں میں نئے نئے تجربات ہوں گے' آپ خود بھی بہت سے تجربات سے گذریں گے' اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ آپ کو جو تجربہ ہوا ہے وہ کہیں فریب نظر تو نہیں اس لیے جب تک دوسرے تجربات کے ذریعے آپ کے تجربے کی تصدیق نہ ہو جائے اس وقت

تک اس کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کریں۔ اسی وجہ سے ایک سائنسدان اپنے تجربے کو ہزاروں بار دہراتا ہے' اور ہزاروں دوسرے لوگوں کو وہی تجربہ کرنے کے لیے کہتا ہے اس کے باوجود وہ کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ پاتا۔ جو شخص جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ اور اس جلد بازی کی وجہ سے وہ توہمات میں مبتلا رہتا ہے۔ اور ہم سب ہی بہت جلدی میں ہیں۔

ایک دوست نے اپنے سوال میں وہ سب کچھ جاننا چاہا ہے جو تمام عالمِ انسانیت اپنی پوری کوشش کے باوجود آج تک نہیں جان سکی ہے۔ وہ کہتا ہے "خدا موجود ہے یا نہیں؟ روح کیا ہے؟ نجات کہاں ہے؟ جنت کس نے بنائی؟ کیا دوزخ کا وجود ہے؟ دنیا میں انسان کے آنے کا کیا مقصد ہے؟ زندگی کا اصل ہدف کیا ہے؟

یہ دوست اتنی جلدی میں ہے کہ وہ ان ساری باتوں کے بارے میں جلد از جلد جان لینا چاہتا ہے۔ اتنی عجلت میں گرفتار کوئی شخص بلا شبہ توہمات میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ تحقیق نہایت صبر آزما کام ہے' جس میں اعصاب شکن قوتِ برداشت ہونا ضروری ہے۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم ایک عرصۂ حیات میں کچھ جان پاتے ہیں یا نہیں۔ ہم کو اپنی تلاش جاری رکھنی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں ان کے لیے کچھ اخذ کر لینا اہمیت نہیں رکھتا...... تحقیقی عمل جاری رکھنا اہمیت رکھتا ہے۔ اخذ کر لینا ہی تو ہم پرست کے لیے اہم ہے' اس کے نزدیک تحقیق و تفتیش کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایک توہم پرست جلد سے جلد نتیجہ حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے...... "خدا کہاں ہے؟" اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ پہلے اس کے ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کر لے۔ وہ خدا کو تلاش نہیں کرنا چاہتا۔ تلاش کرنا اس کی سرشت میں نہیں ہے۔ وہ تو بس یہ کہتا ہے "خدا کو تلاش کرو اور مجھے دکھاؤ!" اسی وجہ سے وہ کسی گرو کو بھی نہیں مانتا۔

کسی کو گرو ماننے کا مطلب ہے توہم پرستی ترک کر دینا......اور وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ اس کے نزدیک گرو اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ جب اس نے خدا کو پالیا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اسے بھی دکھائے۔ جب اس نے پالیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی اسے تلاش کریں؟" ہم آپ

کے پیر پڑتے ہیں! مہربانی کر کے آپ جو کچھ حاصل کر چکے ہیں اس میں سے تھوڑا حصہ ہمیں بھی عطا کیجیے" مقصد یہ ہے کہ کوئی دوسرا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے خدا کا یقین دلائے۔ اس بنا پر وہ منتروں کے چکر میں رہتے ہیں' فیسیں ادا کرتے ہیں' پیروں میں پڑتے ہیں' خدمتیں کرتے ہیں کہ جو کچھ دوسرے حاصل کر چکے ہیں وہ ان کا ہو جائے۔ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ یہ توہم پرستی کی واضح ترین نشانی ہے۔

کسی دوسرے کی کامیابی کبھی آپ کی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ کوئی اور تلاش میں نکلا اور اس نے پالیا......اور آپ اس کو مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ یہ بات ذہن میں رہے کہ جس نے جو کچھ تلاش کیا ہے اس کے بارے میں اس کو علم ہے کہ وہ تلاش کرنے سے ملا ہے' مانگنے سے نہیں۔ وہ تو اپنا کوئی شاگرد بھی نہیں بناتا۔ جو لوگ شاگرد لیے پھرتے ہیں انھوں نے ابھی خود کو بھی نہیں پایا ہے۔ وہ تو خود ہی دوسروں گروؤں سے امیدیں لگائے پھر رہے ہیں۔ گروؤں کا ایک طویل سلسلہ ہے اور ان میں سے ہر ایک' دوسرے سے آس لگائے ہوئے ہے۔

کتنے ہی گرو جو کب کے مر چکے مگر لوگ ان سے اب تک امیدیں لگائے ہوئے ہیں کہ وہ ان کو کچھ دیں گے۔ گذرے ہوئے گروؤں کی ایک بہت لمبی زنجیر ہے جو ماضی میں ہزاروں لاکھوں سال تک دراز ہے وہ سب ایک دوسرے سے پر امید ہیں کہ کوئی نہ کوئی' کبھی نہ کبھی' ان کو کچھ نہ کچھ بخش دیگا۔ یہ بھی توہم پرست ذہنیت کا ثبوت ہے۔

تحقیقی ذہن اور روشن دماغی کا طرزِ فکر یہ ہوتا ہے کہ اگر خدا ہے' تو میں اسے تلاش کروں گا' اگر میں اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ میری قابلیت ہو گی' جو میرا پیدائشی حق ہے۔ اگر میں اس کو کبھی پا سکا تو یہ میری تمام زندگی کی ریاضت' میری قربانی' میرے ارتکازِ توجہ کا نتیجہ ہو گا۔ یہ میری جدو جہد کا ثمر ہو گا۔

خیال رہے کہ اگر وہ کسی جدو جہد کے بغیر حاصل ہو جائے تو کوئی مفکر اس کو قبول نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس کی کوشش کے نتیجے میں حاصل نہیں ہو گا۔ وہ اپنے عمل کے ذریعے اسے پانا پسند کرتا ہے۔ یہ دھیان میں رہے کہ بہت سی چیزیں انسان کو اپنی جدو جہد کے نتیجے میں ہی حاصل ہوتی ہیں۔ خدا بازار میں بکنے والی جنس نہیں۔ سچائی کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں نہیں ملتی کہ آپ جائیں اور جا کر خرید لائیں۔ مگر صدمہ ہوتا ہے جب لوگوں کو اس کوشش میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

بازاروں میں ایسے اسٹور ہیں جن پر سائن بورڈ لٹکا ہوتا ہے "یہاں اصلی سچائی دستیاب ہے" دیکھیں کہ سچائی میں بھی اصلی اور نقلی کا التزام ہے۔ کسی دوکان کے سائن بورڈ کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ "اصل عامل یہاں ہے' باقی لوگ جھوٹ اور فریب کے ماہر ہیں' وہ کہیں اور پائے جاتے ہیں' ہماری دوکان سب سے معتبر ہے' ہمیں ایک بار خدمت کا موقعہ دیں" اور جب آپ ایک بار اس دکان میں داخل ہو جائیں تو اس کا مالک آپ کو آسانی سے چھوڑنے والا نہیں۔ یہ تمام شرارتیں تو ہم پرست ذہنوں کی پیداوار ہیں۔

میں آپ کو صرف یہ کہوں گا "مانگنے کی روش چھوڑ دو' حاصل کرنے کی جدوجہد اپناؤ' مانگنے کے بجائے آپ کو عملی کوشش کے ذریعے خدا کا قرب مل سکے گا۔ دوسروں کے کہے پر کبھی اعتبار مت کریں' اس کا قرب یقیناً کسی نہ کسی کو ضرور حاصل ہوگا' ایسا عین ممکن ہے۔ اس لیے کسی کو جھٹلاؤ بھی مت' اگر کوئی آپ کے پاس آ کر کہتا ہے کہ اس کو خدا کا قرب حاصل ہو گیا ہے تو اس کو کہیں "آپ کو مبارک ہو! آپ پر خدا مہربان ہوا' مگر مہربانی کر کے مجھے مت دکھائیں' مجھے بھی خود ہی اس کو تلاش کرنے دیں' وگرنہ میں ہمیشہ کے لیے محتاج ہو کر رہ جاؤں گا"

اگر آپ کو کسی ایسی جگہ لے جایا جائے جہاں پہلے بھی کوئی جا چکا ہو' تو وہاں آپ کی آمد ایک محتاج کی حیثیت میں ہوگی۔ آپ کے پیر بوجھل ہو جائیں گے۔ کسی جگہ پہنچنا اہم نہیں ہے' اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ خود میں وہاں پہنچنے کی ہمت پیدا کریں۔ کوئی چیز حاصل کر لینے کی اتنی اہمیت نہیں جتنی حاصل کرنے والے کو آمادہ کرنے کی۔

خدا...... علم ...... اور ...... نجات ...... پہلے سے تیار شدہ اشیا نہیں ہیں۔ زندگی وقف کرنے کا ثمر ہیں' زندگی بھر کی جدوجہد اور خود کو مٹا دینے کا ثمر...... اس پھول کی مانند جو خود بخود کھل اٹھتا ہے۔ آپ کو بازار میں صرف پلاسٹک کے نقلی پھول ملیں گے...... وہ دیر تک چلتے ہیں...... آپ کو صرف ان پر سے مٹی جھاڑنی پڑتی ہے اور وہ تازہ محسوس ہوتے ہیں......' مگر وہ کس کو دھوکہ دے سکتے ہیں' باہر سے گذرنے والے کو تو محسوس ہوگا کہ آپ کی کھڑکی میں تازہ پھول لگے ہوئے ہیں' لیکن آپ خود تو ان سے دھوکہ نہیں کھا سکتے کیونکہ آپ تو خود ان کو خرید کر لائے ہیں۔

اصلی پھولوں کے لیے پہلے بیج ڈالنے پڑتے ہیں' مشقت اٹھانی پڑتی ہے' پودے کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے' اس کے بعد پھول کھلتے ہیں' وہ کہیں باہر سے نہیں لائے گئے۔ بقائے

دوام کا تجربہ بھی پھول کی طرح ہے' سادھنا کو ایک پودا سمجھئے' پودے کی دیکھ بھال کیجیے' پھول خود آ جائیں گے۔ مگر ہم چونکہ بہت جلدی میں ہیں' ہماری خواہش ہوتی ہے کہ پودے کے بغیر بس پھول مل جائیں۔

عموماً بچے اسکول میں حساب کا سوال حل نہیں کرتے بلکہ کتاب میں دیکھ کر اس کا جواب لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ جواب بالکل صحیح ہونے کے باوجود بالکل غلط ہوتا ہے...... جس نے سوال حل کرنے کا صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا اس کا جواب کس طرح درست مانا جا سکتا ہے؟ بیشک اس کا جواب سو فیصد درست ہے' اس نے بھی جواب میں پانچ لکھا ہے' اور جنھوں نے صحیح طریقے سے سوال حل کیا ہے انھوں نے بھی پانچ ہی لکھا ہے۔ مگر آپ نے دیکھا کہ دونوں کے طریقوں میں بنیادی فرق ہے۔ جن لوگوں کو کتاب کے آخر سے جواب نقل کرنا ہے وہ چاہے گیتا میں سے ہو یا قرآن میں سے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

یہ صحیح ہے کہ دونوں کے جواب ایک ہی ہیں' اس کے باوجود وہ ایک نہیں ہیں' دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اصل سوال جواب تلاش کرنے کا نہیں ہے' اور نہ ہی پانچ تک پہنچ جانا اصل مقصد ہے بلکہ پانچ تک کیسے پہنچا جائے' یہ سوال کی روح ہے۔ اور جس نے کتاب کے آخر میں جواب دیکھ کر لکھ دیا' اس نے درست طریقہ جانا ہی نہیں' اس نے حساب کرنا نہیں سیکھا' بس جواب دیکھ کر لکھنے کو کافی سمجھا۔

اگر آپ نے کہیں سے کوئی بات جان لی' اگر آپ نے کسی سے کوئی چیز حاصل کر لی' اگر آپ نے سنی سنائی بات پر یقین کر لیا...... اس طریقے سے تو حاصل شدہ خدا بھی کتاب کے آخر سے دیکھے ہوئے جواب کے مترادف ہوگا۔ ایسا خدا زندگی سے محروم' مردہ' ناکارہ اور کسی کام کا نہیں ہوگا۔ کسی مذہب کے اپنے قواعد و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی زندہ مذہب کی علامت ہے کتاب کے آخر سے دیکھا ہوا جواب اس کا حل نہیں ہے۔

مگر ہم تو سب ہی چور ہیں۔ ہم بچوں کو چوری پر تنبیہ کرنے کے لیے ان پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں' استاد ہمیشہ بچوں کو کتاب کے آخر سے جواب نقل کرنے سے منع کرتے ہیں' یعنی کہیں سے جواب چرانے کے لیے منع کرتے ہیں...... مگر جب ان سے سوال کیا جائے کہ کیا آپ کے حاصل کردہ جوابات چوری کے ہیں یا نہیں' تو پتہ چلے گا کہ ان کے بھی تمام جوابات

چرائے ہوئے ہیں۔

نام نہاد گرو بھی چور ہیں۔اس کے شاگرد چور ہیں'ان کے استاد چور ہیں۔ پوری زندگی کے تمام جوابات سرقہ ہیں۔ چرائے ہوئے جوابات کے ذریعے ممکن نہیں کہ امن یا مسرت حاصل ہوسکے۔حقیقی مسرت اس عمل سے گذر کر حاصل ہوسکتی ہے جس میں سوالوں کے جوابات پھولوں کی طرح اندر سے پھوٹ نکلیں۔وہ کہیں اور سے لینا ممکن نہیں۔

☆

چھٹا باب

محبت خطرناک ہے

ایک دوست کا سوال ہے:

ہم موت کے بارے میں سوچیں ہی کیوں؟ ہمیں زندگی ملی ہے' اسے گذارنا چاہیئے۔ ہمیں صرف حال میں محدود رہنا چاہیئے۔ہم موت کے خیال کو کیوں جگہ دیں؟

اس دوست کا سوال بالکل درست ہے۔" موت کا تصور کیوں کیا جائے؟ یا موت کا خیال کیے بغیر ہم کو صرف زندگی سے سروکار رکھنا چاہیئے"...... یہ سوال ہی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ سائل کو بھی موت کے خیال سے مفر نہیں۔موت اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا...... حالانکہ ہم تمام زندگی کوشش کرتے ہیں کہ موت کے بارے میں نہیں سوچیں'...... اس لیے نہیں کہ یہ بیکار مشغلہ ہے' نہیں! بلکہ موت کا خیال ہی ہمیں دہشت زدہ کر دیتا ہے۔یہ خیال کہ میں مر جاؤنگا' ہمارے وجود میں سنسنی دوڑا دیتا ہے۔مرتے وقت تو خیر سارا وجود لرز ہی جاتا ہے' مگر اس سے پہلے بھی موت کا خیال ذہن میں جگہ پالے تو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

انسان ہمیشہ موت سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا ہے'حتیٰ الامکان اس کے بارے میں سوچنے سے گریز کرتا ہے۔ہم نے اپنی زندگی کا ضابطہ اس طور سے ترتیب دیا ہے کہ موت ہمارے سامنے نہ رہے'لوگوں کے اختیار کیے ہوئے ہتھکنڈے' بظاہر موت کو جھٹلانے میں کامیاب نظر آتے ہیں' مگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے' کیونکہ موت بہرحال موجود ہے۔آپ اس سے کیسے بچ پائیں گے؟ بچ کے کہاں جائیں گے؟اس سے دور بھاگنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ آپ اسی کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔آپ کہیں بھی جائیں' کوئی بھی راستہ اختیار کریں' آخر کار آپ کا

خاتمہ اسی پر ہوگا...... ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ نزدیک آتی رہتی ہے' آپ اس کے بارے میں سوچیں یا نہیں سوچیں...... اس سے دور بھاگنے کی کوشش کریں یا نہیں۔ کوئی انسان حقائق سے انکار نہیں کرسکتا۔

موت کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جسے مستقبل میں پیش آنا ہے اس لیے اس کے بارے میں کیوں سوچیں؟ سوچ کا یہ انداز بھی درست نہیں۔ موت کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں...... یہ تو ہر لمحہ واقع ہو رہی ہے۔ بیشک اس کی تکمیل مستقبل میں ہوگی لیکن اس کا ہونا ہر وقت جاری ہے۔ موجود لمحے میں بھی ہم مر رہے ہیں۔ ہم جس جگہ بیٹھے ہیں اگر وہاں ایک گھنٹے تک بیٹھے رہیں تو اس ایک گھنٹے کے دوران بھی ہم موت کے مراحل سے گذرتے رہیں گے۔ اگر ہم پوری طرح موت کی آغوش میں ستر سال میں پہنچیں تب بھی یہ ایک گھنٹہ اس میں شامل رہے گا۔ اس ایک گھنٹے کے دوران بھی ہمارے مرنے کا عمل جاری رہا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ستر سال کے بعد انسان اچانک مر جاتا ہے' موت کبھی ایک دم سے نہیں آتی ہے۔ اس کا آغاز تو پیدائش کے لمحے سے ہی ہو جاتا ہے۔

موت کی ابتدا پیدائش ہے اور موت بذاتِ خود انتہا۔ یہ سفر پیدائش کے وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ جس دن کو ہم یومِ پیدائش کہتے ہیں وہ موت کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس کو پورا ہونے میں وقت لگے گا' مگر سفر جاری رہے گا۔

مثال کے طور پر کوئی شخص دوارکا سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ تو اس کا پہلا قدم بھی کلکتہ پہنچنے میں اتنا ہی معاون ہوگا جتنا آخری قدم۔ کلکتہ پہنچنے میں اس کا آخری قدم بھی اتنا ہی نتیجہ خیز ہوگا جتنا کہ اس کا پہلا قدم تھا۔ اور اگر محض پہلا قدم اس کو کلکتہ نہیں پہنچا سکتا تو محض آخری قدم بھی اس کو کلکتہ پہنچانے کا باعث نہیں بن سکتا۔ اس لیے جب اس نے کلکتہ کی طرف پہلا قدم اٹھایا تب ہی اس نے کلکتہ پہنچنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ ہر قدم اس کو کلکتہ سے نزدیک تر کرتا رہا۔ آپ کے نکتۂ نظر سے وہ چھ مہینے میں کلکتہ پہنچا' مگر اصل بات یوں ہے کہ اس نے چھ مہینے پہلے سفر شروع کیا تھا اس لیے چھ مہینے بعد پہنچ سکا۔

دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ سوچنا غلط ہے کہ موت مستقبل میں آئے گی...... موت تو ہر لحظہ آ رہی ہے۔ پھر یہ مستقبل کیا ہے؟" یہ ہمارے اطراف کل موجودات کا حاصل جمع ہے۔ ہم اس میں سب کچھ جمع کرتے جا رہے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے ہم پانی گرم کرتے ہیں' پہلے

مرحلے میں پانی گرم ہوتا ہے' بھاپ کی شکل نہیں اختیار کر لیتا' یہی کیفیت دوسری ڈگری تک ہوتی ہے۔ اور جب اس کو سو ڈگری کی حرارت مل جائے گی تو وہ بھاپ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ مگر بھاپ کی شکل میں تبدیل ہو جانے کا عمل اس نے پہلی ڈگری سے ہی شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ ننانوے ڈگری تک بھی وہ بھاپ میں تبدیل نہیں ہو سکا' البتہ سو ڈگری مکمل ہونے پر وہ بھاپ میں بدل جاتا ہے۔

کیا آپ کو کبھی ادراک ہوا کہ سوویں ڈگری بھی اسی طرح ایک ڈگری ہے جس طرح پہلی ڈگری۔ ننانوے ڈگری سے سو ڈگری کی جانب سفر کی بھی وہی حقیقت ہے جو کسی فرق کے بغیر پہلی سے دوسری ڈگری کی طرف جانے کی ہے۔ اس لیے جن کو علم ہوگا وہ آپ کو پہلی ڈگری پر ہی آگاہ کر دیں گے کہ پانی بھاپ بن جائے گا...... حالانکہ اس وقت تک آپ پانی کو بھاپ بنتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ بلاشبہ وہ کہہ سکتا ہے کہ پانی گرم ہو رہا ہے...... مگر یہ کہ وہ بھاپ میں کب تبدیل ہوگا؟ ہم خود کو ننانوے ڈگری تک بہلاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ پانی تو ایک سو ڈگری تک پہنچنے پر ہی بھاپ بننے کا پابند ہے۔ بڑھتی ہوئی ہر ڈگری پانی کو ابلنے کے نکتے کی طرف لاتی رہتی ہے۔

لہٰذا خود کو موت سے بچا لینے کا تصور یا یہ خود فریبی کہ وہ تو مستقبل میں آئے گی' بے معنی ہے۔ موت ہر لمحہ آ رہی ہے' ہم روزانہ ہی مر رہے ہیں' خوش قسمتی سے مرنے اور جینے میں کوئی فرق نہیں ہے' جس کو ہم زندگی کہتے ہیں وہ بتدریج موت کی طرف بڑھتے رہنے کا نام ہے۔ میں آپ کو مستقبل میں جھانکنے کے لیے نہیں کہتا' میں تو صرف زمانۂ حال میں پیش آمدہ حالات کا مشاہدہ کرتے رہنے کے لیے کہتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں تو سوچنے کے لیے بھی نہیں کہتا۔

یہ دوست کہتا ہے "موت کے بارے میں کیوں سوچیں؟......" قبلہ! میں نے سوچنے کے لیے کب کہا؟ سوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا...... ہمیشہ یاد رکھیں کہ کوئی حقیقت محض سوچنے سے آشکارا نہیں ہوگی' سوچنا اصل میں حقائق کے بارے شکوک و شبہات پیدا کرنا ہے' پھول دیکھ کر اگر آپ سوچنا شروع کر دیں تو پھول کی حقیقت سے کبھی واقف نہیں ہو سکیں گے۔ جتنا آپ اس کے بارے میں سوچتے جائیں گے' وہ آپ کی حدِ ادراک سے دور ہوتا جائے گا۔ آپ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں نکل جائیں جبکہ وہ پھول وہیں پڑا رہے گا۔ پھول کو اس

سے کیا غرض کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ پھول ایک حقیقت ہے' اگر آپ اس کو جاننا چاہتے ہیں تو اس کے بارے میں سوچیں مت' اس کو دیکھیں۔

دیکھنے اور سوچنے میں فرق ہے......اور فرق بھی بہت غیر معمولی۔ مغرب میں سوچنے کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ انھوں نے فلسفۂ غور و فکر کو سائنس کا نام دے دیا ہے۔ تصوراتی سوچ بچار کا نام فلسفہ ہے۔ ہمارے یہاں اسکو درشن کہا جاتا ہے۔ درشن کا مطلب دیکھنا ہے' سوچنا نہیں' اس پر بھی تھوڑا غور کر لیں...... ہم جسے درشن کہتے ہیں اس کو وہ فلسفہ کہتے ہیں۔ اور دونوں میں بنیادی فرق ہے: جو لوگ دونوں کو ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھتے ہیں' انھیں کچھ نہیں معلوم۔ دونوں ہم معنی نہیں ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی فلسفہ نام کی کوئی چیز نہیں اور مغربی درشن نام کی بھی کوئی اصطلاح نہیں۔

مغرب کے پاس سوچنے کی سائنس ہے ......اس میں تحقیق' منطق اور تشریح تینوں شامل ہیں۔ مشرق نے کسی اور بات کو اہم سمجھا۔ یہاں اس بات کا تجربہ ہوا کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں غور و فکر کے ذریعہ کچھ نہیں جانا جا سکتا۔ کچھ حقیقتوں کو دیکھا جا سکتا ہے' جن کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ اور سوچنے اور زندہ رہنے میں ناقابلِ ادراک فرق ہے۔

محبت کے بارے میں سوچنے والا کوئی انسان شاید اس پر کوئی طویل مقالہ لکھ ڈالے' لیکن ایک عاشق جو اس کیفیت میں رہتا ہے' اسے دیکھتا ہے' وہ اس موضوع پر شاید کچھ نہ لکھ سکے' اور اگر کوئی اس سے محبت کے بارے میں کوئی سوال کرے تو ممکن ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں' اور وہ کہے "اس بارے میں کوئی بات نہ کریں' میں محبت کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" اور جو محبت کے موضوع پر سوچتا رہتا ہو وہ گھنٹوں اس موضوع پر بات کر سکتا ہے' خواہ وہ اس کے بارے میں جانتا کچھ بھی نہ ہو۔

سوچنا اور دیکھنا دونوں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں اس لیے میں آپ کو موت کے بارے میں سوچنے کے لیے نہیں کہتا۔ صرف سوچ کے ذریعے آپ موت کے بارے کچھ نہیں جان سکتے۔ اس کو جاننے کے لیے آپ کو اس کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا مقصد صرف ایک ہے: موت آپ کے اندر اس وقت بھی موجود ہے' اور آپ کو اس کا مشاہدہ کرنا ہے۔ جس کو ہر وقت 'میں' کہا جاتا ہے' وہ ہر آن فنا ہو رہی ہے۔ فنا کا یہ مرحلہ آپ کو دیکھنا ہوگا' اس

مرحلہ میں رہنا ہوگا' فنا کا یہ مرحلہ کہ "میں مر رہا ہوں ...... میں مر رہا ہوں" آپ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس سے گذرنا ہوگا۔

ہم موت سے حتیٰ الامکان نظریں چرانے کی کوشش کرتے ہیں' اور اس کے لیے ہم نے ہزاروں طریقے دریافت کر لیے ہیں۔ ہم اپنے سفید بال رنگ کر موت کو دھوکہ نہیں دے سکتے' وہ تو ہر حال میں آ کر رہے گی' بال رنگنے کے باوجود اندر تو سفید ہی رہیں گے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ موت نزدیک آ رہی ہے' وہ یقیناً آ کر رہے گی۔ اسے ہم کسی طرح جھٹلا نہیں سکتے۔ ہم اس کو جھٹلانے کے لیے کتنے ہی حیلے تراش لیں' اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ وہ بلا توقف بڑھتی ہی آ رہی ہے۔ بس ہم اس کی آمد سے بے خبر رہتے ہیں۔

لہٰذا میں کہتا ہوں: جس کو موت کا علم نہیں اسے کیا معلوم کہ زندگی کیا ہے؟ میرا نکتۂ نظر یہ ہے: موت اُس دائرے کا محیط ہے جس کا مرکز زندگی ہے۔ جب تک ہم دائرے کا محیط نہیں جان پائیں گے' یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا مرکز دریافت کر لیں۔ ہم اگر محیط سے دور نکل جائیں گے تو مرکز تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ اگر ہم گھر کی بیرونی دیواروں سے خوف کھا کر وہاں سے فرار ہو جائیں تو گھر کے رہائشی حصے میں کیسے داخل ہو سکیں گے؟ موت بیرونی حصہ کی حیثیت رکھتی ہے اور زندگی اس کے وسط میں قائم ایک معبد ہے۔ اس کے بیرونی حصے سے دور ہو کر ہم زندگی سے بھی دور ہو جائیں گے۔ جو موت سے آگاہ ہو جائے گا وہ رفتہ رفتہ زندگی کو بھی سمجھتا جائے گا۔

موت زندگی کو سمجھنے کا داخلی دروازہ ہے۔ موت کو جھوٹ سمجھنا گویا زندگی کو جھوٹ سمجھنا ہے۔ لہٰذا جب میں موت کی حقیقت جاننے کے لیے کہتا ہوں تو میں اس کے بارے میں سوچنے کے لیے نہیں کہتا ہوں۔

سمجھنے کے لیے ایک دلچسپ بات اور بھی ہے' وہ یہ کہ سوچنے کا مطلب ہے ذہن میں پہلے سے موجود باتوں کو اعادہ۔ حالانکہ سوچ کبھی نئی نہیں ہوتی لیکن بعض لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی سوچ بالکل نئی ہے۔ کوئی خیال کبھی نیا نہیں ہو سکتا۔ لیکن درشن البتہ نیا اور حقیقی ہو سکتا ہے۔

خیالات ہمیشہ پرانے' کہیں اور سے حاصل شدہ ہوتے ہیں' اگر میں آپ کو گلاب کے پھول کے بارے میں سوچنے کے لیے کہوں تو آپ کیا سوچیں گے؟ آپ پہلے سے معلوم شدہ

باتیں سوچنے کے علاوہ کیا کریں گے؟ اس کے علاوہ آپ کے پاس سوچنے کے لیے کیا ہوگا؟ نیرنگئ خیال یا کوئی اچھوتی بات جو آپ نے اس سے پہلے کبھی گلاب کے بارے میں نہ سنی ہو وہ آپ کیسے سوچ سکتے ہیں؟

سوچنا اپنے حافظے کو ٹٹولنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ آپ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ گلاب کا پھول بہت خوبصورت ہے۔ مگر یہ بات آپ اس سے پہلے کتنی بار سن چکے ہیں؟ یہی بات آپ کتنی بار پڑھ چکے ہیں؟ یا پھر آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میری محبوبہ جتنا خوبصورت ہے۔ یہ بات بھی آپ اس سے پہلے کتنی بار سن چکے ہیں؟ کتنی ہی بار پڑھ چکے ہیں۔ یا یہ کہیں گے کہ پھول بالکل تازہ ہے، مگر یہ بھی آپ کتنی ہی بار سن یا پڑھ چکے ہوں گے۔ خیالات کس کام کے؟ محض خیالات کے ذریعے آپ پھول کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ سوچ آپ کے حافظے میں موجود صرف ان باتوں تک آپ کی رہنمائی کرسکتی ہے جو آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ سوچ کبھی اصل نہیں ہوتی۔ دیکھنے والا البتہ اصل ہوتا ہے۔ پھول دیکھنے کی پہلی شرط ہے کہ اس کو دیکھنے والا سوچے نہیں، پہلے اپنے حافظے سے تمام خیالات محو کردے، بالکل خالی ہو جائے، اور اس لمحے صرف پھول کے ساتھ رہے، گلاب کے پھول کو ایک طرف رکھ کر دوسری طرف خود بیٹھ جائے، پھر آپ کے اور پھول کے درمیان کچھ نہ رہے، نہ کوئی سنی ہوئی بات، نہ کوئی پڑھا ہوا لفظ، پہلے سے حاصل شدہ کوئی معلومات، آپ دونوں کے درمیان کچھ بھی نہ ہو۔ اس کے بعد پھول میں جو کچھ ہے وہ آپ پر منکشف ہونا شروع ہوگا۔ اس کے بعد پھول کو جاننے کا آپ کو کوئی اضطراب، کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ اکیلے پھول کے ساتھ ہیں۔ پھر آپ پھول کو گہرائیوں تک سے جان لیں گے۔

مشاہدہ کرنے والا شے کے اندر کا جائزہ لیتا ہے جبکہ ایک مفکر اس کے اطراف میں چکر لگاتا ہے۔ اس لیے سوچنے والا کچھ حاصل نہیں کرسکتا، جب کہ دیکھنے والا حاصل کر لیتا ہے۔ شاہد کسی شے کی اندرونی حقیقت تک اس لیے جا پہنچتا ہے کہ اس کے اور زیرِ مشاہدہ شے کے درمیان کچھ حائل نہیں رہتا...... حائل دیواریں، منہدم ہو جاتی ہیں...... غائب ہو جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ کبیر نے اپنے بیٹے کو مویشیوں کے لیے جنگل سے چارہ لانے کو کہا۔ کمال حکم کے مطابق گیا، وہ صبح کے وقت گیا تھا اور جب سورج سر پر آ گیا تو کبیر کو فکر دامن گیر ہوئی، یہاں

تک کہ جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تب بھی کمال کا کوئی نشان نہیں تھا۔ کبیر کو اور بھی زیادہ فکر ہوئی، کیونکہ اب سورج بھی غروب ہونے والا تھا، لہٰذا کبیر کچھ ساتھیوں کو لے کر کمال کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

جب وہ جنگل میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ کمال گہری اونچی گھاس کے درمیان آنکھیں بند کیے ایسے لہرا رہا تھا جیسے گھاس کے پودے لہرا رہے تھے۔ کبیر نے اس کے پاس جا کر پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ کمال نے آنکھیں کھولیں تو جیسے ہوش میں آ گیا۔ اور فوراً معافی مانگی۔ کبیر نے کہا کہ تم اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے؟

کمال نے کہا" مجھے افسوس ہے، مگر جب میں یہاں آیا تو گھاس کاٹنے کے بجائے اس کو دیکھنا شروع کر دیا، مسلسل دیکھتے رہنے کے دوران مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کب ہوا کہ میں خود بھی گھاس کے تنکے میں بدل گیا۔ جلد ہی شام ہو گئی، اور میں یہاں اس بات سے بے نیاز کھڑا رہ گیا کہ میں کمال ہوں اور یہاں گھاس کاٹنے کے لیے آیا تھا۔ میں خود گھاس بن گیا، اور گھاس بن جانے میں بڑا لطف آیا، وہ لطف جو کمال کی حیثیت میں مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ آ گئے، کیونکہ معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ہوا کے جھونکے گھاس کے ساتھ مجھے بھی ہلا رہے تھے۔ کیا کاٹنا تھا، کسے کاٹنا تھا سب کچھ غائب ہو چکا تھا"

کیا کبھی آپ نے حقیقت میں اپنی بیوی اور اپنے بیٹے کو دیکھا ہے، جن کے ساتھ آپ کئی سال سے رہ رہے ہیں، کیا آپ نے کبھی ان کو دیکھا ہے؟ کل جو کچھ آپ کی بیوی نے کیا وہ آپ کے دماغ میں کوندے کی طرح لپک جاتا ہے...... اور یہ خیال آپ کے اور آپ کی بیوی کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ آپ کو یاد آتا ہے کہ کل دفتر جاتے وقت وہ کس طرح آپ سے جھگڑ رہی تھی...... وہ منظر دوبارہ آپ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ رات کے کھانے کے دوران اس نے کیا کہا؟ اس کا تصور آپ کے سامنے پھر آ موجود ہوتا ہے۔ آپ صرف سوچ رہے ہیں، دیکھ نہیں رہے، یہی بنیادی وجہ ہے کہ میاں بیوی اور باپ بیٹے کے درمیان تعلقات منقطع ہیں۔ رشتے درشن سے استوار رہتے ہیں۔ اسی کی بنا پر حقیقی رشتے قائم ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بگاڑ پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

دوعزیزوں کے مابین رشتہ قائم رہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس سلسلے میں کوئی تیسرا

معاون موجود ہے۔ جب بھی دو افراد کے مابین رشتہ کے قیام میں کوئی تیسرا دخل انداز ہوگا وہاں یقیناً ان میں بگاڑ پیدا کرنے والا بھی ہوگا۔ جو جوڑ سکتا ہے وہی توڑ بھی سکتا ہے۔ جس دن جوڑنے والا باقی نہیں رہے گا' جب صرف دو باقی رہ جائیں گے' جب ان کے درمیان کوئی تیسرا موجود نہیں ہوگا تب جو کچھ باقی بچے گا وہ صرف ایک ہوگا۔ دوئی ختم ہو جائے گی۔

تعلق کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کسی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ تعلق کا مطلب ہے کہ اب ہمارے بیچ میں کوئی دوسرا نہیں' اب کوئی دوسرا ہمارے ساتھ مل بھی نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں دو دھارے معدوم ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ اس کو محبت کہتے ہیں۔ دیکھنا؛ آپ کو محبت میں مبتلا کرتا ہے' دیکھنا؛ محبت کا ذریعہ ہے۔ اور جس نے محبت نہیں کی اس نے کبھی کچھ جانا ہی نہیں۔ انسان نے جو کچھ بھی جانا ہے محبت کے طفیل جانا ہے۔

اس لیے جب میں کہتا ہوں کہ موت کو جاننے کی ضرورت ہے' تو میں کہہ رہا ہوتا ہوں کہ ہمیں موت سے بھی اسی طرح محبت کرنی ہوگی۔ موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے روبرو دیکھنا ہوگا۔ اور جو شخص موت سے خوف زدہ ہے' اس سے فرار حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے...... وہ اس سے پیار کیسے کر سکتا ہے؟ وہ اس کا درشن کیسے پا سکتا ہے؟ وہ اس کو کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ جب موت اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے' وہ اس سے پیٹھ پھیر لیتا ہے' آنکھیں بند کر لیتا ہے' وہ کبھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈال سکتا۔ وہ ڈرتا ہے' وہ خوفزدہ ہے' جس کی وجہ سے وہ موت کو دیکھتا ہی نہیں' نہ وہ اس سے محبت کر سکتا ہے۔ اور جو شخص ابھی تک موت سے مانوس نہیں ہوا وہ زندگی سے کب محبت کر سکے گا۔ موت ایک عام سا سطحی واقعہ ہے اور زندگی ایک نہایت گہرے احساس کا نام ہے۔ جو پہلے ہی قدم پر منہ موڑ لے گا وہ کنویں کے گہرے پانی تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ موت کو دیکھنا ہوگا' اس کو جاننا ہوگا اس سے گذرنا ہوگا۔ آپ کو اس سے محبت کرنی ہوگی' اس کی آنکھوں میں جھانکنا ہوگا۔ جیسے ہی کوئی انسان موت سے آنکھیں ملاتا ہے' اس کو دیکھنا شروع کرتا ہے' اس میں داخل ہوتا ہے' وہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ موت کتنی سحر انگیز ہے۔ جسے میں موت سمجھ کر اس سے بھاگتا رہتا تھا' وہ اپنے اندر لازوال زندگی کا کتنا سامان لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا میں کہتا ہوں کہ اپنی

خوشی سے موت کے پہلو میں جگہ بنائیں تا کہ زندگی تک آپ کی رسائی ہو سکے۔

حضرت عیسیٰ کا ایک نہایت انمول قول ہے "جو خود کو بچائے گا وہ غرق ہو جائے گا' اور جو خود کو مٹا دے گا ......اسے کبھی کوئی فنا نہیں کر سکے گا' جو خود کو گم کرے گا وہ پا لے گا' اور جو خود کو بچائے گا وہ گم ہو جائے گا" اگر ایک بیج خود کو بچانا چاہے تو تباہ ہونا اس کا مقدر ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اس کا اور کیا ہوگا؟ دانہ خاک میں مل کر درخت بن جائے گا۔ بیج کی موت درخت کے لیے زندگی کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر بیج اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہے "میں خوفزدہ ہوں...... میں مر جاؤں گا...... میں گم ہونا نہیں چاہتا" تو وہ یقیناً برباد ہو جائے گا۔ اس صورت میں وہ بیج بھی نہیں رہ پائے گا' بیج کو خود ہی درخت بننے دیا جائے؟

ہم موت کے خوف سے سکڑ جاتے ہیں۔

میں ایک بات اور آپ کو بتانا چاہتا ہوں' جو ممکن ہے اس سے پہلے آپ کے ذہن میں نہ آئی ہو: صرف وہی لوگ انا میں مبتلا ہوتے ہیں جو موت سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انا پرست انسان ایک سہمی ہوئی شخصیت ہوتا ہے' مضبوط گانٹھ کی صورت۔ جو موت سے ڈرتے ہیں وہ اندر سے سکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو خوفزدہ ہوتا ہے اس کو اندر سے سکڑنا ہوتا ہے' اور جو سکڑتا ہے وہ انجام کار گانٹھ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے اندر ایک خاص قسم کا احساس جنم لے لیتا ہے۔

موت سے خوفزدہ انسان کے اندر 'میں' بیدار ہو جاتی ہے۔ اور وہ جو موت سے نہیں ڈرتا موت کو خوش آمدید کہتا ہے' اس سے بھاگتا نہیں ہے' اس کی انا معدوم ہو جاتی ہے۔ اور جب انا ختم ہو جاتی ہے تو صرف زندگی باقی رہ جاتی ہے۔ یہ بات ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں: صرف انا مر جاتی ہے' روح نہیں۔ مگر چونکہ ہم انا پرست رہنا پسند کرتے ہیں تو ایک بہت بڑی مشکل درپیش ہوتی ہے۔ اصل میں صرف انا ہی مر سکتی ہے۔ انا کو ہی موت ہے...... کیونکہ وہ جھوٹی ہے' اس کو ہر حال میں موت ہے' مگر ہم اسی کا سہارا لیے ہوئے ہیں۔

ایک مثال ہے: سمندر میں ایک لہر اٹھتی ہے' اگر وہ لہر کی صورت میں برقرار رہنا چاہے تو یہ ممکن نہیں...... اسے ہر حال میں ختم ہونا ہے۔ ایک لہر کب تک لہر رہ سکتی ہے؟ وہ فنا ہو جائے گی۔ ہاں اگر وہ برف بن جائے...... ٹھوس شکل اختیار کر لے تو ممکن ہے کہ وہ باقی رہ جائے۔ مگر

اس طرح بچ کر بھی وہ لہر کے بجائے برف بن جائے گی' ایسی محدود لہر' جو برف بن کر سمندر سے کٹی ہوئی ہے۔ خیال رہے کہ لہر کی شکل میں وہ سمندر سے دور نہیں سمندر کے ساتھ ہے' برف کی شکل میں وہ سمندر سے الگ ہے' ٹھوس ہونے کی وجہ سے الگ ہو کر منجمد ہو گئی ہے۔

وہ جب تک لہر تھی سمندر کا حصہ تھی' مگر برف کا تودہ ہو جانے کی وجہ سے وہ باقی تو رہ سکتی ہے' مگر سمندر سے جدا ہو کر۔ اور اس حالت میں بھی وہ کب تک باقی رہ سکتی ہے؟ جو کچھ جم جاتا ہے اس کو بہر حال پگھلنا بھی ہوتا ہے۔ ایک بیچاری لہر تو اور بھی جلد پگھل جائے گی۔ اور ایک بڑی لہر قدرے تاخیر سے ...... پگھلنا تو اسے بھی ہے ...... اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ سورج کی شعاعیں بڑی لہر کو ذرا دیر سے پگھلائیں گی اور چھوٹی لہر جلد پگھل جائے گی۔ صرف وقت کا فرق ہوگا' مگر پگھلنا لازمی ہے۔ لہر پگھل جائے گی اور تھوڑی دیر میں اس کا نشان تک باقی نہیں رہیگا۔ اور اگر وہ لہر اپنے آپ کو واپس سمندر میں پھینک کر اپنے آپ کو علیحدہ ہونے سے بچا لیتی' اور اس بات کا ادراک کرتی کہ سب کچھ سمندر ہی ہے تو اس کے غائب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ پھر وہ غائب ہوتی کہ موجود' اس کا وجود برقرار رہتا کیونکہ پھر وہ محض ایک لہر نہیں خود سمندر ہوتی۔ وہ لہر کی صورت میں معدوم ہونے کے باوجود پورے سمندر کی حیثیت میں موجود رہتی۔ جب وہ اٹھتی ہے تو مصروفِ عمل ہوتی ہے' اور آرام کا وقفہ بھی اس کے لیے اتنا ہی پر لطف ہے جتنا متحرک رہنا۔ بلکہ یہ تو اور بھی زیادہ لطف دیتا ہے۔

متحرک رہنا ایک کیفیت ہے' اور آرام کرنا بھی ایک کیفیت ہے۔ ہم جسے سمسار کہتے ہیں وہ متحرک کیفیت ہے' اور جسے ہم نجات کہتے ہیں وہ آرام کی کیفیت ہے۔ یہ ایک بے چین لہر کی طرح ہے جو ہواؤں کے خلاف لڑتی ہے۔ اور واپس سمندر میں گر کر معدوم ہو جاتی ہے مگر پھر بھی باقی رہتی ہے۔ جو حیثیت سمندر میں اس کو پہلے حاصل تھی وہ اب بھی حاصل ہے مگر اس وقت وہ آرام کر رہی ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو لہر رکھنے پر مصر رہتی تو گویا وہ انا پرست ہے' اور خود کو سمندر سے علیحدہ کر لینا چاہتی ہے۔

جب ایک بار آپ کے سر میں یہ سودا سما جائے کہ 'میں ہوں' تو باقی لوگوں کے ساتھ آپ کیسے گذارا کر سکیں گے؟ اگر آپ سب کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیں تو انا کو ختم کرنا پڑے گا۔ آپ کی انا سب سے علیحدگی کا تقاضہ کرتی ہے' اور یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سب سے کٹ

جانے کا مطلب ہے خود غرضی۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ آپ کو مجبور کرتی ہے کہ سب سے تعلق جوڑو! یہ انا کا ازحد اذیت ناک طریقہ ہے۔ پہلے وہ کہتی ہے "سب سے علیحدہ ہو کر خود کو تنہا کر لو' تم سب سے ممتاز ہو! ان سب سے تمھارا کیا تعلق؟ پھر انا خود کو ایک طرف کر لیتی ہے' مگر پھر خود کو مشکلات میں گھرا محسوس کرتی ہے۔ کیونکہ 'میں' سب سے علیحدہ ہو کر خود غرض ہو جاتی ہے اور اس کا انجام سامنے آ جاتا ہے۔ گویا لہر جب اس زعم میں آ جاتی ہے کہ وہ سمندر سے علیحدہ وجود ہے تو وہ اپنے خاتمے کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے' اس کا انجام نزدیک ہوتا ہے' پھر وہ اپنی بقا کی جدوجہد میں الجھ جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جب تک سمندر سے وابستگی رہتی ہے' تو فنا کا کوئی تصور نہیں ہوتا کیونکہ سمندر لافانی ہے۔ سمندر لہر کے بغیر ممکن ہے مگر لہر سمندر کے بغیر ممکن نہیں۔ سمندر کے بغیر لہر کا تصور بھی محال ہے۔ جبکہ لہر میں سمندر بذاتِ خود موجزن رہتا ہے۔ سمندر بہر حال لہروں کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ جب تک لہریں سمندر کا حصہ ہوتی ہیں آرام اور عافیت ان کا نصیب ہوتی ہیں۔ لیکن جب کوئی لہر اس دھارے سے کٹ کر خود کو علیحدہ سے شناخت کرانے کی خواہش کرتی ہے تو گویا وہ خود کو فنا کے حوالے کرتی ہے۔

یہ وجہ ہے کہ جن کو مرنا ہے ان کو محبت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب ...... جن کو مر جانا ہے ...... محبت کے طلبگار ہوتے ہیں ...... کیونکہ محبت بلا شک و شبہ جوڑتی ہے۔ لوگ محبت کے بغیر اس لیے نہیں رہ سکتے کہ خود غرض نہ کہلائیں۔ ہر شخص محبت کی تلاش میں ہے' کسی کو آپ کی محبت کی ضرورت ہے' اور کوئی آپ کے لیے دل میں محبت رکھتا ہے۔ اور جس کو محبت نہیں ملتی وہ مسائل میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر کیا کبھی ہم نے یہ جاننے کی زحمت کی کہ محبت کا مطلب کیا ہے؟

ٹوٹے ہوئے باہمی رشتوں کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے دوبارہ جوڑنے کا نام محبت ہے۔ لہٰذا محبت کی ایک قسم تو وہ ہے جو ہم سب سے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو ٹکڑے ٹکڑے جمع کر کے جوڑنے سے قائم کرتے ہیں' ایک تو اسے محبت کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ ہے جب ہم دوسروں سے ناطے توڑنا بند کر دیتے ہیں۔ اسے عبادت کہتے ہیں۔ عبادت مطلق پیار ہے۔ اور اس کا مفہوم بالکل الگ ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم کسی مکمل چیز کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ رہے ہیں۔ بلکہ ہم نے کل سے علیحدہ ہونے کی روش ترک کر دی ہے۔ سمندر کی لہر کا یہ کہنا کہ میں سمندر ہوں' تو اس طرح وہ خود کا دوسری لہروں سے الگ وجود ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے۔

یہ بات خیال میں رہے کہ لہر اپنے اطراف کی تمام لہروں کی طرح فانی ہے' اگر کوئی لہر دوسری لہروں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی کوشش کرے گی تو وہ مسائل میں مبتلا ہو جائے گی۔ اسی بنا پر محبت کے نام نہاد جذبے کو تکلیف دہ خیال کیا جاتا ہے' کیونکہ اس کی مثال اس لہر جیسی ہوتی ہے جو دوسری لہروں کے ساتھ تعلق کو اپنی بقا کا ضامن سمجھتی ہے۔ یہ خود اور دوسری لہریں سب کو فنا ہو جانا ہے' پھر بھی وہ ایک دوسرے سے اس امید پر پیوست رہتی ہیں کہ اس طرح شاید وہ خود کو فنا ہونے سے بچالیں۔ اس وجہ سے ہم کو محبت کے ساتھ تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے انسان تنہا رہنے سے ڈرتا ہے۔ بیوی' شوہر' بیٹا' ماں' باپ' بھائی' دوست' معاشرہ' ادارہ' قوم سب کی خواہش ہوتی ہیں۔ یہ انا کی جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہیں' ان لوگوں کی خواہشات کی تسکین جو خود کو سب سے الگ سمجھ کر جدا ہو بیٹھے تھے اور اب ان سے دوبارہ وابستہ ہونا چاہتے ہیں۔

سب سے باہم دگر ہونے کی یہ روش دراصل موت کے راستے پر گامزن ہونے کی دعوت ہے' کیونکہ جس سے آپ رابطہ استوار کر رہے ہیں وہ خود بھی آپ کا جتنا ہی موت کے گھیرے میں ہے' آپ کا جتنا ہی انا کا شکار ہے' اور مزے کی بات یہ کہ جو دوسرا آپ سے جڑ رہا ہے اسے بھی لافانی ہونے کی خواہش ہے اور اس سے رابطہ قائم کرنے میں درپردہ آپ کے پیش نظر بھی لافانیت کی خواہش ہے' جبکہ انجام کار مرنا دونوں کو ہی ہے' دونوں فانی ہیں۔

آپ لافانی کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ کا یہ اتحاد تو دوہری موت میں بدل جائے گا۔ یہ آبِ حیات میں تو ڈھل نہیں جائے گا۔

اپنے پیار کو امر کرنے کے لیے دو محبت کے مارے بڑی جدوجہد کرتے ہیں...... وہ رات دن محبت کے گیت گاتے ہیں۔ حیاتِ دوام کے لیے' محبت کے لازوال ہونے کے نغمے لکھے گئے۔ دو افراد جن کو ہر حال میں فنا ہو جانا ہے' باہم لازوال ہونے کی خواہش کیوں کرتے ہیں؟ دونوں کا ملاپ موت کے تصور کو دگنا کرنے کے علاوہ کیا دے سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ دونوں ہی پگھلتے جا رہے ہیں' ڈوبتے جا رہے ہیں' معدوم ہوتے جا رہے ہیں' کیونکہ وہ خوف زدہ ہیں' متفکر ہیں۔

لہر نے خود کو ایک خود مختار ادارہ سمجھ لیا ہے۔ وہ کہتی ہے: " مجھے باقی رہنا ہے" اس طرزِ فکر نے قومیں بنائی ہیں' اسی نے ہندو بنائے ہیں' مسلمان بنائے ہیں...... لہریں جن مختلف اداروں

کو جنم دے رہی ہیں۔ ان تمام اداروں کو فنا ہو جانا ہے...... اندرونِ سطح جو سمندر موجزن ہے وہی واحد اور ناقابلِ تقسیم اور لافانی ادارہ ہے۔ ناقابلِ تقسیم مرکز ایک قطعی طور پر مختلف ادارہ ہے۔ اس سے تعلق کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ لہر خود کو سمندر سے وابستہ کیے ہوئے ہے...... نہیں بلکہ لہر جانتی ہے کہ: " میں سمندر سے رتی بھر مختلف نہیں ہوں" اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ کسی مذہب پرست انسان کا کسی ادارے سے کوئی تعلق نہیں...... نہ اس کا کوئی خاندان ہوتا ہے...... نہ کوئی دوست' نہ باپ نہ بھائی۔

حضرت عیسیٰ نے بعض بڑے سخت الفاظ کہے ہیں۔ محبت کی معراج پالینے والا ہی ایسے الفاظ کہہ سکتے ہیں' کمزور محبت والے لوگ ایسے الفاظ کہنے کے روادار نہیں ہو سکتے۔ ایک روز حضرت عیسیٰ بازار کے اندر لوگوں میں گھرے کھڑے تھے۔ ان کی ماں حضرت مریم ان سے ملنے کے لیے وہاں آئی۔ لوگوں نے ان کے لیے راستہ بنانا شروع کیا اور کسی نے چلا کر کہا" راستہ دو! حضرت عیسیٰ کی ماں کو آنے دو!" جب حضرت عیسیٰ نے یہ سنا تو نے بلند آواز میں کہا" اگر تم لوگ عیسیٰ کی ماں کو راستہ دے رہے ہو تو اس کی ضرورت نہیں' کیونکہ عیسیٰ کی کوئی ماں نہیں ہے" یہ سن کر حضرت مریم کو دھچکا لگا اور وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

مجمعے کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ نے کہا" جب تک تمھارا ماں سے' باپ سے' بھائی سے رشتہ ہے' تم کو میرے پاس آنے کا حق نہیں ہے" یہ ناقابلِ یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ جیسا محبت کا پیکر ایسے الفاظ بھی استعمال کر سکتا ہے: " میری کوئی ماں نہیں ہے' کون ہے میری ماں!؟" لہٰذا حضرت مریم وہیں کھڑی رہ گئیں اور حضرت عیسیٰ کی تقریر جاری رہی" کیا تم اس عورت کو میری ماں کہہ رہے ہو؟...... میری کوئی ماں نہیں ہے...... اور یاد رکھو کہ اگر اب بھی تمھاری کوئی ماں ہے تو تم میرے نزدیک آنے کے قابل نہیں ہو"

اصل معاملہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی لہر کسی دوسری لہر سے وابستگی کا احساس رکھتی ہے تو وہ سمندر کی لامحدود وسعتوں میں جگہ پانے کی حقدار نہیں رہتی۔ لہریں جو آپس کا اتحاد قائم کر کے اپنا ادارہ علیحدہ بنانے کو اہم سمجھتی ہیں وہ سمندر کو نظر انداز کر کے ہی ایسا کرتی ہیں۔ اپنی ذات میں تنہا لہر اپنی فنا کی طرف سے خوف زدہ ہوتی ہے' حالانکہ وہ پہلے ہی فنا کے راستے پر گامزن ہے۔

لہٰذا چند لہریں باہم متحد ہو کر چند در چند تحفظ محسوس کرتی ہیں اور کسی نوع کا ادارہ قائم کر لیتی ہیں، حتیٰ کہ ایک بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ انسان کیونکہ بھیڑ بھاڑ میں رہنا پسند کرتا ہے، تنہا رہنے سے ڈرتا ہے۔ اپنی تنہائی میں لہر صرف اپنے آپ تک محدود ہو جاتی ہے۔ دور ہوتی ہوئی...... منتشر ہوتی ہوئی، گم ہوتی ہوئی، معدوم ہونے کے قریب، ہر دو جانب متوجہ: ایک طرف لامحدود سمندر، دوسری طرف باقی ماندہ لہریں۔ اسی طرزِ عمل کے نتیجے میں ادارے وجود میں آتے ہیں، زنجیریں بنتی ہیں۔

باپ کہتا ہے "میں ختم ہو جاؤں گا، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا...... میں اپنے پیچھے اپنا بیٹا چھوڑ جاؤں گا"...... لہر کہتی ہے "میں گم تو ہو جاؤں گی...... مگر اپنے پیچھے ایک چھوٹی لہر باقی چھوڑ جاؤں گی، میرے بعد یہ زندہ رہے گی، اور سلسلہ جاری رہے گا، میرا نام باقی رہ جائے گا" جس کے کوئی بیٹا نہیں ہوتا، وہ باپ افسردہ ہو جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا دائم زندہ رہنے کا تصور فنا ہو جاتا ہے۔ اسے تو بہرحال جانا ہی ہوتا ہے مگر وہ اپنے پیچھے جاری رہنے والا سلسلہ قائم نہیں کر پاتا جو اس کے حوالے سے اس کی پہچان کا باعث بن سکتا۔ اس لیے پچھلی لہر کا معدوم ہو جانا برحق ہے کہ وہ اپنے پیچھے دوسری لہر چھوڑ جاتی ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا ہو یا نہیں کہ جو لوگ مصور، موسیقار، شاعر، یا مصنف ہوتے ہیں ان کو بیٹا ہونے نہ ہونے سے کوئی خاص دلچسپی باقی نہیں رہتی کیونکہ انھیں اپنی تخلیقات کی شکل میں اولاد کا متبادل مل جاتا ہے جس کے ذریعے ان کی پہچان باقی رہتی ہے۔ ان کی مصوری باقی رہ جائے گی، ان کی شاعری باقی رہ جائے گی، ان کی سنگتراشی باقی رہ جائے گی، ان کو پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کا کوئی بیٹا بھی ہو! اس وجہ سے سائنسدان، مصور، سنگ تراش، مصنف اور شاعر کو بیٹے کی عدم موجودگی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی سوائے اس کے کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی کہ ان کو دوسری قسم کی اولاد مل جاتی ہے۔ انھوں نے ایک ایسی لہر تخلیق کر دی ہے جو ان کے جانے کے بعد بھی موجود رہے گی۔ درحقیقت ان کو ایسا بیٹا مل گیا ہے جو آپ کے بیٹے سے زیادہ عرصے رہے گا، آپ کا بیٹا تو نہیں رہے گا لیکن ان کی تخلیق موجود رہے گی۔

ایک مصنف اپنے بیٹے کی یا اولاد نہ ہونے کی پرواہ نہیں کرتا، اس بات کا بہرحال یہ مطلب نہیں کہ وہ تفکرات سے آزاد ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے بیٹے سے زیادہ دیر تک

باقی رہنے والی لہر دریافت کر لی ہے، اور اس کو چھوٹی لہروں کے بارے میں فکرمند رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب اسکو خاندان بنانے کی خواہش نہیں، اس نے ایک مختلف قسم کا خاندان بنا لیا ہے، جس کے سہارے اس کو اسی درجہ کی لافانیت حاصل ہو جائے گی۔ پھر وہ کہہ سکے گا "پیسہ ساتھ نہیں رہے گا، دولت ختم ہو جائے گی، لیکن میرا کام، میری تحریر زندہ رہے گی" جو مختصراً اس کا مقصود بھی ہے،

مگر تحریریں بھی ضائع ہو جاتی ہیں، کوئی تحریر ہمیشہ باقی نہیں رہتی، بیشک یہ نسبتاً زیادہ عرصہ رہ جاتی ہیں...... لیکن کسے معلوم کہ اب تک کتنی تحریریں گم ہو چکی ہیں؟ اور کتنی روزانہ گم ہو رہی ہیں؟ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اصل میں لہروں کی اس دنیا میں، خواہ کوئی لہر کتنی ہی دیر باقی رہے...... لیکن مآلِ کار فنا ہو جانا اس کا مقدر ہے۔ لہر ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ عدم اس کی منزل ہے، تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس لیے اگر آپ خود کو ایک لہر کے نظریے سے دیکھیں تو آپ بھی خود کو موت سے گریزاں پائیں گے۔ خوفزدہ...... متوحش...... میں کہتا ہوں: موت کی طرف دیکھئے!...... نہ آپ اس سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں...... نہ اس سے ڈرنے، خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اس سے فرار بھی ناممکن ہے۔ اس کو دیکھئے!...... اس کی طرف دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ ایک جانب سے جو موت دکھائی دیتی ہے وہی دوسری جانب سے زندگی ہے۔ پھر لہر سمندر کا روپ دھار لے گی، فنا کا خوف زائل ہو جائے گا۔ پھر برف کی طرح جم جانے کی خواہش باقی نہیں رہے گی۔ پھر باقی وقت وہ آسمانوں میں رقص کرتی رہے گی، سورج کی کرنوں میں مست و بیخود اور شادمان رہے گی۔ اور جب واپس سمندر میں گرے گی تو آرام کے ان لمحوں میں بھی بدستور خوش و خرم رہے گی۔ پس...... وہ زندہ رہ کر بھی خوش ہے اور فنا ہونے کے بعد بھی۔ اس کو معلوم ہے کہ "وہ...... جو ہے" وہ نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ اس کو فنا ہے "وہ جو ہے"...... وہ ہے...... بس ہئیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

ہم سب شعور کے سمندر کی لہریں ہیں...... ہم میں سے کچھ برف کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں...... بلکہ اکثر۔ ہماری انا برف کے قالب میں ہے، اتنی سخت جتنی چٹان۔ کتنی تعجب خیز صورت ہے کہ پانی جیسا سیال برف جتنا، بلکہ چٹان جتنا سخت ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارے اندر یہ خواہش پیدا ہو جائے تو شعور و آگہی جتنی سادہ اور سیال شے جم کر انا پرستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہم سب جم جانے کی خواہش سے لبریز ہیں اس لیے مختلف حیلے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں

جو ہمیں جما سکیں......ٹھوس کر سکیں۔

پانی کو برف کی صورت میں تبدیل کرنے کے بھی قوانین ہیں' اور انا کو وجود بخشنے کے بھی' پانی کو برف میں تبدیل ہونے کے لیے ٹھنڈا ہونا پڑتا ہے' اپنی حرارت زائل کر کے سرد ہونا پڑتا ہے' جتنا ٹھنڈا ہوتا جائے گا اتنا سخت ہوتا جائے گا' جو انسان انا کو پروان چڑھانا چاہے اسے بھی خود کو ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے' اسے بھی اپنی حدت میں کمی کرنی پڑتی ہے۔ ہم گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں' کیونکہ گرمی خوش آمدید کے ساتھ ہی وابستہ ہے' ٹھنڈی خوش آمدید کوئی نہیں کہتا' ایسا کہنا بالکل بے معنی ہوگا۔

پیار کے ساتھ بھی گرمی وابستہ ہے' ٹھنڈے پیار کے بھی کوئی معنی نہیں' پیار کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا' فطرتاً یہ بھی حدت سے معمور ہوتا ہے' درحقیقت زندگی کی بقا بھی حدت سے ہے' موت سرد ہے' زیرو ڈگری سے بھی نیچے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج کو زندگی کی علامت کہا جاتا ہے' سورج حدت کی علامت ہے۔ صبح جب یہ طلوع ہوتا ہے تو خموشی رخصت ہو جاتی ہے' ہر چیز میں زندگی کی حرارت دوڑ جاتی ہے' پھول کھل اٹھتے ہیں' پرندے چہچہانا شروع کر دیتے ہیں۔ حرارت زندگی کی علامت ہے' یخ بستگی موت کی علامت ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو اپنی انا بیدار کرنی ہو تو اسے خود کو سرد کرنا پڑے گا' اور اس کے لیے اس کو ان تمام چیزوں سے دوری اختیار کرنی ہوگی جو کسی درجے پر حرارت بہم پہنچانے کی پابند ہیں۔ اسے اپنے جسم کو حرارت بخش چیزوں سے دور رکھنا ہوگا۔ جن میں بطور مثال: محبت حرارت بخشتی ہے' نفرت سرد کرتی ہے' اس لیے انا کی خاطر محبت کو تج کر نفرت اختیار کرنا ہوگی۔ رحم اور ہمدردی گرم جذبات کا باعث ہوتے ہیں' ظلم اور سرد مہری ٹھنڈے جذبات کے مظہر ہوتے ہیں۔

جس طرح پانی جمانے کے قوانین ہیں اسی طرح انسانی شعور کو منجمد کرنے کے بھی قوانین ہیں' وہی قانون یہاں بھی کام کرتا ہے......سرد سے سرد تر ہونا جاری رکھیے۔ بعض اوقات ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا ٹھنڈا ہے!......اس میں قطعی نرمی نہیں ہے' پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے' ذہن میں رکھیے کہ جو شخص جتنا گرم ہوگا اتنا ہی سادہ ہوگا۔ اس میں اتنی ملائمت ہوگی کہ وہ کسی کے بھی دل میں گھر کر سکتا ہے اور کوئی بھی اس پر فریفتہ ہو سکتا ہے۔ ایک سرد مزاج آدمی سخت ہو جاتا ہے' ملائمت سے محروم' ہر طرف سے بے تعلق' اس کے دل میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا' نہ ہی وہ

کسی کے دل میں جگہ بنا سکتا ہے۔ انا گویا جمی ہوئی برف ہے اور محبت جیسے رواں دواں شفاف پانی جو شخص موت سے خوف زدہ ہوگا وہ اس سے دور رہنا چاہے گا۔ وہ برف کی طرح منجمد ہوتا جائے گا' کیونکہ یہ خوف کہ وہ مر جائے گا' فنا ہو جائے گا' اس کو مفلوج کر کے رکھ دے گا' اس کی انا نہ صرف موجود رہے گی بلکہ بڑھتی رہے گی' سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی۔

ایک بار چند دن کے لیے میں ایک دوست کے یہاں مہمان ٹھہرا۔ وہ کافی جائیداد کا مالک ایک امر کبیر شخص ہے۔ مگر میں اس کی ایک بات پر خاصا حیران ہوا کہ وہ کبھی کسی سے نرمی سے بات نہیں کرتا تھا' اس کے علاوہ وہ ایک معقول انسان تھا۔ یہ امر باعثِ حیرانی تھا کہ وہ اندر سے تو ایک مہربان شخص تھا لیکن باہر سے وہ ایک سخت گیر انسان تھا۔ اس کے ملازم اس کے سامنے لرزتے تھے' اس کا بیٹا اس کے سامنے کانپتا تھا' اس کی بیوی اس کے سامنے آنے سے گھبراتی تھی' ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی کوئی اس کے دروازے پر آتا تھا۔ یہاں تک کہ دروازے پر آ کر بھی وہ گھنٹی بجاتے ہوئے ہچکچاتا تھا' اور اندر داخل ہوتے وقت گومگو کی کیفیت میں ہوتا تھا۔

جب میں اس کے ساتھ ٹھہرا اور سب کچھ نزدیک سے دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں پوچھ بیٹھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اصل میں تو تم ایک سادہ انسان ہو۔ تو جواب میں وہ بولا کہ "میں ڈرتا ہوں' کسی سے تعلقات قائم کرنا خطرناک ثابت ہوتا ہے' جس سے بھی تعلقات قائم ہو جائیں وہ جلد یا بدیر پیسوں کا تقاضہ کرتا ہے' اگر بیوی سے خوشگوار باہمی تعلقات ہوں تو گھریلو اخراجات میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے' اگر بیٹے کے ساتھ سختی سے پیش نہ آؤ تو اس کے جیب خرچ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے' اگر نوکروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ تو وہ خود کو مالک سمجھنے لگتے ہیں" اس لیے اس نے اپنے چاروں طرف ایک ٹھوس دیوار قائم رکھنا ضروری سمجھ لیا تھا......اس سے اسکی بیوی خوفزدہ ہو کر اس سے دور رہے گی......اس کا بیٹا بھی نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر سکے گا' کتنے باپ ایسا کرتے ہیں؟

سچی بات تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں باپ بیٹوں کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہو۔ بیٹا اسی وقت باپ کے سامنے جانے کی ہمت کرتا ہے جب اس کو پیسوں کی ضرورت ہو' باپ بیٹے کو اسی وقت آواز دیتا ہے جب اسے کوئی حکم دینا مقصود ہو' بصورتِ دیگر دونوں کو آپس میں ملنے کی ضرورت نہیں ہوتی' دونوں کے پاس ایک دوسرے سے ملاقات کا کوئی ایجنڈا نہیں

ہوتا۔ باپ اپنی جگہ خوفزدہ ہے......اس نے اپنے اطراف سخت گیری کی ایک دیوار کھڑی کی ہوئی ہے' بیٹا الگ خوف میں باپ سے چھپا پھرتا ہے' دونوں کے مابین کسی قسم کا ربطِ باہم نہیں۔ کوئی انسان جتنا خوفزدہ ہوگا اتنا ہی اس کو اپنے تحفظ کی فکر پیدا ہوگی' اور وہ اتنا ہی سخت گیر ہوتا جائے گا۔ نرم دل ہونے میں بڑے خطرات مضمر ہیں' عدم تحفظ کا احساس بڑھتا ہی رہتا ہے۔

کسی سے محبت نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ جب ہم نے لوگوں کے عادات و اطوار کو خوب اچھی طرح جان لیا' ان کو بہتر طریقے سے پہچان لیا تو ہم کسی کے ساتھ محبت کر سکتے ہیں؟ سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پیشگی اطمینان کرلیں کہ کسی کی طرف سے ہم کو کوئی خطرہ تو نہیں' اس کے بعد اس سے محبت کریں!؟ اسی نظریے کے تحت شادی کا رواج ہوا...... پہلے شادی کریں ......اور تمام مراحل سے گذرنے کے بعد محبت کریں......آنکھیں بند کر کے محبت کرنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ محبت ایک سیال شے کے مترادف ہے' جس کے ذریعے کسی کے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے۔ کسی اجنبی کی محبت میں گرفتار ہونا خطرناک ہے' وہ آپ کی قیمتی اشیا کے ساتھ رات میں کسی وقت فرار ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہم پہلے اچھی طرح اس بات کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ ...... کیا کرتا ہے؟ ......اس کے والدین کہاں سے تعلق رکھتے ہیں؟ ......اس کا کردار کیسا ہے؟ ......اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ ہم ہر ممکن اقدامات کرتے ہیں' ہر قسم کے سماجی تحفظات پیشِ نظر رکھتے ہیں' اس کے بعد ہی کسی فرد کو شادی کے لیے منتخب کرتے ہیں۔

ہم خوف میں مبتلا لوگ ہیں' پہلے ہر ممکنہ خطرے کا سدِ باب کر لینا چاہتے ہیں۔ ہم خود کو جتنا محفوظ کرتے ہیں' ہمارے گرد برف کی اتنی ہی سخت دیوار بلند ہوتی چلی جاتی ہے اور ہمارے پورے وجود کو سکیڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ہم چونکہ ملاحت سے محروم ہو کر انتہائی سخت ہو گئے ہیں تو آفاقیت سے بھی ہمارا تعلق ختم ہوگیا ہے۔ اس عدم تعلق کا سبب صرف ہماری سخت گیری ہے' ہم منجمد برف کی مانند ہو چکے ہیں۔ اگر ایک بار ہمارے اندر نرمی پیدا ہو جائے تو یہ علیحدگی ختم ہو سکتی ہے۔ مگر ہمارے اندر نرمی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہم موت کا سامنا کرنے اور اس کے اندر جینے کے لیے آمادہ ہو سکیں۔ جب ہم یقین کرلیں کہ موت برحق ہے۔

جب ہم ایک بار موت کو دیکھ کر اس کی موجودگی کا یقین کرلیں گے تو کسی قسم کے خوف کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ جب واقعتاً موت کو آنا ہے' اور جب زندگی کی لہر کو معلوم ہے کہ اسے

معدوم ہو جانا ہے' جب اس لہر کو خوب اچھی طرح علم ہے کہ پیدائش میں ہی موت مضمر ہے' اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی فنا کا آغاز اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ہو گیا تھا' تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ اب برف کی طرح منجمد ہو جانے کی گنجائش کہاں باقی رہی؟ پھر تو لہر جب تک وہ موجود ہے' اور سمندر جب تک وہ موجود ہے' ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اور بس! معاملہ ختم! پھر ہر چیز قابلِ تسلیم ہے۔ اس اعتراف کے ساتھ ہی موج سمندر کے روپ میں نظر آجائے گی۔ پھر اس کی فنا کے بارے میں تمام اندیشے ختم ہو جائیں گے' پھر لہر خود اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے گی کہ پہلے بھی وہ موجود تھی اور اپنی فنا کے بعد بھی وہ بدستور موجود ہے۔ صرف 'میں' کی صورت میں نہیں بلکہ لامحدود وسعتوں کے حامل سمندر کی شکل میں۔

جب لاؤزو کا آخری وقت قریب آیا تو کسی نے اس کی زندگی کے کچھ راز جاننے کی خواہش کی۔ لاؤزو نے کہا" پہلا راز تو یہ ہے: مجھے زندگی میں کبھی کوئی شکست نہیں دے سکا" یہ سن کر اس کے شاگردوں کو بیحد حیرانی ہوئی' انھوں نے کہا کہ یہ بات آپ نے اس سے پہلے ہمیں کبھی نہیں بتائی' ہم بھی فتح مندر رہنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں بھی وہ طریقہ بتایئے۔

لاؤزو نے جواب دیا" تم لوگ غلطی پر ہو......تم نے غلط سنا......میں نے کہا ہے کہ مجھے آج تک کوئی شکست نہیں دے سکا' اور تم کہہ رہے ہو کہ ہم فتحمندی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسری سے بالکل برعکس ہیں' بیشک معنوں میں ایک جیسی لگتی ہوں۔ لغات میں' زبانوں کے اعتبار سے ان کے معنی ایک ہی ہیں...... کہ ایسا شخص جس کو کبھی شکست نہ ہو سکی ہو فاتح کہلاتا ہے۔ میں نے سادہ طریقے سے یہ کہا ہے کہ مجھ کو کبھی کوئی شکست نہیں دے سکا۔ اور آپ فاتح بننا چاہتے ہو۔ یہاں سے چلے جاؤ! تم میری بات کبھی نہیں سمجھ سکو گے۔ شاگردوں نے تعمیل حکم کا رجحان ظاہر کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ بہتر ہے' لیکن مہربانی کر کے پھر بھی ہمیں یہ بات واضح کر کے سمجھائیں۔ وہ راز بتائیں کہ آپ کس طرح ناقابلِ شکست رہے؟

لاؤزو نے کہا کہ مجھے اس لیے کوئی شکست نہیں دے سکا کہ میں پہلے ہی شکست خوردہ ہوں۔ پہلے سے شکست خوردہ شخص کو کون شکست دے سکتا ہے؟ مجھے کوئی اس لیے نہیں ہرا سکا کہ میں نے کسی سے جیتنے کی کبھی خواہش ہی نہیں کی۔ اصل میں مجھ سے لڑنے کی کوئی ہمت نہیں کرتا تھا اگر کبھی کسی نے مجھ سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی بھی تو اس کو پتہ چل گیا کہ میں تو پہلے ہی ہارا ہوا

ہوں۔ اس لیے مجھ سے مقابلہ کرنے میں اسے لطف کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لطف اسی میں آتا ہے کہ مقابلہ برابر کا ہو یعنی دونوں ہی ایک دوسرے پر حاوی ہونا چاہیں۔ ایسے آدمی سے کیا لڑنا جو جیتنا ہی نہیں چاہتا ہو۔

بات دراصل یہ ہے کہ کسی کی انا کو توڑنے سے خود اپنی انا کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن جب کوئی انسان خود کو ہی مٹا بیٹھا ہو اس کو تباہ کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ ہماری انا کو اس سے کوئی نتیجہ نہیں مل سکتا۔ ہم کسی دوسرے کی انا کو جتنا ٹھیس پہنچاتے ہیں اتنی ہی ہماری اپنی انا کی تسکین ہوتی ہے۔ لیکن جس شخص کی ہم بات کر رہے ہیں اس کی انا پہلے ہی پاش پاش ہو چکی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ آپ کسی کو شکست دینے والے ہیں' اور اس سے پہلے کہ آپ اس کو چت کریں' وہ خود ہی زمین پر گر جائے' اور اس سے پہلے کہ آپ اس کے سینے پر سوار ہوں وہ خود ہی آپ کو اپنے سینے پر سوار ہونے کے لیے کہے۔ تو اس وقت آپ کی حالت کیا ہو گی؟ آپ شاید وہاں سے ہٹ جانے کو ترجیح دیں' اس کے علاوہ آپ کے پاس کرنے کے لیے کیا رہ جائے گا دیکھنے والے ہنسیں گے اور آپ کو کہیں گے کہ آرام اور اطمینان سے سوار ہو جاؤ! ہٹ کیوں رہے ہو؟ ایسے وقت میں کون زیادہ احمق دکھائی دے گا؟ گرے ہوئے انسان کے سینے پر بیٹھا ہوا انسان' یا آپ پر ہنسنے والا وہ انسان جس کی ہنسی زندگی بھر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گی؟

لہٰذا جب بھی کسی نے اس کو دعوتِ مبارزت دی' وہ فوراً زمین پر لیٹ کر آپ سے کہے گا کہ آؤ میرے سینے پر سوار ہو جاؤ! تم یہی خواہش لے کر آئے تھے لہٰذا آگے بڑھو' بہت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' زیادہ خلجان میں مبتلا مت ہو...... اپنے آپ کو ہیجان میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں...... بس آؤ اور میرے اوپر سوار ہو جاؤ۔

لاؤزو کہتا رہا" مگر آپ لوگ کچھ اور جاننا چاہتے ہیں آپ کو جیتنے کا گر درکار ہے' اگر جیتنے کی خواہش رکھتے ہو تو ہار جاؤ گے۔ جس کے سر میں جیتنے کا سودا سما گیا اس کی ہار یقینی ہے' اور یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ جیتنے کے خیال کے ساتھ ہی ہار شروع ہو جاتی ہے' اس لیے اس ذریعے سے کوئی میری توہین نہیں کر سکا"

اس پر اس کے ایک شاگرد نے کہا" مہربانی کر کے ہمیں اس راز سے بھی آگاہ کر دیں کیونکہ ہم بھی اپنی توہین کرانا پسند نہیں کرتے"

" تم پھر اسی غلطی کا اعادہ کر رہے ہو! میری توہین کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے کبھی کسی اعزاز کی خواہش نہیں کی' جس کے اندر شہرت کی بھوک بھری ہوئی ہے اس کی ہمیشہ توہین کی جاتی رہے گی' مجھے کبھی کہیں سے دھکے دے کر باہر نہیں نکالا گیا' کیونکہ میں ہمیشہ وہاں بیٹھا جہاں لوگ اپنے جوتے اتار کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ مجھے کبھی کسی نے اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے نہیں کہا' کیونکہ میں ہمیشہ وہاں کھڑا ہوتا تھا جہاں سے مجھے مزید پیچھے نہ دھکیلا جا سکے۔ میں سب سے آخر میں رہنا پسند کرتا تھا' اس سے میں ہر قسم کی پریشانی سے بچا رہتا تھا۔ کبھی کسی نے مجھے وہاں سے دھکے نہیں دیئے' کبھی دوسری طرف ہونے کے لیے نہیں کہا' نہ کبھی مجھ کو یہ سننا پڑا کہ دفع ہو جاؤ' کیونکہ جہاں میں ہوتا تھا وہ سب سے آخری مقام ہوتا تھا۔ اس کے بعد کوئی جگہ ہوتی ہی نہیں تھی۔ اس جگہ تک آنا کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ میں ہمیشہ اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھتا تھا' اور وہ جگہ میری جاگیر ہوتی تھی۔ جہاں میں کھڑا ہوتا تھا وہاں سے مجھے بے دخل کرنے کے لیے کبھی کوئی نہیں آیا"

حضرت عیسیٰ نے بھی کہا ہے کہ ان لوگوں پر رحمت ہو جو آخری قطار میں کھڑے ہوتے ہیں۔ "اس سے کیا مراد ہے؟" مثال کے طور پر حضرت عیسیٰ نے کہا کہ اگر کوئی تمھارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال پیش کر دو! اس کا مطلب ہے کہ: اس کو اتنی زحمت بھی نہ دو کہ آپ کا دوسرا گال اسے خود اپنی طرف کرنا پڑے۔ یہ کام خود کرو! حضرت عیسیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ جب کوئی تمھیں ہرانے کے لیے آئے تو تم فوراً ہار جاؤ' اگر وہ تم کو ایک راؤنڈ میں ہرادے تو تم دو راؤنڈ ہار جاؤ' مزید کہا کہ اگر کوئی تمھارا کوٹ چھین لے تو فوراً ہی اس کو اپنی قمیض بھی پیش کر دو۔ کس لیے؟ اس لیے کہ ممکن ہے وہ قمیض لینے میں کوئی جھجک محسوس کر رہا ہو۔ یہ بھی ان کا ہی کہنا ہے کہ اگر کوئی اپنا بوجھ ایک میل تک اٹھانے کے لیے کہے تو میل کے آخر میں اس سے معلوم کرو کہ مزید آگے لے جانا چاہے تو آپ حاضر ہیں۔

ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے؟

سب کا ایک ہی مطلب ہے کہ زندگی کے حقائق سے متعلق عدم تحفظ' ناکامی' شکست اور موت کو تسلیم کرنے کا مطلب ہے کہ ہم نے ان سب پر فتح پالی۔ دوسری صورت میں یہ تمام حقائق ہم کو موت کے سپرد کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کریں گے۔ آخری تجزیہ کے مطابق موت ہماری مکمل شکست ہے۔ بڑی سے بڑی شکست میں آپ پھر بھی بچ سکتے ہیں' شکست کھا جانے کے باوجود

آپ موجود رہتے ہیں۔مگر موت آپ کو معدوم کر دیتی ہے۔

موت سب سے بڑی شکست ہے۔اسی وجہ سے ہم اپنے دشمن کو جان سے مار دینا چاہتے ہیں......اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہیں۔موت حتمی شکست ہے' اس کے بعد دشمن کے لیے جیتنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔کبھی نہیں! ہمارے اندر یہ خواہش اسی لیے ابھرتی ہے کہ ہم اپنے دشمن کو دائمی شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں۔اس کے بعد کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ وہ کبھی کسی صورت میں فتح پا سکتا ہے...... کیونکہ اس کے بعد وہ باقی ہی نہیں رہے گا۔

موت آخری شکست ہے' اور ہم سب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہم سے دور رہے۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ جو اپنی موت سے بھاگتا رہے گا' وہ لوگوں کو قتل کرنے میں لگا رہے گا۔ جتنا وہ دوسروں کو قتل کرتا رہے گا' اتنا ہی اس کے احساسِ تحفظ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔دنیا میں دہشت گردی کی وجوہ اس سے قطعی مختلف ہیں جو عام آدمی سمجھتا ہے۔اس دہشت گردی کی وجہ یہ نہیں کہ لوگوں کے خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔وہ صاف پانی پیتے ہیں یا وہ غروبِ آفتاب کے بعد کھاتے پیتے ہیں......! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

دہشت گردی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو قتل کر کے خود اپنی موت کو بھول جانا چاہتے ہیں۔دوسروں کو مار ڈالنے کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کوئی نہیں مار سکتا کیونکہ وہ خود اپنے آپ میں مارنے کی اہلیت کو مرکوز سمجھنے لگتے ہیں۔ہٹلر' چنگیز خان اور اسی قماش کے دوسرے لوگوں نے لاکھوں لوگوں کو مار کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ "مجھے کوئی نہیں مار سکتا' میں اکیلا لاکھوں لوگوں کو مار سکتا ہوں"۔دوسروں کو مار کر ہم خود کو موت سے مبرا سمجھتے ہیں اور اس طرح اپنی آزادی کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں' اور یہ گمان پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم تو خود دوسروں کو مارتے ہیں' ہمیں کون مار سکتا ہے۔

تحت الشعور میں لوگ موت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک خطرناک آدمی اندر اندر موت سے فرار کا خواہشمند ہوتا ہے۔اور جو کوئی بھی خود کو موت سے بچانا چاہتا ہے وہ کبھی امن پسند نہیں ہو سکتا۔وہ جو واشگاف الفاظ میں یہ کہتا ہو کہ مجھے موت قبول ہے کیونکہ موت زندگی کی حقیقت ہے......وہ امن پسند ہو سکتا ہے۔موت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔اس سے بچ کر کہاں بھاگو گے؟ کہاں جاؤ گے؟

سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی غروب ہونے کا سفر شروع کر دیتا ہے۔غروبِ آفتاب بھی اتنا ہی برحق ہے جتنا طلوعِ آفتاب۔فرق صرف سمتوں کا ہے۔غروب کے وقت سورج عین اس مقام پر ہوتا ہے جہاں طلوع ہونے کے وقت۔فرق بس یہ ہے کہ طلوع کے وقت وہ مشرق میں ہوتا ہے اور غروب کے وقت مغرب میں۔ایک سمت پیدائش ہے دوسری سمت موت۔جو ایک طرف سے ابھر رہا ہے وہ دوسری طرف ڈوب رہا ہے۔طلوع و غروب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔غروب حقیقتاً طلوع میں پوشیدہ ہے۔موت بھی زندگی میں ہی پوشیدہ ہے۔ایسا کوئی راستہ نہیں کہ جو اس بات کو جانتا ہے وہ اس سے انکار کر سکے۔پھر ہر بات اس کے لیے قابلِ تسلیم ہے' وہ اس سچائی میں زندہ ہے' اس سے واقف ہے' اس کو دیکھتا ہے' اور اس کا اعتراف کرتا ہے۔

اسی تصدیق کے ساتھ تبدیلی وابستہ ہے۔جب میں کہتا ہوں "موت پر فتح پاؤ" تو میرا مطلب ہوتا ہے کہ جیسے ہی کوئی موت کو جان لیتا ہے اس کو مضحکہ خیز ہنسی آجاتی ہے کیونکہ وہ جان لیتا ہے کہ موت کا کوئی وجود نہیں۔صرف بیرونی قشر بنتا بگڑتا رہتا ہے۔سمند ہمیشہ سے ہے؛ یہ صرف لہریں ہیں جو اس میں سے اٹھ کر فنا کر دی جاتی ہیں۔حسن ہمیشہ سے اطراف میں موجود رہتا ہے فقط پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔روشنی ہمیشہ سے چمکتی رہی ہے......سورج طلوع و غروب ہوتا رہا ہے۔اور جو کچھ اس کے طلوع و غروب کے دوران چمکتا رہا ہے' اس کا وجود ہمیشہ سے ہے۔سورج کے طلوع سے پہلے بھی اور اس کے غروب ہو جانے کے بعد بھی۔اس حقیقت کا ادراک بھی ہمیں تب ہی ہو گا جب ہمارا موت سے سامنا ہو گا۔جب ہم موت کا عکس دیکھ پائیں گے۔جب ہم موت کے حملے کا منہ در منہ مقابلہ کریں گے......اس سے پیشتر نہیں۔

سو ہمارا دوست پوچھتا ہے:"ہم موت کے بارے میں کیوں سوچیں؟ اس کو فراموش کیوں نہ کر دیں؟" اگر میں سکے کا دوسرا رخ سامنے رکھوں تو یقیناً اس کے پہلے رخ سے محروم ہو جاؤں گا۔کیوں کہ دونوں مل کر ہی سکہ مکمل کرتے ہیں' اس لیے ممکن نہیں کہ اس کا ایک رخ محفوظ کر کے دوسرا رخ گلی میں پھینک دیا جائے۔یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ سکے کا ایک رخ اپنے پاس رکھنے سے دوسرا خود بخود میرے پاس رہے گا۔اگر اس کا ایک رخ پھینکوں گا تو دوسرا بھی خود بخود اس کے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ایک کو پھینکوں گا تو دوسرا ساتھ جائے گا' ایک کو اپنے پاس رکھوں گا تو

دوسرا بھی میرے پاس رہے گا۔ فی الواقعہ وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ موت و حیات بھی ایک ہی زندگی کے دو رخ ہیں۔ جس دن کسی کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی اس دن نہ صرف موت کا دھڑکا ختم ہو جائے گا بلکہ لافانیت کا خیال بھی دل سے نکل جائے گا۔ پھر وہ جان لے گا کہ اگر زندگی ہے تو موت بھی ضرور آئے گی۔ دونوں ہی باعثِ مسرت ہیں۔

ہم روزانہ صبح اٹھ کر کام کے لیے نکل جاتے ہیں۔ کوئی جا کر کھڈے کھودتا ہے' کوئی کچھ اور کرتا ہے' مختلف لوگ مختلف کام کرتے ہیں...... پورے دن پسینہ بہاتے ہیں۔ صبح اٹھنے میں بھی مسرت ہے' مگر کیا رات کو سونا بھی اسی درجے پر مسرت آمیز نہیں ہے؟ اگر کچھ پاگل' لوگوں کو رات میں سونے کے خلاف کر دیں تو کیا صبح اٹھنا مشکل نہیں ہو جائے گا؟ کیونکہ جب ایک آدمی رات کو سوئے گا نہیں تو صبح اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ زندگی پر ایک جمود طاری ہو جائے گا۔ رات میں بستر پر جانے کا خیال کسی کو اس لیے خوفزدہ کر سکتا ہے کہ کہیں وہ صبح اٹھنے کے مسرت آگیں لطف سے محروم نہ رہ جائے' اس لیے وہ نہ سونا ہی بہتر سمجھتا ہے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ یہ قابلِ عمل نہیں ہے کیونکہ سونے کا ہی دوسرا سرا جاگنا ہے۔

جو ٹھیک سے سو پائے گا وہ ٹھیک طرح سے اٹھ بھی سکے گا۔ جو ٹھیک سے اٹھے گا وہی ٹھیک سے سو بھی سکے گا۔ جو بہتر طریقے پر زندگی گذارے گا وہ بہتر طریقے پر فنا ہو سکے گا۔ جو ٹھیک طرح مرے گا وہ اپنی آئندہ زندگی میں صحیح اقدامات کر سکے گا۔ جو بہتر طریقے پر موت سے ہم کنار نہیں ہو گا وہ اچھی زندگی نہیں گذار سکے گا۔ جو اچھی زندگی نہیں گذار سکے گا اس کو اچھی موت بھی نصیب نہیں ہو گی۔ وہ کچرے کا انبار ہو جائے گا' ہر چیز بدنما اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی۔ اس کا سبب موت کا خوف ہو گا۔

اگر کسی پر نیند کا خوف غالب آ جائے تو زندگی دشوار ہو جائے گی۔ ایک بوڑھی عورت کو اس کا بیٹا میرے پاس لایا' اس نے کہا کہ میری ماں کے اوپر نیند کا خوف طاری ہو گیا ہے۔

میں نے اس سے معلوم کیا کہ یہ کیسے ہوا؟ اس نے کہا "یہ کافی عرصے سے بیمار ہیں اور ڈرتی ہیں کہ نیند کے دوران یہ مر جائیں گی' اس لیے یہ سونے کے خیال سے ہی ڈرنے لگی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ایک بار یہ سو گئیں تو دوبارہ نہیں اٹھ سکیں گی۔ اس لیے تمام رات جاگنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ہم بڑی مشکل میں ہیں' راتوں کو جاگتے رہنے کی وجہ سے ان کی بیماری بھی

دور نہیں ہو رہی۔ خدشہ ہے کہ یہ جاگنے کے لیے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔ برائے مہربانی ان کے دل سے یہ خوف دور کریں' میں سخت مشکل میں ہوں"۔

ایک طرح سے سونے کا مطلب ہے روزانہ مرنا۔ پورے دن ہم زندہ رہتے ہیں' رات کو مر جاتے ہیں۔ گویا ہم قسطوں میں مرتے رہتے ہیں' تھوڑا تھوڑا روزانہ۔ رات کے دوران ہم اپنے اندر غوطہ زن ہوتے ہیں اور صبح تازہ دم ہو کر باہر نکل آتے ہیں۔ جب ہم کم و بیش ستر اسی سال کے ہو جاتے ہیں تو ہمارا جسم لاغر ہو جاتا ہے...... پھر موت اس پر قابو پا لیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جسم مکمل تبدیلی سے گذرتا ہے۔ مگر ہم موت سے بہت ڈرتے ہیں' حالانکہ وہ ایک گہری نیند کے سوا کچھ اور نہیں۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ رات کے دوران جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور صبح تک وہ دوسری حالت میں آ جاتا ہے۔ یہ تبدیلیاں اتنی معمولی ہوتی ہیں کہ ہم کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ تبدیلی مکمل بھی نہیں ہوتی...... بہت خفیف سا فرق رونما ہوتا ہے۔ جب رات کو آپ تھکے ماندے' بستر پر جائیں' اس وقت آپ کا جسم مختلف کیفیت میں ہوتا ہے' اور جب صبح سو کر اٹھتے ہیں تو یہ کسی اور کیفیت میں ہوتا ہے۔ صبح کے وقت جسم تازہ دم محسوس ہوتا ہے۔ توانائی سے بھرپور' پورے دن کی مصروفیات سے نمٹنے کے لیے تیار۔ اب آپ دوبارہ نئے نغمے گا سکتے ہیں...... کچھ ایسے کام بھی کر سکتے ہیں جو پچھلی رات تھکن' درماندگی' اور بے سکونی کی وجہ سے آپ نہیں کر سکے۔ لیکن کسی لمحے بھی آپ کے دل میں یہ خیال نہیں گذرا کہ آپ موت سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟

جب آپ صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو خوش و خرم ہوتے ہیں' کیونکہ آپ کے جسم کا کوئی مخصوص حصہ کسی قسم کی تبدیلی سے دوچار ہوتا ہے'...... لیکن موت؟ یہ مکمل تبدیلی کا باعث ہوتی ہے۔ پورا جسم ناقابلِ استعمال ہو چکا ہوتا ہے اس لیے نیا جسم حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر چونکہ ہم موت سے ڈرتے ہیں اس لیے ہماری پوری زندگی معذور ہو جاتی ہے۔ ہر لمحے موت کا خوف طاری رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم نے ایسی زندگی' معاشرہ اور خاندان بنا لیا ہے جس میں زندگی کا مزا کم سے کم اور موت کا خوف زیادہ سے زیادہ ہے۔ اور جس کو موت کا ڈر ہے وہ جی نہیں سکتا...... دو مختلف کیفیات ایک ساتھ جاری نہیں رہ سکتیں۔ جو شخص کسی خارجی دباؤ

کے بغیر موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہو' صرف وہی زندگی کا حقدار بھی ہے۔ موت وحیات ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ اسی بنا پر میں کہتا ہوں " موت کی طرف دیکھو! میں موت کے بارے میں سوچنے کے لیے نہیں کہتا' اس سوچ کے ذریعے آپ گمراہ ہو سکتے ہیں۔ موت کے بارے میں سوچ کر آپ کیا کر لیں گے؟

بیمار ذہنیت کا حامل کوئی شخص یہ سوچ کر مطمئن ہو سکتا ہے کہ ہر چیز کا انجام موت ہے۔ اس شخص کے لیے یہ سوچ اس لیے باعثِ طمانیت نہیں کہ یہ حقیقت ہے۔ ذہن میں رکھیے کہ ایسی کسی بات پر یقین نہیں کر لینا چاہئے کہ جو کچھ اطمینان بخش ہے وہ اصل میں بھی درست ہے۔ کیونکہ جو کچھ خوش کن دکھائی دیتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سچ بھی ہو۔ جو آپ کو آسان لگے وہ صحیح ہے۔ ایک ایسا شخص جو تکلیف میں مبتلا ہے' مسائل میں گھرا ہوا ہے' بیمار ہے اس کی خواہش ہوگی کہ اسے موت آ جائے' اور کچھ بھی باقی نہ رہے۔ کیونکہ اس کا کوئی حصہ اگر باقی رہ جائے گا' تو اس کا یقینی مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود بھی بچ جائے گا...... وہ! جو بیمار ہے' پریشان ہے' تکلیف میں ہے۔

ایک دوست کو تشویش ہے کہ: کچھ لوگ خودکشی کر لیتے ہیں...... ان لوگوں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ لوگ موت سے نہیں ڈرتے؟

وہ بھی یقیناً موت سے ڈرتے ہیں' مگر وہ موت کے مقابلے میں زندگی سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ ان کو زندگی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے اس لیے وہ اس کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ زندگی ختم کرنے سے انھیں موت میں کوئی سرور نہیں ملتا' مگر کیونکہ ان کو زندگی موت سے بھی بدتر دکھائی دیتی ہے اس لیے وہ موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو شخص تکلیف میں گذار رہا ہو' بخوبی جانتا ہے کہ موت ہر چیز سے نجات دلا دیتی ہے...... روح سے بھی...... موت کے بعد کچھ نہیں بچتا۔ وہ اپنی کوئی چیز باقی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیونکہ اگر کچھ بچانا چاہے گا تو وہ صرف اس کی پریشانیاں اور دکھ درد ہوں گے۔

جو شخص موت سے ڈرتا ہے اور خود کو اس سے بچانا چاہتا ہے اس کو روح کے لافانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی ذاتی سہولتیں ہیں۔ ان میں سمجھداری کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ اس قسم کے عقائد آسان محسوس ہوتے ہیں' اور بس! یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے عقائد اکثر

تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ایک انسان جو اپنی جوانی کے دور میں کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتا' اپنے بڑھاپے میں مذہب پرست ہو جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عقائد سر کے درد کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔

جب ہمارے سر میں کوئی سودا نہیں ہوتا تو ہمارے عقائد کسی اور نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اور سر درد کے ساتھ یہ کسی اور نوع سے بدل جاتے ہیں۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ مقدس تحریروں کا اثر آپ کے عقائد پر کتنا ہوتا ہے اور جگر پر کتنا؟ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے عقائد گردے کے مرہونِ منت ہیں یا آپ کے جگر کے۔ انسان کے جسم کے اندر جو کچھ ہوتا رہتا ہے اس کے اثرات بہرحال سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ جب معدہ خراب ہوتا ہے تو انسان کو خدا کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ اور جب معدہ ٹھیک کام کر رہا ہو تو انسان خدا پر یقین کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کے سر میں درد ہو تو وہ خدا کو کیسے مان سکتا ہے؟ اگر خدا بھی موجود ہے اور سر کا درد بھی تو دونوں کا مقامِ اتصال کیا ہے؟

ہم ایک تجربہ کر سکتے ہیں۔ پچاس آدمی لیں اور ان کو لمبی بیماری میں مبتلا کر دیں۔ اور دوسرے پچاس منتخب کر کے ان کو صحتمند رکھیں۔ پہلے والے پچاس کو تکلیف دہ ماحول میں رکھیں اور دوسرے پچاس کے گروپ کو بہترین حالات میں۔ آپ دیکھیں گے کہ پہلے پچاس کا جھکاؤ لامذہبیت کی طرف ہو جائے گا' اور دوسرے گروپ کے لوگ خدا کے قائل ہو جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کے وجود کا قائل ہونا خوشیاں لاتا ہے؛ اور ایک بیمار ذہن لازمی خدا کا منکر ہو جائے گا۔ لہٰذا یاد رکھئے کہ جب آپ دنیا میں لامذہبیت کا دور دورہ دیکھیں تو یقین کر لیں کہ تکالیف بھی دوچند ہو جائیں گی۔ اگر آپ کو بڑی تعداد میں لوگوں کا جھکاؤ خدا کی ذات کی طرف ہوتا دکھائی دے تو آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خوش اور مطمئن دیکھیں گے۔

میں کہہ رہا ہوں کہ آئندہ پچاس برسوں میں اس بات کے واضح امکانات موجود ہیں کہ روس میں خدا پرستوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے اور انڈیا میں لامذہبیت میں اضافہ ہو جائے عقائد کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ روس میں لوگ مارکس کو پڑھتے ہیں...... انڈیا میں مہاویر کو...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مہاویر اور مارکس کے نظریات سے رتی بھر فرق نہیں پڑتا۔ اگر لوگ روس میں زیادہ مطمئن ہوتے چلے جائیں تو آئندہ پچاس برسوں میں خدا پرستی کا چلن عام ہو جائے گا اور

وہاں کے گرجاؤں میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو جائیں گی۔ دیے جلنے لگیں گے اور دعائیں مانگی جائیں گی۔ صرف مطمئن ذہن ہی گرجا میں گھنٹیاں بجاتے ہیں' دیے جلاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ لوگ خدا کا شکر ادا کرنے لگیں گے۔ صرف مطمئن انسان ہی کسی کا شکر ادا کرتے ہیں' اور شکر آخر کس کا ادا کریں گے؟ .... کیونکہ انسان کو اپنے اندر کی خوشی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ...... اس لیے وہ شکر بھی کسی نامعلوم کا ہی ادا کرتا ہے۔ اس کی بس ایک یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

ایک ناآسودہ ذہن اپنے غصے کا اظہار چاہتا ہے۔ لیکن جب اس کے پاس سے ناآسودگی رخصت ہو جائے تو وہ اپنے غصے کا اظہار کس پر کرے گا؟ اس صورت میں وہ اپنے مزاج کی کڑواہٹ اسی نامعلوم کی طرف منعطف کرے گا۔ اور کہے گا کہ یہ سب الابلا اسی کے سبب سے ہے' خدا ہی اس کا ذمہ دار ہے۔ یا تو وہ موجود نہیں ہے یا پھر انصاف سے کام نہیں لے رہا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری مذہبیت' ہماری لامذہبیت' ہمارے عقائد کا انحصار ہمارے حالات اور آسائشات کے تابع ہیں۔

وہ جو موت سے فرار چاہتے ہیں وہ بھی ضرور کسی نہ کسی عقیدے پر کاربند ہونگے۔ اور وہ جو مرنے کی خواہش رکھتے ہیں ان کا اپنا بھی کوئی نہ کوئی عقیدہ ضرور ہو گا۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی موت کو جاننے کے لیے متجسس نہیں۔ سہولت اور حقیقت میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ سہولت کے بارے میں کبھی زیادہ غور و فکر نہیں کرنا چاہئے۔ خیالات ہمیشہ سہولیات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ تصور ہمیشہ سچائی کی عکاسی کرتا ہے' خیال ہمیشہ آسانی تلاش کرتا ہے۔

ایک شخص کمیونسٹ ہے...... وہ ہمیشہ انقلاب کے نعرے لگاتا ہے' غریب کو اب غریب نہیں رکھا جا سکتا...... جائیدادیں تقسیم ہونی چاہئیں...... وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ یہ کریں کہ اس کو ایک کار اور ایک بڑا سا بنگلہ دے دیں' ایک خوبصورت لڑکی سے اس کی شادی کر دیں' پھر صرف پندرہ دن میں آپ کو ایک بالکل منحرف کمیونسٹ نظر آنے لگے گا۔ پھر آپ اس کو کہتے ہوئے سنیں گے: " کمیونزم وغیرہ سب بکواس ہے" اب اس آدمی کو کیا ہوا؟ اس کی سہولیات نے اس کے خیالات میں انقلاب برپا کر دیا۔

ایک دن پہلے تک اس کا خیال تھا کہ جائیدادیں تقسیم ہونی چاہئیں' اب جائیداد کی تقسیم اس کے خیال میں غلط ہے۔ کیونکہ اب جائیداد کی تقسیم کی زد میں اس کی کار اور اس کا بنگلہ بھی

آ جائے گا۔

ایک ایسا شخص جس کو ایک خوبصورت عورت حاصل نہیں ہے وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ خواتین پر بھی مساوات کے اصولوں کا اطلاق ہونا چاہئے' خوبصورت عورتوں پر کچھ مخصوص لوگوں کا اجارہ کیوں؟ خواتین پر سب کا حق ہونا چاہئے۔ بہت سے لوگ اس طرح بھی سوچتے ہیں۔ اسی دھرتی پر ایسے لوگ موجود ہیں جن کا منصوبہ ہے " آج جائیداد...... کل عورت " اور اس میں غلط بھی کیا ہے؟ کیونکہ آج تک بھی آپ لوگ عورت کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں جیسے وہ آپ کی جاگیر ہے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے " یہ غلط ہے کہ ایک آدمی تو بہت بڑے گھر میں رہے اور ایک جھگی میں " پھر آپ فیصلہ کیجیے کہ اس مطالبے میں کیا حرج ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک خوبصورت عورت کیوں ہے اور ایک کے پاس کیوں نہیں؟ یہ خطرے کی گھنٹی ہے' جلد یا بدیر اس قسم کے سوالات ضرور سامنے آئیں گے۔ جب بھی جائیداد کی تقسیم عمل میں آئے گی' اس روز عورت نیں حصہ داری کا مطالبہ بھی کیا جائے گا۔ لیکن جس شخص کے پاس ایک خوبصورت عورت ہو گی وہ یقیناً اس مطالبے کی مزاحمت کرے گا۔ وہ کہے گا " یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کیا خرافات بک رہے ہیں؟ یہ سب غلط ہے "

لہٰذا ہماری سہولتیں ہمارے خیالات کی تشکیل کرتی ہیں' ہمارے خیالات ہماری سہولیات سے جنم لیتے ہیں۔ ہمارے تمام خیالات یا تو ہماری سہولیات میں اضافہ کرتے ہیں یا ہماری پریشانیوں کے خاتمے کا باعث بنتے ہیں۔ اور تصور ایک بالکل علیحدہ چیز ہے۔ تصور کا آسانیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا یاد رکھنا چاہئے کہ حالات کی حقیقی تصویر دیکھنے کے لیے تصور اپنی ذات سے ایک بہت گہرا معاہدہ ہے۔ جس میں آسانیوں اور سہولیات سے کوئی غرض نہیں ہوتی اس کے بجائے صرف یہ جانا جاتا ہے کہ کیا ہے اور کہاں ہے؟

اس لیے موت کی حقیقت کو بھی دیکھنا چاہئے' اس کے بارے سوچنا یا خیالات میں ڈوب جانا فضول ہے۔ کیونکہ سوچنے والا صرف اپنی آسانیاں پیش نظر رکھے گا' انسان کے خیالات اس کی آسانیوں کے پس منظر سے ابھرتے ہیں۔ اور یہ آسانیوں اور سہولیات کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں تو موت کو جاننا ہے' یہ دیکھنا ہے کہ یہ ہے کیا؟ کسی کی آسانیوں اور مشکلات کا اس سے کوئی

تعلق نہیں۔ جو کچھ حقیقت ہے وہی زیرِ غور ہے۔ جیسے ہی آپ کو اس کی حقیقت کا ادراک ہوگا آپ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا۔ کیونکہ موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جس لمحے آپ کو موت کا ادراک ہوگا' آپ تسلیم کر لیں گے کہ موت نہیں ہے۔ آپ اس کے وجود کے اسی وقت تک قائل رہیں گے جب تک آپ اس کو جان نہیں لیں گے۔ عدم واقفیت کا تجربہ ہی موت ہے؛ شعور و آگہی کا تجربہ لافانیت ہے۔

ابھی کچھ اور سوالات ہیں جن کے بارے میں ہم رات کی نشست میں گفتگو کریں گے۔ اب ہم صبح کے استغراق میں بیٹھیں گے۔ کامل توجہ بھی موت کے مترادف ہے۔ کامل توجہ سے مراد ہے " کیا ہے؟ اور ہم کہاں ہیں؟" لہٰذا ہم استغراق میں اسی وقت پہنچ سکتے ہیں جب ہم خود کو فنا کرنے کے لیے آمادہ ہوں! بصورتِ دیگر نہیں۔

ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بیٹھ جائیں۔ اپنے چاروں اطراف تھوڑی جگہ خالی رکھیں! جو دوست لیٹنا چاہیں وہ بلا تاخیر لیٹ جائیں۔ اور جو مشق کے دوران اسکی ضرورت محسوس کریں وہ اس وقت بھی لیٹ سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر بیٹھیں تا کہ نہ آپ کسی وقت دوسرے پر گریں نہ کوئی دوسرا آپ پر گر سکے۔

اب آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کو سکون دے کر پلکیں بند کر لیں ...... اپنے بدن کو پر سکون کر لیں' اپنے جسم کو سکون میں آنے دیں ...... اپنے جسم کو سکون میں آنے دیں ...... اپنے جسم کو بالکل آزاد چھوڑ دیں گویا اس میں جان نہیں ہے۔ ایک دن زندگی آپ سے رخصت ہو جائے گی۔ لہٰذا آج ہی ایسا محسوس کریں کہ آپ نے خود اسے رخصت کر دیا ہے۔ ایک دن یقیناً زندگی آپ سے مکمل طور پر رخصت ہو جائے گی' اگر آپ اس کو روکنا چاہیں گے تب بھی یہ نہیں رکے گی۔ اس لیے زندگی کو کہیں بہت اندر دھکیل دیں ...... زندگی سے کہیں کہ وہ اندرون میں واپس چلی جائے اور جسم کو مکمل طور پر بے حس کر دیں۔

جسم کو بتدریج سکون بخشتے جایئے۔ اب میں آپ کو کچھ ترغیبات دوں گا میرے ساتھ آپ بھی ان کو محسوس کیجیے۔ جسم سکون میں آ رہا ہے ...... اس کو محسوس کیجیے۔ جسم سکون میں آ رہا ہے ...... جسم سکون میں آ رہا ہے ...... اس کو ڈھیلا چھوڑتے جایئے اور محسوس کیجئے کہ جسم سکون میں آ رہا ہے۔ جسم سکون میں آ رہا ہے ...... جسم سکون میں آ رہا ہے ...... جسم بتدریج سکون میں آ رہا

ہے ...... گویا موت سے ہم آغوش ہو رہا ہے ...... موت سے ہم آغوش ہو رہا ہے۔ ہم اپنے اندر غوطہ لگا رہے ہیں ...... وہاں جہاں زندگی بنفسِ نفیس موجود ہے۔ جانے دیں ...... جانے دیں ...... لہر کو جانے دیں ...... خود سمندر کے ساتھ رہیں۔ جسم کو مکمل طور پر اپنے اختیار سے آزاد کر دیں۔ اگر یہ گرتا ہے تو گر جانے دیں۔ اس کی طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ اس کو روکیں مت۔ اس پر قابو پانے کی کوئی کوشش نہ کریں ...... گرنے دیں۔

جسم سکون محسوس کر رہا ہے ...... جسم سکون محسوس کر رہا ہے ...... جسم سکون محسوس کر رہا ہے ...... جسم سکون محسوس کر رہا ہے ...... جسم بتدریج پر سکون ہوتا جا رہا ہے۔ جسم سکون محسوس کر رہا ہے ...... جسم سکون محسوس کر رہا ہے ...... گرنے دیں۔ جیسے مر چکا ہو۔ ایسے جیسے کہ مکمل طور پر بے جان ہو چکا ہے۔ ہم اپنے اندر پھسل گئے ہیں۔ ہمارا شعور مکمل طور پر اندر متوجہ ہے۔ جسم ایک چھلکے کے مانند ہو چکا ہے۔ اگر یہ گرتا ہے' گرنے دیں۔ جسم سکون میں ہے۔ جسم سکون میں ہے۔ جسم مکمل سکون میں ہے۔

تنفس پر سکون ہو رہا ہے ...... تنفس پر سکون ہو رہا ہے ...... تنفس کو بھی پر سکون ہونے دیں ...... تنفس بتدریج پر سکون ہو رہا ہے۔ تنفس پر سکون ہو رہا ہے ...... سانسوں کی طرف سے بھی بے نیاز ہو جایئے۔ اپنی سانسوں سے توانائی واپس لے لیں۔ تنفس مسلسل پر سکون ہو رہا ہے ...... تنفس پر سکون ہو رہا ہے ...... تنفس پر سکون ہو رہا ہے ...... تنفس پر سکون ہو رہا ہے ...... تنفس پر سکون ہو رہا ہے ...... پر سکون ہو رہا ہے ...... اس کو سکون میں رہنے دیں ...... تنفس کو پر سکون رہنے دیں ...... تنفس پُرسکون ہوتا ہی جا رہا ہے۔ تنفس پر سکون ہوتا جا رہا ہے۔ تنفس پر سکوت چھا گیا ......

خیالات کو بھی فراموش کر دیں۔ ان سے بھی بے فکر ہو جائیں! ان سے بالکل بے فکر ہو جائیں۔ خیالات ساکت ہو رہے ہیں' خیالات ساکت ہو رہے ہیں' محسوس بھی کرتے رہیں۔ خیالات ساکت ہو رہے ہیں۔ خیالات سکوت اختیار کر رہے ہیں۔ خیالات سکوت میں ڈوبتے جا رہے ہیں' خیالات پر خاموشی طاری ہو رہی ہے۔ آپ کچھ اور پیچھے جا رہے ہیں ...... آپ مزید پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ پیچھے جا چکے ہیں۔ خیالات پر سکوت چھا گیا ہے۔

اب دس منٹ کے لیے اپنے وجود کے اندر جاگے رہیں' شعور کی آنکھ سے اندر کا معائنہ کرتے رہیں' مشاہدہ کے دوران بیدار رہیں۔ خارج میں موت واقع ہو چکی ہے ...... جسم بے حس و

حرکت پڑا ہوا ہے۔ تقریباً مردہ حالت میں ...... ایک فاصلے پر...... ہم خود کہیں بہت پیچھے رہ گئے ہیں ...... شعور کا دیا روشن ہے ...... آپ صرف علم ہیں ...... مشاہدہ ہیں۔ صرف دیکھتے رہئے۔ دیکھنے میں محو رہیں۔ دس منٹ کے لیے صرف اپنے اندر دیکھتے رہئے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ کریں۔ صرف دیکھتے رہئے ...... اندر ...... اور اندر ...... اندر ہی دیکھتے رہئے ...... آہستہ آہستہ آپ بہت گہرائی میں چلے جائیں گے۔ جیسے آپ بہت گہرے کنویں میں گرتے چلے جا رہے ہیں گرتے ہی جا رہے ہیں ...... گرتے ہی جا رہے ہیں۔ دیکھتے رہئے ...... دس منٹ تک صرف دیکھتے رہئے۔

گہری خاموشی چھا جاتی ہے ...... چند منٹ بعد اوشو پھر اپنی ترغیبات شروع کرتا ہے۔

اپنا اختیار بالکل ختم کر دیں ...... اور اپنے اندر مزید اتر جائیں ...... اندر ...... اور اندر۔ آپ کا ذہن خاموشی میں ڈوب جائے گا۔

ذہن خالی ہو رہا ہے ...... ذہن خالی ہو رہا ہے ...... مکمل خالی ہو جانے دیں ...... لاپتہ ہو جائیں ...... فنا ہو جائیں ...... بیرونی دنیا سے بالکل لاتعلق ہو جائیں ...... باہر سے بالکل کٹ جائیں ...... جس طرح ایک لہر فنا ہو کر سمندر میں مل جاتی ہے ...... قطعی طور پر بے تعلق ہو جائیں۔ اپنا اختیار بالکل موقوف کر دیں۔ ذہن خالی ہو رہا ہے۔ ذہن خالی ہو رہا ہے۔ ذہن خالی ہو رہا ہے۔

ذہن بالکل خالی ہو چکا ہے ...... ذہن خالی ہو چکا ہے ...... ذہن خالی ہو چکا ہے۔ صرف ایک چراغ جل رہا ہے ...... آگہی کا چراغ۔ مشاہدہ کا چراغ۔ اس کے علاوہ ہر چیز پر جیسے موت طاری ہو گئی ہے۔ جسم علیحدہ پڑا ہوا دکھائی دے گا ...... آپ کا اپنا جسم آپ کو فاصلے پر پڑا ہوا دکھائی دے گا۔ آپ کا اپنا تنفس آپ کو دور محسوس ہوگا۔ اندر ...... بہت اندر ...... گہرائی میں ڈوب جائیں ...... مکمل طور پر غرق ہو جائیں ...... اپنا ہر اختیار ترک کر دیں ...... گم ہو جائیں .... گم ہو جائیں ...... مکمل طور پر گم ہو جائیں!

ہر چیز کو فراموش کر دیں ...... اگر آپ کا جسم گرتا ہے تو گر جانے دیں ...... ہر چیز سے بے نیاز ہو جائیں ...... فنا ہو جائیں ...... مکمل طور پر فنا ہو جائیں۔ ذہن معدوم ہو چکا ہے۔ ذہن معدوم ہو چکا ہے۔ آپ کے اندر صرف آگہی کا ایک روشن چراغ باقی رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز فنا ہو چکی ہے۔ ہر چیز معدوم ہو چکی ہے۔

جانے دیں ...... ہر چیز کو جانے دیں ...... مر جانے کی ہمت کا مظاہرہ کریں۔ باہر سے

بالکل بے تعلق ہو جائیں۔ آپ کا جسم بے جان ہو چکا ہے۔ ہم پوری طرح اپنے اندر کی دنیا میں اتر چکے ہیں۔ ہم پوری طرح پنے اندر کی دنیا میں اتر چکے ہیں۔ دل کے نزدیک ایک دیا سا جل رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں ...... ہم جان رہے ہیں ...... اس کے علاوہ کوئی چیز سامنے نہیں ہے۔ ہم ایک شاہد کی حیثیت میں باقی ہیں۔ ذہن بالکل معدوم ہو چکا ہے۔

اس خلا کے اندر کامل توجہ سے دیکھیں ...... خلا کے اندر ...... اس بے وجودی کا نظارہ کریں۔ اس بے وجودی کے اندر سے مسرت کا ایک لامتناہی منظر جنم لے گا۔ مسرت کی ایک لازوال روشنی اس خلا کو پوری طرح بھر دے گی۔ مسرت کی یہ روشنی آبشار کی صورت آپ کے چہار جانب احاطہ کر لے گی۔ آپ کے رگ و ریشے میں' آپ کے روئیں روئیں میں ...... اس خلا کے اندر بھرپور توجہ سے دیکھیں۔ جیسے سورج نکلنے پر پھول کھل اٹھتا ہے' اسی طرح اس خلا کے اندر جھانکنے سے مسرتوں کی بہار پھوٹ پڑے گی۔ صرف یہ بہار چاروں طرف جلوہ افروز ہوگی۔ دیکھیں۔ اندر دیکھتے رہیں ...... اس بہار کو پھوٹ نکلنے دیں ...... صرف اندر دیکھیں ...... جیسے مسرتوں کا چشمہ کھل گیا ہے اور مسرت نے پوری فضا کو گھیر لیا ہے۔

اب آہستہ آہستہ چند گہرے سانس لیں ...... سانس کہیں بہت دور محسوس ہوگا۔ آہستہ سے ایک گہرا سانس لیں ...... اور اس کو بغور دیکھتے رہیں۔ ذہن مزید خاموش ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ چند سانسیں اور لیجیے! ذہن مزید خاموش ہو جائے گا۔ اب آہستہ سے آنکھیں کھول دیجیے۔ آہستہ سے آنکھیں کھول کر استغراق سے باہر آ جائیں! وہ جو لیٹے ہوئے ہیں یا جو دورانِ استغراق دراز ہو گئے ہیں' وہ بھی ایک گہری سانس لیں اور اپنی آنکھیں کھول دیں ...... اور نہایت آہستگی کے ساتھ اٹھ بیٹھیں۔

☆

ساتواں باب

موت......ذریعۂ حیات

ایک دوست کا سوال ہے:

کیا آپ لوگوں کو مرنا سکھا رہے ہیں؟ موت کی تشریح کر رہے ہیں؟ اس کے بجائے آپ کو زندگی کی تعلیم دینی چاہئے۔

اس کا سوال بجا ہے۔ یقیناً میں لوگوں کو بتا رہا ہوں کہ کیسے مرنا ہے! میں مرنے کا فن سکھا رہا ہوں' کیونکہ جس کو مرنے کا فن آتا ہے اس کے لیے جینا بیحد آسان ہے۔ جو مرنے کے لیے تیار ہے وہ اعلیٰ ترین زندگی گذارنے کا اہل ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے خود کو مٹا دینا سیکھ لیا ہے' ان کو معلوم ہے کہ کیسے؟

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد دکھائی دیں گی کیونکہ ہم نے مرنے اور جینے کو ہمیشہ ایک دوسرے کی ضد جانا ہے۔ جبکہ وہ ہیں نہیں۔ ہم نے دونوں کے مابین ایک مصنوعی تضاد قائم کیا ہوا ہے' جس کے مہلک نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ انسانیت کو اس تضاد سے زیادہ کسی اور چیز نے نقصان نہیں پہنچایا اور اس کے اثرات ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہوئے ہیں۔ اگر ہم فطری طور پر مکمل وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیں......نہ صرف ٹکڑوں میں بلکہ ایک دوسرے سے متصادم ٹکڑوں میں......اس کا لازمی نتیجہ سوائے مخبوط الحواسی اور پاگل پن کے کچھ اور برآمد نہیں ہوگا۔

ہم ایک ایسی جگہ کا تصور کرتے ہیں جہاں مخبوط الحواس لوگ رہتے ہیں۔ اگر وہ لوگ اس بات کو گرہ میں باندھ لیں کہ سرد اور گرم نہ صرف دو علیحدہ چیزیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے متضاد بھی......ایک سادہ سی وجہ کی بنیاد پر وہ متضاد نہیں ہیں کیونکہ وہ دونوں ایک ہی بات ثابت

کرنے کے لیے مختلف درجات سے گذر رہے ہیں۔ ہمارا گرم اور سرد کا تجربہ گو حتمی نہیں' لیکن حقیقت سے نزدیک تر ضرور ہے: ایک چھوٹے تجربے کے ذریعے بات صاف ہو جائے گی۔

ہم کو ہمیشہ ایسی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے جو گرم ہیں' اور ایسی چیزوں سے بھی جو ٹھنڈی ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جو چیزیں ٹھنڈی ہیں وہ ٹھنڈی ہیں......اور جو چیزیں گرم ہیں وہ گرم ہیں......ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ کوئی چیز بیک وقت ٹھنڈی بھی اور گرم بھی ہو سکتی ہے۔ آپ ایک چھوٹا سا تجربہ کریں: ایک برتن میں گرم' ایک میں ٹھنڈا اور ایک میں کمرے کے درجۂ حرارت کے مطابق پانی لیں۔ اپنا ایک ہاتھ ٹھنڈے پانی کے برتن میں ڈالیں اور ایک گرم پانی کے برتن میں' اب دونوں ہاتھ نکال کر کمرے کے درجۂ حرارت والے پانی میں ڈالیں۔ آپ کے ایک ہاتھ کو وہ پانی گرم محسوس ہوگا اور دوسرے ہاتھ کو وہی پانی ٹھنڈا محسوس ہوگا۔ کیا وہ پانی گرم اور ٹھنڈا ہے؟ آپ کا ایک ہاتھ کہہ رہا ہے کہ وہ ٹھنڈا ہے اور دوسرے ہاتھ کا کہنا ہے کہ وہ گرم ہے۔ لہٰذا بتایئے کہ پانی کی اپنی فطرت کیا ہے؟ جب ایک ہی وقت میں ایک ہاتھ اسکو ٹھنڈا اور عین اسی وقت دوسرا ہاتھ اس کو گرم بتا رہا ہے؟ تو ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پانی اپنی اصل میں نہ گرم ہے اور نہ سرد۔ اس کے گرم یا ٹھنڈا ہونے کا تعلق ہمارے ہاتھ سے وابستہ ہے۔

حرارت یا خنکی اسی ایک چیز کے درجات ہیں......وہ ہرگز دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ ان دونوں کے مابین صرف مقدار کا فرق ہے صفات کا نہیں۔

کبھی آپ نے بچپن اور بڑھاپے کی عمروں کے فرق پر غور کیا ہے؟ عموماً ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضد خیال کرتے ہیں۔ بچپن کو ایک طرف رکھتے ہیں اور بڑھاپے کو دوسری طرف' لیکن دونوں کے مابین اصل فرق کیا ہے؟؟ ان کے درمیان برسوں کا' دنوں کا' فرق ہے۔ صفاتی نہیں' مقداری فرق ہے۔

مثال یوں ہے: ایک بچہ ہے جس کی عمر پانچ سال ہے۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں: " پانچ سالہ بوڑھا" ایسا کہنے میں کیا حرج ہے؟ یہ صرف ایک ترکیبِ لفظی ہے جو ہم اس طرح کہتے ہیں: "ایک پانچ سال کا بچہ" اور اگر ہم چاہیں تو ایسے بھی کہہ سکتے ہیں جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے: "پانچ سال پرانا" جس کا مطلب خالصتاً یہی ہوگا: "پانچ سال پرانا آدمی" جیسے کہ ایک آدمی ستر سال پرانا ہے اسی طرح ایک آدمی پانچ سال پرانا ہے۔ دونوں میں طرزِ بیان کے

علاوہ کیا فرق ہے؟ اگر ہم کسی ستر سالہ آدمی کو "ایک ستر سال پرانا بچہ" کہنا چاہیں تو اس میں قابلِ اعتراض پہلو کیا ہے؟ کیونکہ وہ ایک بچے سے ہی ستر سال کا ہوا ہے۔ مگر جب ہم دونوں کو علیحدہ کر کے دیکھیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ دونوں متضاد باتیں ہیں۔ اور اگر فی الواقع ایسا ہو تو پھر کسی بچے کے بڑے ہونے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ دو متضاد باتیں ایک کیسے ہو سکتی ہیں؟ کیا آپ کسی بچے کے بڑا ہونے کے لمحے کا تعین کر سکتے ہیں؟ کوئی دن؟ کوئی رات؟؟ کیا آپ کسی کیلنڈر پر نشان لگا سکتے ہیں کہ کس تاریخ تک کوئی شخص بچہ تھا اور کس تاریخ کو وہ بڑا شمار ہونے لگا؟

دراصل مسئلہ یہ ہے: " مثلاً ہم بالکنی کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی پہلی اور آخری سیڑھی دیکھ سکتے ہیں، درمیان کی سیڑھیوں کو نظر انداز کر دیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ پہلی اور آخری سیڑھیاں علیحدہ علیحدہ ہیں، ایک دوسرے سے علیحدہ، کافی فاصلے پر ...... مگر جو کوئی ان سب کو بیک وقت دیکھ سکتا ہے وہ اس بات سے انکار کرے گا۔ اس کا موقف ہوگا کہ ہر دو کے درمیان فرق کا باعث بیچ میں موجود سیڑھیاں ہیں، مگر پہلی سیڑھی ہر حال میں آخری سیڑھی سے جڑی ہوئی ہے۔

جنت اور دوزخ کے درمیان بھی صفات کا نہیں صرف مقدار کا فرق ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا مخالف یا متضاد مت سمجھو۔ ان دونوں میں بھی گرم اور ٹھنڈے پانی والا فرق ہے، ایک ہی لاٹھی کے دو سرے۔ بچپن اور بڑھاپے کے بیچ والا فرق۔

بالکل اسی قسم کا فرق پیدائش اور موت کے مابین ہے۔ ورنہ جو ایک بار پیدا ہو گیا وہ کبھی مرے گا نہیں۔ اگر موت اور زندگی ایک دوسرے سے متضاد ہوں تو زندگی کا خاتمہ موت پر ممکن نہیں۔ ہم اسی حد تک جا سکتے ہیں جو ہمارے لیے مقرر ہے۔ پیدائش موت کی جانب سفر کرتی ہے...... صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک ہی چیز کے دو سرے ہیں۔ ہم ایک بیج بوتے ہیں...... یہ بڑھ کر پودا بن جاتا ہے...... پھر پھول کھل جاتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی بیج اور پھول کے درمیان موجود کسی تیسری چیز پر یقین رکھتے ہیں؟ پھول خود بیج میں سے نمودار ہو کر پھول بنا ہے۔ بڑھنے کی حد بیج میں مقرر ہے۔

پیدائش ہی موت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خدا کو معلوم کہ وہ کس نوع کی حماقت تھی یا کونسا بدقسمت لمحہ تھا جب انسان کے ذہن میں یہ بات جم گئی کہ پیدائش اور موت دو علیحدہ علیحدہ

شاخیں ہیں، اور دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں...... ہم مرنا نہیں چاہتے...... ہم جانتے ہی نہیں کہ موت پہلے سے ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم مرنا نہیں چاہتے، درحقیقت وہی وقت ہوتا ہے جب مصائب اور مشکلات ہماری زندگی میں در آتے ہیں۔

تمام نوعِ انسانی مالیخولیا میں مبتلا ہے۔ انسان کا دماغ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اور اس کیفیت کی وجہ ہماری یہ سوچ ہے کہ ہم نے زندگی کی منضبط اکائی کو ٹکڑوں میں تقسیم شدہ فرض کر لیا ہے، اور ہر ٹکڑے کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ انسان وہی ہے، مگر ہم نے اس کو اندر سے تقسیم کر لیا ہے اور حاصل تقسیم کی ہر اکائی کو ایک دوسرے سے متصادم فرض کر لیا ہے۔ اور یہ عمل ہر شعبۂ زندگی میں جاری و ساری ہے۔ ہم ایک شخص کو کہتے ہیں " غصہ مت کرو، درگذر کر دیا کرو" یہ سوچے بغیر کہ غصہ اور درگذر کے درمیان بھی صرف درجہ کا فرق ہے۔ جیسے گرم اور سرد کے درمیان اور بچپن اور بڑھاپے کے درمیان۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غصہ کی انتہائی تخفیف کا نام ہی درگذر ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی فطری تضاد نہیں ہے۔ مگر عمر بھر کی سماجی تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ " غصہ چھوڑ دو اور درگذر اختیار کرو" گویا غصہ اور درگذر دو ایسی متضاد چیزیں ہیں جن میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسری کو پکڑا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی باتوں کا نتیجہ صرف انسان کی تقسیم اور مسائل کی شکل میں برآمد ہوگا۔

ہمارے ماضی میں طے کیے گئے تمام معاشرتی ضابطے کہتے ہیں: کہ جنسی خواہشات اور تجرد ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ اس سے زیادہ فاش غلطی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جنس کا اسفل ترین نکتہ تجرد ہے، جنس کو نظر انداز کرنے اس کو گھٹانے کا مطلب ہے تجرد۔ دونوں کے درمیان مخالفت یا تضاد کا تصور نہیں۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اس دنیا میں تضاد نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو دو یکسر علیحدہ چیزوں کو یکجا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر موت و حیات دو علیحدہ چیزیں ہوتیں تو زندگی اپنے راستے پر رواں رہتی اور موت اپنے راستے پر...... دونوں کی راہیں کبھی ایک نہیں ہو سکتی تھیں۔ جیسے دو متوازی لکیریں کہیں نہیں ملتیں، اسی طرح موت و حیات کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل پاتیں۔

موت اور زندگی آپس میں جڑواں ہیں۔ دونوں ایک ہی سلسلے کے دو سرے ہیں۔

جب میں یہ کہتا ہوں تو میرے پیش نظر یہ بات ہوتی ہے کہ اگر انسان کو مستقبل میں پاگل ہونے سے بچانا ہے تو ہمیں زندگی کو مکمل حالت میں اپنانا ہوگا۔ پھر اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ ہم خود کو ٹکڑوں میں تقسیم کرتے رہیں اور ہر ٹکڑے کو ایک دوسرے کے مقابل لاتے رہیں۔

یہ حیرت کی بات ہے جب کوئی کہتا ہے کہ جنس طہارتِ نفس کے خلاف ہے' اس لیے جنس سے دور رہنا چاہئے۔ اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ ایسا کہنے والا جنسی تقاضوں کے رد میں خود تباہ نہ ہوگیا ہو۔ ایسا کہنے والا کبھی نفسِ عمارہ پر قابو نہیں پاسکتا۔ زندگی میں سے جنس کو نکال باہر پھینکنے کی کوشش میں اس کا ذہن صرف اور صرف جنسی خیالات میں ہی الجھتا رہے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ وہ اپنے نفس پر قابو پا سکے۔ اس کا ذہن ہمیشہ تناؤ اور کشمکش میں گھرا رہے گا۔ اور یہی وہ مقام ہے جسے اس کی موت کہا جاسکتا ہے۔ اس کی زندگی اس کے لیے ایک بوجھ بن جائے گی۔ وہ اس قدر دباؤ میں آجائے گا کہ اس کے لیے ایک لمحے کے لیے بھی جینا محال ہوجائے گا! وہ بڑے مسائل میں گھر جائے گا۔

اگر آپ اسکو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھیں تو میرا یہ کہنا کہ جنس اور تجرد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں جیسے ابتدائی سرا اور انتہائی سرا؛ انسان جیسے جیسے جنس کی سیڑھی پر چڑھتا جائے گا تو آخر کار وہ متجرد زندگی میں داخل ہوجائے گا۔ تجرد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جنس کی اہمیت کو زیرو ڈگری پر کردیا جائے۔ انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں لگتا ہے کہ سب کچھ خالی ہوچکا ہے...... ہر چیز اپنے منطقی انجام کی طرف رواں ہے۔ پھر زندگی میں تضادات باقی نہیں رہتے' کوئی تناؤ نہیں رہتا' پھر زندگی میں کوئی بے چینی' کوئی بے آرامی نہیں رہتی۔ جس کے بعد فطری زندگی گذاری جاسکتی ہے۔

میں بات کررہا ہوں کہ ہر پہلو سے فطری زندگی کیسے گذاری جاسکتی ہے۔ ہم کسی بھی سطح پر فطری زندگی نہیں گذارتے' کیونکہ ہم نے زندگی کو مصنوعی طریقوں پر گذارنا سیکھا ہے۔ اگر آپ کسی سے کہیں کہ صرف اپنی بائیں ٹانگ پر چلو کیونکہ بائیں ٹانگ مذہبی استعارہ ہے' راستی کی علامت ہے۔ دائیں ٹانگ پر مت چلو کیونکہ دائیں ٹانگ گمراہی کی علامت ہے۔ اگر وہ شخص آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہے...... اور ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جو ہر بات کو فوراً مان لیتے ہیں...... لہٰذا آپ کو ایسے بہت لوگ مل جائیں گے جو اس بات پر ایمان لے آئیں گے...... کہ

بائیں ٹانگ پر چلنا راست روی کا اظہار ہے اور دائیں ٹانگ پر چلنا نری گمراہی ہے۔ پھر وہ دائیں ٹانگ کٹوا کر بائیں ٹانگ پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ اور اپنی اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

ہم اپنی دونوں ٹانگوں کے اشتراکِ عمل سے ہی چل سکتے ہیں۔ ایک ٹانگ کبھی اکیلی نہیں چل سکتی جبکہ آگے بڑھنے کے لیے صرف ایک ہی ٹانگ آگے کی طرف حرکت کرتی ہے۔ چلتے وقت آپ ایک وقت میں صرف ایک ہی ٹانگ اٹھاتے ہیں' جس سے یہ غلط تاثر لینا تو ممکن ہے کہ آپ ایک ٹانگ پر چل رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ پیچھے رہ جانے والی ٹانگ بھی چلنے میں اتنی ہی مددگار و معاون ہے جتنی آگے کی طرف بڑھی ہوئی ٹانگ! جس روز کوئی جنس سے بے تعلق ہوکر سنیاسی بن جاتا ہے' تو خوابیدہ جنسی جذبات اس میں موثر کردار ادا کرتے ہیں...... بالکل اسی طرح جیسے پیچھے رہ جانے والی ٹانگ اگلا قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ دائیں ٹانگ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں کہ بائیں ٹانگ چل سکے۔

سنیاس لینے کے لیے جنس بہرحال پہلی سیڑھی کی حیثیت رکھتی ہے۔ سنیاسی بننے کے لیے ضروری ہے کہ جنسی تقاضے سرد پڑ چکے ہوں۔ جنسی تقاضوں کو دبانا' ان کا گلا گھونٹنا تو اس کو تباہ کردینے کے مترادف ہے۔ اور اس طریقے سے سنیاسی بننا بھی ممکن نہیں۔ بلکہ دوزخ میں لٹکے رہنے کے برابر ہوجائے گا۔ اسی طرح تمام فرسودہ نظریات نے انسانیت کو دوزخ میں معلق رکھا ہوا ہے۔ ہم زندگی میں جس حقیقت کو کارفرما دیکھتے ہیں وہ دائیں اور بائیں پاؤں کی حرکت اور بائیں اور دائیں پاؤں کا آپس میں اشتراکِ عمل ہے۔

زندگی میں ہر چیز ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ ظاہری تضادات موسیقی کے اتار چڑھاؤ کے مانند ہیں۔ اگر آپ اس میں سے کسی چیز کو خارج کردیں گے تو خود کو مشکلات میں مبتلا کرلیں گے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کالا رنگ آسیبی اثرات کا حامل ہوتا ہے' جس کی وجہ سے عموماً شادی کے موقعہ پر کسی کو کالا کپڑا نہیں پہننے دیا جاتا۔ سوگ میں البتہ کالا کپڑا پہننے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ کچھ لوگ کالے رنگ کو منحوس اور کچھ لوگ سفید رنگ کو مقدس جانتے ہیں۔ علامتی نکتۂ نظر سے ایسا سمجھنا غلط نہیں' لیکن اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ہمیں کالے رنگ سے چھٹکارا پالینا چاہئے' اور کرۂ ارض سے کالے رنگ کو نابود کردینا چاہئے' تو پھر یاد رکھئے کہ کالے رنگ کے خاتمے سے دنیا میں

سفید رنگ کا بہت معمولی حصہ باقی بچے گا۔ کیونکہ سفید رنگ کی سفیدی کا دارومدار پس منظر میں کالے رنگ کی موجودگی پر ہے۔

استاد تختۂ سیاہ پر سفید چاک سے کیوں لکھتا ہے؟ کیا وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے؟ وہ سفید دیوار پر کیوں نہیں لکھتا؟ یقیناً سفید دیوار پر بھی لکھا جا سکتا ہے' مگر اس طرح سفید الفاظ نمایاں نہیں ہوں گے۔ کالے پس منظر کی وجہ سے سفید الفاظ بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ کالا رنگ ہی اصل میں سفید کو ابھارنے کا باعث ہوتا ہے۔ یاد رکھئے کہ زندگی کا اجلا پن جو سیاہی کے پس منظر میں بخوبی ابھرتا ہے وہ ماند پڑ کر بدمزہ ہو جائے گا۔

جو کوئی بھی غصہ کے اظہار کے خلاف ہے...... اس کی معافی اور درگذر غیر حقیقی ہوگی۔ معافی کی اصل طاقت کا دارومدار غصہ کی شدت پر ہے۔ جو غصہ کا اظہار کرتے ہیں وہی معاف بھی کر سکتے ہیں۔ جتنی شدت کا غصہ ہوگا معاف کرنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ ہمت کی ضرورت ہوگی' غصہ کی طاقت ہی معاف کر دینے کا مواد فراہم کرتی ہے۔ غصے کے بغیر درگذر کا مادہ قطعی بے جان' بالکل مردہ ہوگا۔

اگر ایک انسان میں سے جنس نکل جائے ...... اور ایسے طریقے ہیں جن کے ذریعے ایسا ممکن ہے ...... تو وہ سنیاسی بننے کی اہلیت کھو بیٹھے گا' اور محض نامرد ہو کر رہ جائے گا۔ اور دونوں کیفیتوں میں بنیادی فرق ہے۔ ایسے طریقے ہیں جن کے ذریعے جنسیت سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ بھی سنیاسی بننے میں معاون نہیں' نامرد ضرور بنا سکتے ہیں۔ جنس کا دھارا دوسری طرف موڑنے' اس کو تسلیم کرنے' اس کی قوت کو کسی ارفع مقصد پر لگانے سے یقیناً سنیاس لینا ممکن ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ سنیاسی کی آنکھوں کی چمک اسکی جنسی توانائی کی غماز ہے۔ اس کی جنسی قوت ہی دوسری جگہ استعمال ہوتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ جن کو ہم تضادات کہتے ہیں وہ اصل میں تضادات نہیں ہیں...... زندگی بہت سے پراسرار معاملات کا مجموعہ ہے۔ اس کے پراسرار طریقوں میں مخالف اشیا کا وجود اسی لیے رکھا گیا ہے کہ ہر چیز اپنا وجود اور شناخت برقرار رکھ سکے۔ آپ نے کسی زیرِ تعمیر مکان کے سامنے اینٹوں کا ڈھیر دیکھا ہوگا! سب اینٹیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ دروازے کی محراب بنانے کے لیے معمار' انجینئر ان کو آمنے سامنے اس طرح سے لگاتے ہیں کہ بعد میں وہ ایک دوسرے کا سہارا

بن جائیں۔ اگر وہ ایک ہی جانب سے اینٹیں لگائے' تو وہ محراب بنانے کے قابل نہیں ہوگا دروازے کی محراب منہدم ہو جائے گی۔ محراب بنانے کے لیے لگائی جانے والی اینٹیں اگر ایک جانب سے لگائی جائیں تو ان کو آپس میں پیوست رکھنے کے لیے کوئی سہارا نہیں ہوگا۔ جہاں گرفت قائم ہوگی وہیں قوت پیدا ہوگی۔ مزاحمت بھی قوت پیدا کرتی ہے۔ تمام توانائی مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے۔ طاقت اور توانائی کے پیچھے وحدت کا قانون کارفرما ہے۔ اینٹیں سب ایک جیسی ہیں' مگر سب کو ایک کے بعد ایک مخالف سمت میں لگایا جاتا ہے۔

زندگی کا آفاقی خالق' خدا نہایت دانشمند ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ زندگی یکدم منجمد ہو جائے گی۔ اگر اینٹیں ایک دوسرے سے مخالف سمت میں نہیں لگائی جائیں گی تو فوراً منہدم ہو جائیں گی۔ اسی بنا پر اس نے غصے کے مخالف درگذر' جنس کے مخالف سنیاس رکھا ہے' اور چونکہ ان کے مابین مزاحمت موجود ہے اس لیے توانائی وجود میں آتی ہے۔ وہی توانائی اصلِ زندگی ہے' اس نے زندگی اور موت کی اینٹیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے لگائی ہیں' جو زندگی کا دروازہ بناتی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم صرف زندگی کی اینٹیں تسلیم کرتے ہیں' موت کی نہیں۔ بہتر ہے! جو آپ کے مزاج کے مطابق ہے وہ کریں۔ لیکن اگر آپ موت کو تسلیم نہیں کریں گے تو یہی بات آپ کی فوری موت کا باعث بن جائے گی' کیونکہ اینٹیں تو تمام ایک ہی شکل کی ہیں' موت کی اینٹیں نکل جانے اور صرف زندگی کی اینٹیں باقی رہ جانے کی وجہ سے وہ یکلخت گر جائیں گی۔

یہی غلطی بار بار دوہرائے جانے کی وجہ سے انسان پچھلے دس ہزار سال سے پریشانیوں اور ہیجان میں مبتلا ہے۔ وہ تمام اینٹوں کو ایک ہی جانب لگائے جانے پر مصر اور مخالف اینٹوں کا حامی نہیں ہے۔ ان کا نکتۂ نظر ہے کہ مرکز کو ترک کر دو' اگر ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں تو ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ پھر ہم آواگون پر یقین کیوں کریں۔ اگر خدا ہے تو آواگون نہیں ہے' اس لیے ہم بار بار جنم لینے کے قائل کیوں رہیں؟ ہم نہ بازار جا سکیں گے' نہ اپنے کاروبار پر توجہ دے سکیں گے کیونکہ ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں' ہم بھکشو بن کر جنگلوں میں نکل جائیں گے۔

وہ اپنی دنیا خدا کی اینٹوں سے بنانے کے خواہشمند ہیں۔ اگر ہم دنیا کے باسی بھکشو بن کر جنگل میں جا بسیں گے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے بعد ہر شے ساکت ہو جائے گی' پوری دنیا کھنڈرات میں تبدیل ہو جائے گی۔

درحقیقت وہ شخص جو بھکشو بنا ہوا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کس لیے اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کا بایاں پیر اس لیے آگے بڑھ رہا ہے کہ ایک دنیادار آدمی باہر کی دنیا میں ایک اسٹور چلا رہا ہے' اس کا ایک پیر وہاں محوِ حرکت ہے جس کی مدد سے بھکشو کا پیر بھی آزادی کے ساتھ اٹھ رہا ہے۔ بھکشو کا زندگی بخش سانس دنیادار انسان کی جانب سے آ رہا ہے۔ بھکشو اس فریب میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی زندگی خود گذار رہا ہے جبکہ درحقیقت اس کی توانائیاں اسی تبدیل ہوتی ہوئی دنیا سے حاصل ہو رہی ہیں۔ مگر وہ دنیاداروں کو برے ناموں سے پکارتا ہے اور انھیں دنیا چھوڑ کر بھکشو بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہی نہیں کہ اس طرح وہ ایک عالمگیر خودکشی کی فضا پیدا کرے گا۔ ایک ایسی فضا جس کی لپیٹ سے وہ خود بھی نہیں بچ سکے گا۔ وہ تمام اینٹیں ایک ہی جانب چننے کا خواہشمند ہے۔

اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں" کوئی خدا نہیں ہے......بس یہ دنیا ہے اور کچھ نہیں' ہم مادے پر یقین رکھتے ہیں" اور مادے پر یقین رکھنے والے یہ لوگ اپنی دنیا الگ ہی بسانے کے خواہشمند ہیں۔ وہ خود بھی مشکلات میں گھر چکے ہیں۔ وہ اس حال کو پہنچ چکے ہیں جہاں عالمگیر خودکشی کا واضح امکان موجود ہے۔ کیونکہ اگر خدا نہیں ہے اور صرف مادہ ہے تو پھر ہر زندگی بخش چیز' جس سے زندگی میں بہار ہے' جس سے دنیا کی ہر شے حرکت پذیر ہے' جو بلند پروازی کی طرف مائل کرتی ہے' سب ختم ہو جائیں گی۔

اگر کوئی سمجھتا ہے کہ خدا نہیں ہے' جو کچھ ہے بس مادہ ہے' تو پھر زندگی بے معنی ہے۔ پھر زندگی بیکار محض ہے۔ یہ اسی کی وجہ ہے کہ سارتر' کاموس' کافکا اور مغرب کے دیگر بہت سے افراد بے معنویت کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ آج بہت سے مغربی فلاسفر بیک آواز زندگی کو بے معنی ٹھہرا رہے ہیں۔ ایک بار جو کچھ شیکسپئر نے کہا تھا وہ اچانک نفسِ مضمون سے متعلق معلوم ہونے لگا ہے اور مغربی مفکر اس کو زندگی کے بارے میں سچ سمجھتے ہیں:" ایک بیوقوف کی سنائی ہوئی کہانی...... ہیجان اور آہنگ سے پُر......لیکن کسی مطلب سے عاری" اس میں کوئی خوبی ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ آپ نے صرف اور صرف مادہ پر انحصار کیا ہے۔ معنی تو پھر غائب ہونے ہی ہیں۔ جیسے پوری دنیا میں صرف بھکشو ہونے سے غائب ہو سکتے ہیں یا پوری دنیا میں لوگوں کے صرف دنیادار ہونے سے۔

یہ امر باعثِ دلچسپی ہے کہ ایک دنیادار آدمی ذات کی نفی کر کے بچ جاتا ہے' اور ذات کی نفی بھی دنیادار آدمی کی وجہ سے باقی رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بایاں پیر دائیں کا محتاج ہے اور دایاں پیر بائیں پیر کا۔ سطحی طور پر دیکھنے سے یہ تضاد محسوس ہو گا مگر اصل صورت حال یہ نہیں ہے۔ دونوں پیر ایک ہی وجود کا حصہ ہیں' ایک کو رکنا ہے اور دوسرے کو چلنا ہے۔

جب تک ان تضادات کی اصل وجہ کا علم نہیں ہو گا تب تک زندگی کا مطلق سچ سمجھ میں نہیں آ سکے گا۔ جو انسان دونوں میں سے ایک کو کاٹ دینے کا خواہاں ہے وہ یقیناً ابھی عقلِ سلیم سے محروم ہے۔ آپ بے شک نصف واحد سے نجات پا لیں' مگر جونہی ایسا ہوا دوسرا نصف خود بخود فنا ہو جائے گا۔ کیونکہ دوسرا نصف زندہ رہنے کی توانائی پہلے نصف کے علاوہ کہیں سے نہیں پا سکتا۔

میں نے سنا ہے کہ دو سنیاسی کسی معاملے میں الجھے ہوئے تھے' ایک کہتا تھا کہ اپنے پاس کچھ رقم رکھنا بہتر ہے تاکہ کسی ناگہانی کی صورت میں کام آ سکے' جبکہ اس کے دوست' دوسرے سنیاسی کا نظریہ تھا کہ ہم تارک دنیا لوگ ہیں ہمیں روپے پیسے سے کیا مطلب؟ یہ ہمارے کس کام آ سکتے ہیں؟ صرف دنیادار لوگوں کو ان کی ضرورت رہتی ہے۔ دونوں ہی اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے اور لگتا تھا کہ دونوں کے دلائل صحیح ہیں۔

اس دنیا کا سب سے بڑا اسرار یہ ہے کہ آپ اس کی تعمیر میں استعمال ہونے والی مخالف اینٹوں میں سے کسی کے حق میں بھی ایک جتنے دلائل دے سکتے ہیں۔ مگر جھگڑا ختم نہیں ہو سکے گا کیونکہ دونوں قسم کی اینٹیں اس کی تعمیر میں یکساں استعمال ہوئی ہیں۔ اس کی تعمیر میں استعمال ہونے والی اینٹوں کو کوئی بھی خود سے منسوب کر سکتا ہے......اور کوئی بھی دوسرا اس کے دعوے کو غلط کہہ کر ساری اینٹوں کو اپنا بتا سکتا ہے۔

مگر زندگی اتنی وسیع ہے کہ معدودے چند لوگ ہی اس بات سے آگاہ ہو پاتے ہیں کہ اس کا پورا ڈھانچہ ہی متضاد اور مخالف اینٹوں پر مشتمل ہے۔ باقی لوگ صرف وہی اینٹیں دیکھ پاتے ہیں جو ان کی آنکھوں کے سامنے آ گریں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ آپ کا کہنا درست ہے' کائنات سنیاس کی پیداوار ہے۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ برہمن کائنات کی بنیاد ہیں۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ کائنات کا دارومدار آتما پر ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں:" کائنات مادے سے بنی ہے' اس میں مٹی کے علاوہ کچھ اور استعمال نہیں ہوا۔ ہر چیز آخرکار مٹی میں مل جائے گی۔" مٹی میں مٹی" یہ لوگ

صرف اپنی نظروں کے سامنے گری ہوئی اینٹوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔اس سارے جھگڑے میں نہ کسی مذہب پرست کے دلائل مانے جاتے ہیں اور نہ کسی لامذہب کے۔نہ کوئی مادیت پرست جیت پاتا ہے نہ کوئی روحانیت کا پرستار۔کوئی جیت بھی نہیں سکتا۔ان سب کے بیانات زندگی کے بارے میں منفی نکتۂ نظر کے حامل ہیں۔

اس لیے دونوں بھکشوؤں کے درمیان تکرار بہت بڑھ گئی۔ایک اس بات پر قائم رہا کہ بھکشو کے پاس رقم ہونا ضروری ہے' اور دوسرا اس کا مخالف رہا۔ایک شام وہ دونوں بہت عجلت میں دریا پر آئے ......رات ہونے والی تھی ......ایک بھکشو کشتی والے کے پاس گیا جو رات ہونے پر اپنی کشتی باندھ رہا تھا' اور کہنے لگا:" مہربانی کر کے کشتی مت باندھو' ہمیں دریا پار کرا دو' رات ہونے والی ہے اور ہم کو ہر حالت میں دوسرے کنارے پر پہنچنا ہے"

کشتی والے نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ کام سے فارغ ہو چکا ہے اور اب اپنے گاؤں جائے گا اور اگلی صبح دریا پار کرا سکے گا۔

بھکشوؤں نے کہا کہ وہ صبح تک نہیں رک سکتے "ہمارے گرو' جن کے پاس ہم رہتے تھے' اور جنھوں نے ہمیں زندگی کے آداب سکھائے' ان کا آخری وقت ہے اور سنا ہے کہ وہ صبح تک نہیں بچ سکیں گے' انھوں نے ہمیں بلایا ہے اس لیے ہم رات بھر نہیں رک سکتے"

کشتی والے نے کہا" ٹھیک ہے' میں آپ کو دریا پار لے چلتا ہوں لیکن پانچ روپے لوں گا" جو بھکشو اپنے پاس پیسے رکھنے کا حامی تھا ہنسا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا" میرے دوست' اب آپ کا کیا خیال ہے؟ اپنے پاس پیسے رکھنا مفید ہے یا بیکار ہے؟" دوسرا بھکشو صرف ہنستا رہا' پہلے بھکشو نے کشتی والے کو پانچ روپے دیے......وہ اپنے موقف میں حق بجانب ثابت ہو چکا تھا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس بھکشو نے پھر پوچھا:" دوست! کیا خیال ہے؟ اگر ہمارے پاس پیسے نہیں ہوتے تو کیا ہم دریا پار کر سکتے تھے؟"

دوسرے بھکشو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا" ہم نے تمھارے پیسوں کی وجہ سے دریا پار نہیں کیا مگر اس وجہ سے کہ کہیں تم ان کا حصہ نہ بن جاؤ! ہم نے دریا پار کر لیا' اس لیے نہیں کہ تمھارے پاس پیسے تھے' مگر اس لیے کہ تم ان سے چھٹکارا پا سکو! اس طرح جرح جاری رہی' دوسرے بھکشو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا" میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ ایک بھکشو کے اندر اتنی

جرأت ہونی چاہئے کہ وہ پیسوں کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ہم کو پیسوں سے نجات پانی ضروری تھی اس لیے ہم نے دریا پار کیا' اگر تم ان کو اپنے پاس رکھنے پر بضد رہتے' اگر تم ان سے نجات پانے پر رضامند نہیں ہوتے تو ہم دریا پار نہیں کر سکتے تھے"

لہٰذا مسئلہ جوں کا توں رہا' پہلا بھکشو بھی ہنس پڑا' وہ اپنے گرو کے پاس پہنچے' اور سوال کیا: " بتائیے ہم کیا کریں' ہمارے لیے تو یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔آج جو کچھ ہم پہ گذرا وہ بڑی آسانی سے ہمارے نکتۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔ہم میں سے ایک کا خیال ہے کہ ہم اس لیے دریا پار کرنے کے قابل ہو سکے کہ ہمارے پاس پیسے تھے' اور دوسرے کے خیال کے مطابق ہم پیسوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دریا پار کر سکے۔ہم اپنے نظریات میں حق بجانب ہیں' اور بظاہر ہم دونوں ہی درست ہیں۔گرو کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے اس نے کہا" تم دونوں پاگل ہو۔تم دونوں اسی قسم کی بے عقلی دکھا رہے ہو جس میں انسانیت صدیوں سے مبتلا ہے۔

بھکشوؤں نے حیرت سے پوچھا:"اس میں کیا بیوقوفی ہے؟"

گرو نے جواب دیا" تم دونوں کی سچ کے صرف ایک پہلو پر نظر ہے۔تم کشتی کرائے پر لیکر ہی دریا پار کر سکتے تھے جو پیسہ خرچ کیے بغیر نہیں ہو سکتا تھا' اور دوسرا پہلو یہ کہ: تم پیسے کام میں لے سکتے تھے کیونکہ تمھارے پاس پیسوں کو کام میں لینے کا موقعہ تھا۔یہ صحیح ہے کہ تم دریا پار کرنے کے قابل اسی لیے تھے کہ تمھارے پاس پیسے تھے۔اور دوسرا پہلو بھی سچ ہے کہ اگر تمھارے پاس پیسے نہیں ہوتے تو تم دریا پار کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے تھے۔تم اسی لیے دریا پار کر سکے کہ تم نے پیسوں کو جانے دیا۔لہٰذا دونوں صورتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔دونوں میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہے"

مگر ہم نے زندگی کی ہر حقیقت کے دو پہلو قائم کر لیے ہیں۔اور دونوں میں سے کسی بھی پہلو کے حق میں ناقابلِ تنسیخ دلائل وضع کر لیے ہیں۔یہ چنداں مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ ہر شخص زندگی کے ایک ہی پہلو کو نظر میں رکھتا ہے۔اس طرح وہ اپنی زندگی کا آدھا حصہ جی رہا ہے' اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اس بارے میں خاصی بحث کی جا سکتی ہے۔لہٰذا بات بحث طلب نہیں ہے۔زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں حقائق جاننے کی ضرورت ہے۔

میں یقیناً موت کے بارے میں بتاتا رہتا ہوں مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں

زندگی کے خلاف ہوں۔اس کا مطلب کیا ہوا؟ یہ کہ موت ہی زندگی کو سمجھنے اور اس کو پہچاننے کا داخلی دروازہ ہے۔یعنی میں موت اور زندگی کو دو علیحدہ چیزیں نہیں سمجھتا۔چاہے میں اس کو مرنے کا فن کہوں یا زندگی گذارنے کا فن...... دونوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں۔اس کا دارومدار ہمارے اندازِ نظر پر ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں اس کو زندگی گذارنے کا فن کیوں نہیں کہتا؟......اس کی کئی وجوہات ہیں:

پہلی بات تو یہ کہ: ہم زندگی کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں؛ اور اس پیوستگی میں توازن مفقود ہے۔میں اس کو بھی زندگی گذارنے کا فن کہہ سکتا ہوں' لیکن کہوں گا نہیں۔کیونکہ آپ زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔اگر میں کہوں کہ آؤ زندگی گذارنے کا فن سیکھو! تو آپ اس لیے دوڑ کر آجائیں گے کہ زندگی سے اپنا رشتہ مضبوط تر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔میرے نزدیک یہ مرنے کا فن ہے جس کے ذریعے آپ دونوں میں توازن قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔اگر آپ مرنے کا فن سیکھ جائیں تو موت و حیات دونوں آپ کے سامنے یکساں حیثیت میں کھڑی ہو جائینگی۔وہ دونوں آپ کے دائیں اور بائیں پیروں کی طرح آپ کے ساتھ ہو جائیں گی۔پھر آپ حیاتِ مطلق کے مالک ہو جائیں گے۔اپنی مطلق حالت میں زندگی میں نہ موت ہوگی نہ حیات۔مگر اس کی داہنی اور بائیں دو ٹانگیں ہونگی جن کو ہم زندگی اور موت کہتے ہیں۔

ایک ایسا قصبہ جہاں کے لوگ خودکشی کرتے رہتے ہوں...... جہاں کوئی زندہ رہنے میں دلچسپی نہیں رکھتا ہو۔میں وہاں جا کر مرنے کے فن پر بات نہیں کروں گا۔بلکہ وہاں میں کہونگا کہ؛" زندہ رہنے کا فن سیکھو"......اور جیسا میں نے آپ سے کہا کہ استغراق موت کا داخلی دروازہ ہے' اس کے برعکس اس قصبے کے لوگوں کو میں کہوں گا:" استغراق زندگی کا داخلی دروازہ ہے" انکو زندہ رہنے کے طریقے بتاؤنگا۔کیونکہ جب تک آپ زندہ رہنا نہیں سیکھیں گے تب تک آپ کو مرنا بھی نہیں آئے گا۔اگر آپ مرنے کے خواہاں ہیں تو آیئے پہلے مجھ سے جینے کا طریقہ سیکھئے۔اگر ایک بار آپ نے جینے کا گر سیکھ لیا تو مرنا خود بخود آجائے گا۔اس صورت میں اس قصبے کے لوگ میرے پاس آئیں گے۔آپ کا قصبہ اس کے بالکل برعکس ہے' آپ ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں کے لوگ مرنا نہیں چاہتے' ہر شخص جینے کا خواہشمند ہے' وہ زندگی کے ساتھ ایسے چمٹے رہنا چاہتے ہیں جیسے انھوں نے موت کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میں مجبوراً آپ کے ساتھ

موت کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔آپ کے لیے میں اسکو مرنے کا فن کہہ رہا ہوں۔اور ایسا میں شروع سے کہہ رہا ہوں۔

ایک بار گوتم بدھ ایک گاؤں میں گیا۔صبح کا وقت تھا اور سورج افق پر نمودار ہونے والا تھا۔ایک شخص اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں لامذہب ہوں۔میں خدا پر یقین نہیں رکھتا! آپ کے خیال میں کیا خدا ہے؟

گوتم بدھ نے کہا" اکیلا خدا ہی ہے' ہر طرف خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہے"

وہ شخص بولا" مگر میں نے تو سنا تھا کہ آپ لامذہب ہیں"

" یقیناً تم نے غلط سنا ہے' میں مطلق مذہب پرست ہوں' اب تم نے خود میرے منہ سے یہ سن لیا ہے کہ میں انتہائی مذہب پرست ہوں؛ خدا ہے' اور خدا کے سوا کچھ نہیں ہے" وہ شخص درخت کے نیچے گم سم کھڑا رہ گیا اور بدھ آگے بڑھ گیا۔

دوپہر کے وقت ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں مذہبی آدمی ہوں اور خدا پر پکا یقین رکھتا ہوں۔لامذہب افراد سے مجھے بیر ہے۔میں آپ سے معلوم کرنے آیا ہوں کہ خدا کی موجودگی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

" خدا؟......نہ تو خدا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔قطعی طور پر خدا کہیں نہیں ہے"

اس شخص کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا' اور اس نے تعجب سے پوچھا" آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے تو سنا تھا کہ اس گاؤں میں ایک مذہبی آدمی آیا ہے اس لیے میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ آیا خدا ہے؟ اور آپ کچھ اور کہہ رہے ہیں۔

بدھ نے کہا" ایک مذہبی آدمی؟......خدا پر یقین رکھنے والا؟ میں تو دنیا کا سب سے بڑا لامذہب ہوں"

وہ شخص بڑی الجھن میں کھڑا ہو گیا......ہم اس کی الجھن کو سمجھ سکتے ہیں۔لیکن بدھ کا ایک شاگرد آنند سناٹے میں آ گیا۔دونوں باتیں اس کے سامنے ہوئی تھیں۔وہ بیحد مضطرب تھا' وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔صبح تو سب کچھ ٹھیک تھا......مگر دوپہر کے بعد سب کچھ الجھ گیا۔" بدھ کو کیا ہو گیا ہے؟" آنند اپنے آپ سے یہ سوال کرتا رہا۔" صبح تو وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سب سے بڑا مذہب پرست ہے اور اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ سب سے بڑا لامذہب ہے" اس نے

طے کرلیا کہ شام کو جب بدھ تنہا ہوگا تو وہ اس سے اس بارے میں بات کرے گا۔مگر شام ہوتے ہوتے آنند کے لیے ایک اور حیرت تیار تھی۔

شام ہوتے ہوتے ایک اور آدمی بدھ کے پاس آیا اور کہنے لگا" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا ہے یا نہیں" وہ شخص یقیناً ایسے لوگوں میں سے تھا جو نہیں جانتے کہ خدا ہے یا نہیں، نہ آج تک کوئی جان سکا ہے اور نہ کوئی جان سکتا ہے۔لہٰذا وہ کہنے لگا" میں نہیں جانتا کہ خدا ہے یا نہیں ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کیا کہتے ہیں؟

بدھ نے کہا" اگر تم نہیں جانتے تو میں بھی نہیں جانتا۔اور یہی بہتر ہے کہ ہم دونوں اس موضوع پر خاموشی اختیار کریں"

بدھ کا یہ جواب سن کر وہ شخص مبہوت ہوگیا اور کہا" میں نے سنا تھا کہ آپ روشن ضمیر ہیں اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کو ضرور معلوم ہوگا"

بدھ نے کہا کہ آپ نے یقیناً غلط سنا ہے، میں تو قطعی لاعلم ہوں، مجھے اس بارے میں کیا پتہ؟

آپ اندازہ کریں کہ آنند پر کیا گذری ہوگی۔خود کو اس کی جگہ رکھ کر غور کریں۔کیا آپ اس کی پریشانی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟ رات کو جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے بدھ کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا" یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا مجھے مارنا چاہتے ہیں؟ میں تو تقریباً مر ہی چکا ہوں۔میں اتنا پریشان کبھی نہیں ہوا جتنا آج ہوا ہوں۔آج تمام دن جو کچھ آپ کہتے اور کرتے رہے ہیں یہ کیا بوالعجبی ہے؟ آپ کی دماغی حالت کیسی ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آج تمام دن آپ کیا کیا کہتے رہے ہیں؟ صبح کے وقت آپ نے کچھ کہا...... دوپہر کو کچھ اور کہا......اور شام کو ایک ہی سوال کا بالکل الگ جواب دیا"

بدھ نے کہا کہ یہ جوابات میں نے تم کو نہیں دیئے، متعلقہ لوگوں کو دیے ہیں، تم نے انکو کیوں سنا؟ کیا دوسروں کے ساتھ میری باتیں سننا اچھی بات ہے؟

آنند نے کہا" اب تو حد ہوگئی ...... بھلا میں کیسے نہیں سنتا؟ میں وہیں موجود تھا اور میرے کان بھی کھلے تھے اور کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ کی باتوں پر توجہ نہ دوں؟ آپ کی باتیں جان سے زیادہ عزیز ہیں، خواہ ان کا مخاطب کوئی بھی ہو"

بدھ نے کہا" مگر تم پریشان کیوں ہو؟ میں نے تم سے تو وہ سب کچھ نہیں کہا۔

آنند بولا" بیشک نہیں کہا، مگر میں تو شش و پنج میں ہوں، برائے مہربانی مجھے بتائیں کہ سچ کیا ہے؟ آپ نے تین مختلف جوابات کیوں دیے؟

تب بدھ نے اس کو تفصیل کے ساتھ بتایا:

میں ان تینوں کو ایک متوازن نکتے پر لانا چاہتا تھا۔جو شخص صبح آیا تھا وہ لامذہب تھا اور اسی وجہ سے اس میں توازن مفقود تھا۔زندگی تضادات کا مجموعہ ہے۔یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک حقیقی مذہبی آدمی خدا کا منکر بھی ہوتا ہے اور اس کا قائل بھی۔اس کی زندگی میں یہ دونوں رخ موجود ہوتے ہیں۔مگر وہ دونوں میں ایک توازن قائم رکھتا ہے۔اور مذہب اسی توازن کا نام ہے۔اور جو شخص جو صرف خدا کی ذات کا قائل ہے اس میں مذہبی بالغ نظری کا فقدان ہے۔اور اس کی زندگی متوازن نہیں ہے۔

بدھ نے کہا" میں ان کی زندگی کو متوازن کرنا چاہتا تھا۔ان کی زندگی کا ایک پلڑا بہت بھاری ہو رہا تھا اس لیے مجھے ان کی زندگی کے دوسرے پلڑے میں کچھ بھاری پتھر ڈال کر ترازو کو متوازن کرنا تھا۔پھر میں اس کو مشکوک بھی کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ بہرحال اس نظریے پر گامزن تھا کہ خدا نہیں ہے۔اس کے اس یقین کو پامال کرنا ضروری تھا، کیونکہ جو انسان تیقن میں مبتلا ہو جائے، وہ فنا ہو جاتا ہے۔سفر جاری رہنا چاہیے، تلاش کرتے رہنا چاہیے"

"جو شخص دوپہر میں آیا تھا وہ مذہب پرست اور خدا کو ماننے والا تھا۔اس کو مجھے یقین دلانا تھا کہ میں خدا پر یقین نہیں رکھتا کیونکہ اس کا جھکاؤ بھی ایک طرف تھا۔اس نے بھی توازن کھو دیا تھا۔زندگی ایک توازن کا نام ہے جس نے یہ توازن قائم کرلیا اس نے سچ کو تلاش کرلیا"

میں جو آپ کو مرنے کا فن سیکھنے کے لیے کہتا ہوں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ آپ کا جھکاؤ ایک طرف ہے۔آپ زندگی کے ترازو پر بہت سختی سے جمے بیٹھے ہیں اس لیے ہر چیز پتھرا گئی ہے۔زندگی ٹھوس ہوگئی ہے اور اس میں کوئی توازن باقی نہیں رہا ہے۔

آگے آئیے! موت کو قبول کیجیے، اور اسے کہیے:" آؤ! میری مہمان بنو، ہم دونوں ساتھ رہیں گے" جس دن زندگی اور موت ساتھ رہنے پر رضامند ہو جائیں گے، تو زندگی نہایت اعلیٰ اور ارفع ہو جائے گی۔جس روز کوئی موت کو خوش آمدید کہے گا، اس سے بغلگیر ہوگا، تو قصہ ختم ہو جائے

گا۔ اس دن دل سے موت کا کانٹا نکل جائے گا۔ موت سے خوف کھانے اور اس سے دور بھاگنے کی وجہ سے یہ کانٹا ہمارے دل میں چبھا رہتا ہے۔ جب کوئی انسان آگے بڑھ کر موت کو گلے لگائے گا' موت ہار جائے گی' موت پر فتح پالی جائے گی۔ کیونکہ جب کوئی موت کو گلے لگالیتا ہے تو وہ لافانی ہوجاتا ہے۔ اب موت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ جو خود ہی فنا پر آمادہ ہے تو موت اس کے علاوہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جنھیں موت تلاش کرتی ہے اور دوسرے وہ جو خود موت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ موت ان کی تاک میں رہتی ہے جو موت سے بھاگتے ہیں' اور جو لوگ موت کی تلاش میں رہتے ہیں یہ ان کو غچہ دیتی رہتی ہے۔ یہ لوگ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے'۔ آپ کونسی قسم کے بننا چاہیں گے؟ ان جیسے جو موت سے بھاگتے رہتے ہیں یا ان جیسے جو موت کی تلاش میں رہتے ہیں؟ وہ جو موت سے بچتے پھرتے ہیں وہ شکست کھاتے رہیں گے۔ ان کی پوری زندگی شکست خوردگی میں گذرے گی۔ جو آگے بڑھ کر اس کو گلے لگائیں گے وہ فوری اس پر فتح پالیں گے۔ ان کی زندگی میں شکست نام کی کوئی چیز نہیں رہے گی۔ اور ان کی زندگی فتوحات اور کامرانیوں کا سفر بن جائے گی۔

جی ہاں! میں مرنے کا ہنر ہی سکھاتا ہوں۔ میں آپ کو مرنے کا وہ طریقہ سکھاتا ہوں جس سے آپ کو زندگی مل جائے۔ آپ کو ایک راز کی بات معلوم ہے؟ جس انسان کو اندھیرے میں رہنے کا طریقہ آجائے' جب وہ گہرے اندھیرے سے مکمل ہم آہنگی اختیار کرلے' تو وہ اندھیرا اس کے لیے روشنی کی حیثیت اختیار کرلے گا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جو شخص پیار محبت سے زہر کو آبِ حیات سمجھ کر استعمال کرے' تو وہ زہر اس کے لیے آبِ حیات میں بدل جائے گا۔ اگر آپ نہیں جانتے تو آپ کو تحقیق کرنی چاہیے۔ زندگی کا ایک تسلیم شدہ سچ ہے کہ جو اپنی خوشی سے زہر کو قبول کرتا ہے تو وہ اس کے لیے زہر نہیں رہتا آبِ حیات میں بدل جاتا ہے۔ اور جو کوئی سچے دل کے ساتھ اپنے لیے اندھیرا قبول کرتا ہے' تو اس پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ وہ اس کے لیے روشنی میں ڈھل گیا ہے۔ اور جو کھلے بازوؤں کے ساتھ دکھ کو خوش آمدید کہتا ہے' اس کے لیے دکھ دکھ نہیں رہتا...... اس کے لیے صرف خوشیاں ہی خوشیاں رہ جاتی ہیں۔

جو اپنی دکھ بھری زندگی سے بھی مطمئن ہے' اور اسی حالت میں رہنے پر

آمادہ ہے' اس کے لیے امن و سکون کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ متضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ جو عافیت کا طلبگار ہوتا ہے وہ کبھی سکون میں نہیں رہتا کیونکہ یہ کہنا کہ "میں سکون چاہتا ہوں" دراصل پریشانیوں کو آواز دینا ہوتا ہے۔ انسان تو جتنا پریشان ہے سو ہے' مگر اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نئی نئی مشکلات ایجاد کرتے ہیں جو ہر وقت یہ کہتے رہتے ہیں "ہم سکون سے رہنا چاہتے ہیں"

ایک دفعہ میرے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا" میں رمنا آشرم گیا' رام کرشن آشرم گیا' پانڈیچری گیا...... ہر جگہ فریب اور ڈھکوسلہ ہے' اس کے علاوہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں سکون کی تلاش میں ہوں جو مجھے کہیں نہیں ملا۔ میں دو سال سے اس کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ پانڈیچری میں مجھے کسی نے آپ کے بارے میں بتایا تو میں سیدھا وہیں سے چلا آرہا ہوں' مجھے سکون چاہیے!"

میں نے اس کو فوراً نکل جانے کے لیے کہا ورنہ یہ کہ میں بھی ڈھکوسلہ باز بن جاؤں گا۔

"یعنی! آپ کا مطلب ہے کہ......!؟"

میں نے کہا:" میں کہتا ہوں نکل جاؤ اور کبھی مڑ کر بھی اس طرف دیکھنے کی کوشش مت کرنا' میں خود کو فریبی اور دھوکہ باز کہلوانا پسند نہیں کرتا"

وہ گڑگڑا کر کہنے لگا" میں تو سکون کی تلاش میں آیا تھا"

میں نے کہا" دفع ہوجاؤ۔ لیکن مجھے یہ بتاتے جاؤ کہ تم مصائب کی تلاش میں کس کس کے پاس گئے؟ اس سرگرانی کے لیے تم کو کس گرو نے کہا ہے؟ پریشانیاں سمیٹنے کے لیے تم کسی آشرم میں گئے؟"

وہ بولا:" کہیں نہیں گیا"

میں نے کہا" تم تو خود اتنے ہوشیار آدمی ہو کہ اپنے لیے ذہنی پریشانیاں لینے کے لیے تیار نہیں ہو! پھر میرے پاس تمھیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سکون حاصل کرنے کے لیے جس طرح تم نے ٹھوکریں کھائی ہیں' اگر اس کا مخالف راستہ اختیار کروگے تو تم کو سکون مل سکتا ہے۔ مجھ سے تمہیں کیا چاہیے؟ کبھی غلطی سے بھی کسی کو مت بتانا کہ تم میرے پاس آئے تھے' تمھارے اوپر کیا بیت رہی ہے' مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں"

وہ بولا "برائے مہربانی سکون حاصل کرنے کے لیے میری رہنمائی کیجیے"

میں نے اس کو کہا" تم خودتو پریشانیوں کی تلاش میں ہو؛ جبکہ سکون و عافیت کا صرف ایک راستہ ہے: پریشانیوں میں مطمئن رہو" وہ جو پریشانیوں کو جوں کا توں قبول کرلئے جو یہ کہے" کہ آؤ میرے ساتھ رہو! میرے گھر مہمان بنو" اسے فوراً ہی محسوس ہوگا کہ اس کی پریشانیاں رفع ہوگئی ہیں؛ ذہنی حالت میں تبدیلی سے پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں۔ جو اپنی پریشانیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرلیتا ہے؛ اس کا ذہن سکون میں آجاتا ہے۔ جب ذہن ہی پرسکون ہوجائے تو پریشانیاں کہاں رہ سکتی ہیں؟

بے چینی کا جواز اس سے منہ موڑنے میں پوشیدہ ہے۔ یہاں تک کہ خود بے چینی سے منہ موڑنا بھی بے چینی کا سبب ہوتا ہے۔ جو کوئی کہتا ہے کہ میں بے چینی کو تسلیم نہیں کرتا' وہ بے چینی میں مبتلا رہے گا۔ کیونکہ بے چینی کو تسلیم نہیں کرنے میں ہی بے چینی کی جڑیں ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے "میں بے سکونی قبول نہیں کروں گا' میں ابتلا قبول نہیں کرسکتا' مجھے موت منظور نہیں' مجھے اندھیرا قبول نہیں" یہ تو بہت اچھی بات ہے' انہیں مت قبول کریں......جن کو تم قبول نہیں کرنا چاہتے تم ان سب میں گھرے رہو گے۔ اس کے برعکس دیکھو کہ ان کو قبول کرلینے سے کیا ہوتا ہے' ایک بار ان کو تسلیم کرلینے سے بار بار اس کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ جن کو آپ اپنا دشمن سمجھتے تھے وہ دراصل آپ کے دوست ہیں۔ اگر آپ اپنے دشمن کو اپنے گھر مہمان رکھو گے تو اس کے پاس آپ کا دوست بن جانے کے علاوہ کون سا راستہ بچے گا؟

تین دن تک آپ کے سامنے اس بحث کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کی اس خواہش کو سمجھ لیا تھا کہ آپ یہاں موت پر فتح پانے کے لیے آئے تھے۔ شاید آپ نے سوچا ہو کہ میں آپ کو کوئی ایسی ترکیب بتاؤں گا کہ آپ کبھی نہیں مریں گے۔

میرے پاس ایک دوست کا خط ہے جس میں اس نے کہا ہے:" کیا آپ ہم کو دوبارہ جوان ہونے کا گر بتانے جا رہے ہو؟ کیا ہمیں کیمیائی طریقے سے دوبارہ جوان ہونے کا طریقہ بتائیں گے؟ اگر ایسا ہے تو ہمیں آپ کے پاس آنے کے لیے پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں"

ممکن ہے کہ آپ بھی اسی خیال کے تحت یہاں آئے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو آپ کو مایوسی ہوگی' کیونکہ میں تو یہاں مرنے کا ڈھنگ سکھا رہا ہوں۔ میں آپ کو کہہ رہا ہوں: مرجاؤ!

مرنے کا ڈھنگ سیکھو! موت سے کیا ڈرنا؟ اسے قبول کرو' اسے خوش آمدید کہو' اور سمجھ لو کہ میں آپ کے ہاتھ میں موت پر فتح پانے کی کنجی دے رہا ہوں۔ دوبارہ جوانی کا موت پر فتح یاب ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ دوبارہ جوانی حاصل کرنے کے لیے کتنی ہی دوڑ دھوپ کرلیں' اس کے باوجود آپ کو مرنا بہرحال ہے آپ کے جسم کو ہر حال میں فنا ہونا ہے۔

دوبارہ جوان ہونے سے کچھ وقت کے لیے موت کو آگے کیا جاسکتا ہے......اس سے کچھ دیر کے لیے نجات پائی جاسکتی ہے۔ جس کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ اپنے مسائل کو کچھ دیر کے لیے اپنے اوپر مزید مسلط رکھنا چاہتے ہیں۔ ستر سال کے بجائے ہوسکتا ہے کہ آپ سات سو سال زندہ رہیں۔ اس صورت میں جو مصائب اور مشکلات ستر سال میں ختم ہونے والے ہیں وہ سات سو سال تک آپ کے ساتھ رہیں گے......اس کے علاوہ اور کیا ہوگا؟ ستر سال میں ختم ہونے والی پریشانیاں سات سو سال تک چلتی رہیں گی۔ ستر سال کے جھگڑے سات سو سال تک بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ستر سال کے مسائل سات سو سال تک پھیل جائیں گے......وہ دراز ہوتے رہیں گے...... گویا سب کو آپس میں ضرب دے دیا گیا ہو۔ آپ اس کے علاوہ اور کیا توقع رکھتے ہیں؟

ہوسکتا ہے کہ آپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آیا ہو' لیکن اگر کوئی آپ کو کسی مشروب کی ایک خوراک دے کر کہے کہ اسے پینے سے آپ سات سو سال تک زندہ رہیں گے۔ آپ اس کو پینے سے پہلے کچھ دیر سوچیں گے؟ میں نہیں سمجھتا کہ آپ میں سے کوئی اس مشروب کو پینے کے لیے آمادہ ہوگا جو آپ کی زندگی کو سات سو سال تک طول دیدے۔ لہٰذا کیا مطلب ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ تو جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔ محض یہ اندر کی 'میں' سات سو سال تک باقی رہے گی۔ اور یہ ایک مہنگا سودا ہوگا' اس کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

اگر کبھی سائنسدانوں نے ایسا کوئی طریقہ دریافت کرلیا کہ انسان ہمیشہ زندہ رہے...... اور ایسی دریافت ناممکن نہیں ہے......مگر یاد رکھیے کہ اس وقت لوگ ایسے گرو کو تلاش کیا کریں گے جو ان کو جھٹ پٹ مرجانے کا طریقہ بتا سکے۔ جس طرح آج کے دور میں لوگ ایسے گرو کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کو دوبارہ جوان بننے کا راز بتا سکے۔ پھر سائنسدان بھی ان کی مدد نہیں کرسکیں گے' کیوں کہ لوگ حکومت کو دھوکہ دینے کے لیے مرجانا پسند کریں گے۔

طویل زندگی کی نفع بخشی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ بھرپور زندگی کے معنی تو سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک انسان بھرپور طریقے سے پوری زندگی کو ایک لمحہ میں بھی جی سکتا ہے، جو ممکن ہے کہ ایک دوسرا انسان کئی جنموں میں بھی نہ جی سکے۔ یہ زندہ رہنے کا مسئلہ ہے، اور وہی اس سے نمٹنے کا اہل ہوگا جس کے دل میں موت کا خوف نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کے جینے کی کوئی صورت نہیں۔ موت کا خوف انسان کو لرزاتا رہتا ہے، وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا، ہر وقت متحرک رہتا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ دنیا ہر لمحہ تیز رفتار ہوتی جا رہی ہے؟ ہر چیز میں تیزی رفتار ہے، ایک اعتبار سے راکٹ ایک بیل گاڑی سے اس لیے بہتر ہے کہ وہ ہمیں تیزی کے ساتھ مختلف جگہوں پر لے جا سکتا ہے، مگر رفتار پر اتنا انحصار کیوں کیا جائے؟ آپ نے تو شاید کبھی نہیں سوچا ہو، مگر ہر شخص کی تیز رفتاری کا سبب یہ ہے کہ وہ جہاں ہے وہاں سے ایک دم فرار حاصل کرنا چاہتا ہے...... بھاگ جانا چاہتا ہے۔ جہاں وہ ہے وہاں وہ خوف زدہ ہے...... بہت زیادہ ڈرا ہوا...... کہ جلد از جلد وہاں سے نکل جائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جہاں وہ ہے اس کے مقابلے میں کوئی بھی دوسری جگہ بہتر ہے، محفوظ ہے۔

امریکہ سمیت پورے یورپ میں اختتامِ ہفتہ اور دیگر تعطیلات ایک اہم موقعہ بن گئے ہیں۔ باقی دنوں کے مقابلے میں چھٹیوں کے دوران لوگ زیادہ تھک جاتے ہیں۔ کار میں سوار ہو کر پچاس میل، سو میل، دو سو میل، پکنک کے کسی مقام پر، پہاڑ پر، کسی پرفضا مقام پر یا ساحل پر نکل جانے کی خواہش انہیں اس بات پر مجبور کر دیتی ہے۔ دوسروں کا بے مہار بھاگے چلے جانا اس کا محرک ہوتا ہے۔ اور ہر کوئی وہاں سب سے پہلے پہنچنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں، تو ان کے پاس کوئی فوری جواب نہیں ہوتا۔ ایک بات بہر حال یقینی ہے کہ وہ اپنی جگہ سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ گھر سے دور، بیوی سے دور، کام دھندے سے دور۔

انسان کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے کیونکہ اس میں بھاگ دوڑ بہت ہے۔ وہ تیز بھاگنے کے لیے اپنے پہیوں کو اور زیادہ طاقتور بنانا چاہتا ہے۔ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ کہاں جانا چاہتا ہے، تو اس کا جواب ہوگا کہ ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا، فی الحال میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے جلد پہنچنا ہے، مجھے چاند پر جانا ہے، مجھے مریخ پر جانا ہے وغیرہ۔ ہم پوری

زندگی دوڑتے ہی رہتے ہیں...... ہم کس سے بھاگ رہے ہیں؟ ہمیں کیا خوف ہے؟ خوف یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم بھرپور طریقے سے زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں اور دوسری طرف موت کا خوف ہمیں گھیرے رہتا ہے...... دونوں باتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ موت سے ڈرنے والا کبھی زندگی گذارنے کے قابل نہیں رہ سکتا، وہ ہر لمحہ موت کے تصور سے لرزتا رہے گا۔ پھر اس کا حل کیا ہے؟

مجھ سے پوچھیں کہ اس کا جواب کیا ہے، اس کا حل کیا ہے؟ میرا کہنا ہے کہ موت کو تسلیم کرو! اس کو مدعو کرو اور کہو "آؤ! زندگی کے بارے میں تو میں بعد میں سوچوں گا" پہلے تم سے نمٹ لوں تا کہ یہ معاملہ ایک ہی دفعہ میں ختم ہو سکے! اس کے بعد میں فارغ ہو جاؤں گا، پہلے تمھارا مسئلہ حل ہو جائے پھر مطمئن ہو کر آرام سے جی سکوں گا۔ استغراق اسی برتاؤ کے ساتھ موت قبول کرنے کا نام ہے۔ موت کو اسی طرح سے مدعو کرنے اور اس کو جواب دینے کا نام ہی استغراق ہے۔ جو کوئی اس طرح سے موت کو تسلیم کرے گا اس کی زندگی میں ایک دم ٹھہراؤ آ جائے گا۔ اس کی عجلت اور تیز رفتاری ختم ہو جائے گی۔

کیا کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ جب آپ غصے کی کیفیت میں سائیکل چلاتے ہیں تو آپ تیز تیز پیڈل چلاتے ہیں، جب آپ ایسی حالت میں کار چلا رہے ہوتے ہیں، تو ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ تیز ہوتا ہے، نفسیات دان کہتے ہیں کہ حادثات کا سبب خراب سڑکیں نہیں بلکہ ایکسی لیٹر دبانے والا انسان ہوتا ہے...... اسے کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ اس کے جبڑے ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور وہ ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتا جا رہا ہے۔ اور شعوری یا لاشعوری طور پر وہ خود کسی حادثے کا خواہاں ہے۔ جنونی کیفیت میں وہ کسی چیز کے پرخچے اڑا دینا چاہتا ہے۔ زندگی اس کے نزدیک بدمزہ اور بیکار ہو چکی ہے اس لیے وہ کوئی غیر معمولی تبدیلی چاہتا ہے، جو زندگی میں کوئی دلکشی پیدا کر دے، اگر کسی اور طریقے سے نہیں تو توڑ پھوڑ کے ذریعے ہی سہی۔ ایسا کر کے وہ چاہتا ہے کہ زندگی میں شاید کچھ سواد آ جائے۔ اس طرح وہ خود کو اطمینان دلا سکے گا کہ اس کی زندگی بالکل ناکارہ نہیں، اس میں بھی کچھ تو رونما ہوا۔

امریکہ اور یورپ میں اکثر مجرم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مقتول سے کوئی جھگڑا یا اختلاف نہیں تھا، ...... وہ تو بس اخباروں میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے، جس

کا بس یہی ایک طریقہ ان کی سمجھ میں آتا تھا۔ قاتلوں اور مجرموں کے علاوہ ایک شریف آدمی کا نام کبھی اخبار میں نہیں آتا۔ قاتل بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ...... ایک وہ جو اپنے کسی مقصد کے لیے کسی ایک فرد کا خون کر دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو اجتماعی قتل کے مرتکب ہوتے ہیں ...... سیاستدان۔ صرف انہی کے نام اخبارات میں آتے ہیں باقیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ آپ بیشک ایک پرامن شہری ہیں' آپ کا نام اخبار میں نہیں آسکتا' آپ کسی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں' آپ کا نام سرخی میں آجائے گا۔

ایک جرائم پیشہ عدالت میں بیان دیتا ہے: "میرا اس شخص سے کوئی جھگڑا نہیں تھا' میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا تک نہیں تھا' بس میں نے اس کی پیٹھ دیکھی اور اس میں چاقو گھونپ دیا' جب خون بہنے لگا تو مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ اب لوگ میرے بارے میں باتیں کریں گے۔ اور میری زندگی رائیگاں نہیں گئی' اخباروں میں تذکرے ہو رہے ہیں' عدالت میں جج اور کالے کپڑوں میں ملبوس وکلا سنجیدگی کے ساتھ میرے کیس پر گفتگو کر رہے ہیں' یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بھی کچھ کر دکھایا ہے' میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں"

جو آدمی موت سے بھاگتا ہے' اس سے خوف زدہ ہے' وہ اتنا الجھا ہوا' سنجیدہ اور بیزار ہے کہ وہ کسی بھی معاملے میں الجھ سکتا ہے۔ مگر موت کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار نہیں۔ مگر جیسے ہی کوئی انسان موت کو خوش آمدید کہتا ہے' اس کو قبول کرتا ہے' تو اس کی زندگی میں ایک نیا دروازہ کھل جاتا ہے جو اس کو آفاقیت کی طرف لے جاتا ہے۔

خدا کے معبد پر لفظ 'موت' کھدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے اندر حیات پوری طرح موجزن ہے۔ موت' کی تختی لگی دیکھ کر لوگ واپس پلٹ جاتے ہیں۔ اندر کوئی نہیں جاتا۔ یہ ایک اچھا طرزِ عمل ہے' بہت موثر طریقہ ہے ورنہ اس کے اندر اتنی بھیڑ ہو جاتی کہ وہاں جینا محال ہو جاتا۔ اس لیے زندگی کے معبد پر 'موت' کے نام کی تختی لٹکا دی گئی ہے۔ جو اسے دیکھ کر سہم جاتے ہیں وہ وہاں سے بھاگ لیتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ لوگوں کو مرنے کا ہنر سیکھنا چاہیے۔

زندگی کا سب سے بڑا راز ہی یہ جاننے میں ہے کہ کیسے مرا جائے؟ موت کو کیسے تسلیم کیا جائے؟ ماضی کو ہر روز فنا کر دیا جائے۔ خود ہمیں روز مرنا چاہیے۔ ہم کل کے ماضی کو بھی دفن کرنا نہیں چاہتے' ایک ستر سالہ انسان بھی اپنے بچپن کی یادیں اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے۔ اس کا بچپن

ابھی تک مرا نہیں ہے۔ اس کے دل میں ابھی تک بچپن کے دن لوٹ آنے کی امنگ جاگی ہوئی ہے۔ آدمی چلنے پھرنے سے معذور ہو کر بستر میں قید ہے' مگر اس کی جوانی کے مناظر ابھی تک اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ ابھی تک انہی کی یادوں میں الجھا رہتا ہے' اس کے خوابوں میں ابھی تک اس کے دورِ جوانی کی مقبول فلمی اداکاراؤں کا جمگھٹا رہتا ہے' حالانکہ ان میں سے اب کوئی بھی ویسی نہیں رہی۔ اس کی آنکھوں میں ان کی تصویریں اب تک گردش کرتی رہتی ہیں ...... کچھ بھی محو نہیں ہو سکا ہے۔ ہوتا یہی ہے کہ ہمارا کل کبھی نہیں مرتا' ہمارے اندر مرنے کی ہمت ہی نہیں پیدا ہوتی' ہم کسی چیز کو بھی نہیں مرنے دینا چاہتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ ہمارے دل میں چھبا رہتا ہے' ہم تو مرے ہوئے کو بھی نہیں مارتے' بلکہ اپنے اوپر ان کا بوجھ بڑھاتے رہتے ہیں' یہاں تک کہ ان کے وزن کے نیچے دبے رہتے ہیں اور جینا محال ہو جاتا ہے۔ اس لیے مرنے کے ہنر کے لیے یہ ضروری ہے کہ مردہ اشیا کو بھلایا جائے۔

ایک بار حضرت عیسیٰ ایک جھیل کے پاس سے گذر رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ صبحِ صادق کا وقت تھا' سورج طلوع ہونے والا تھا۔ افق پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک مچھیرے نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جھیل میں جال پھینکا تھا۔ جیسے ہی اس نے جال نکالنے کے لیے باہر کھینچنا چاہا' حضرت عیسیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرے دوست! کیا تم اپنی ساری زندگی مچھلیاں پکڑتے ہوئے گذار دو گے؟"

یہ سوال خود مچھیرے کے ذہن میں کئی بار آچکا تھا۔ کوئی ایسا ذہن نہیں جس میں یہ سوال نہیں آتا ہو۔ مچھلیاں بدل جاتی ہیں' جال دوسرے ہوتے ہیں' جھیلیں دوسری ہوتی ہیں' مگر یہ سوال ضرور ذہن میں ابھرتا ہے" کیا میرے لیے ساری زندگی بس مچھلیاں پکڑنا ہی رہ گیا ہے؟"

مچھیرے نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون ہے جو وہی سوال کر رہا ہے جو خود میرے ذہن میں اٹھتا رہتا ہے۔ اس نے حضرت عیسیٰ کی پرکشش ہنستی ہوئی آنکھیں' اور ان کی شخصیت کی طرف دیکھا اور کہا" اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں' میں کوئی دوسری جھیل کہاں سے لاؤں؟ مجھے اور مچھلیاں کہاں ملیں گی جن کو پکڑنے کے لیے میں اپنا جال پھینکوں؟ میں تو خود بھی اپنے آپ سے یہ سوال کرتا رہتا ہوں کہ کیا میں تمام زندگی مچھلیاں ہی پکڑتا رہوں گا؟"

حضرت عیسیٰ نے کہا کہ میں بھی ایک مچھیرا ہوں' مگر میں اپنا جال کسی اور سمندر میں

پھینکتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ آ سکتے ہو مگر یہ بات دھیان میں رہے کہ نیا جال پھینکنے کے لیے اپنا پرانا جال چھوڑنا پڑے گا۔ لہٰذا اپنا پرانا جال چھوڑ دو!

وہ مچھیرا بھی کوئی دلیر آدمی تھا...... اتنے جرأتمند لوگ کم ہی ہوتے ہیں...... اس نے مچھلیوں سے بھرا ہوا جال وہیں کے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے دل میں بھرا ہوا جال کھینچ لینے کی خواہش تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی مگر حضرت عیسیٰ نے کہا" صرف وہی لوگ نئے سمندر میں نیا جال پھینکنے کے اہل ہونگے جو اپنے پرانے جال سے نجات پالیں گے' اپنا جال یہیں چھوڑ دو!" مچھیرے نے اپنا جال پھینک دیا اور کہا" مجھے بتایئے کہ مجھے کہاں جانا ہے؟"

حضرت عیسیٰ نے کہا" تم ایک باہمت انسان دکھائی دیتے ہو! تمھارے اندر کہیں بھی جانے کی صلاحیت موجود ہے' میرے ساتھ آؤ! وہ ابھی دیہات سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا ان کے نزدیک آیا اور مچھیرے کو پکڑتے ہوئے بولا " اے پاگل کہاں جا رہا ہے؟ تیرا بیمار باپ مر گیا! تو کہاں تھا؟ ہم تجھے تلاش کرنے جھیل پر گئے تھے جہاں تیرا جال پڑا ہوا ہے' تو کہاں جا رہا ہے؟"

اس پر مچھیرے نے حضرت عیسیٰ سے کہا" مہربانی کر کے مجھے چند دن کی اجازت دیں تاکہ میں اپنے باپ کی آخری رسوم ادا کر سکوں' اس کے بعد میں واپس آ جاؤنگا"۔

اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ کے الفاظ نہایت ہی تعجب خیز تھے۔ انہوں نے کہا " بیوقوف! مُردوں کو مردہ دفنانے دو! تمھاری وہاں کیا ضرورت ہے؟ چلو! میرے ساتھ آؤ! جو مر گیا وہ مر گیا' اس کو دفنانے کی زحمت بھی کیوں کریں؟ یہ سب اس کو زندہ رکھنے کی ترکیبیں ہیں' لہٰذا جو مر گیا وہ ہمیشہ کے لیے مر گیا! اور گاؤں میں بے شمار مرے ہوئے لوگ ہیں' وہ مردے کو دفنادیں گے' تم میرے ساتھ آؤ!"

مچھیرا ایک لمحے کو تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اس کو متذبذب دیکھ کر حضرت عیسیٰ نے کہا؛ " شاید میرا اندازہ غلط تھا کہ تم اپنا پرانا جال چھوڑ سکتے ہو!" مچھیرا ایک لمحے کو رکا اور پھر حضرت عیسیٰ کے پیچھے چل پڑا۔ حضرت عیسیٰ نے کہا" تم واقعی ایک باہمت آدمی ہو' اگر تم مردے کو نظر انداز کر سکتے ہو تو تم یقیناً زندہ رہ سکتے ہو"

حقیقت بھی یہی ہے کہ جو ماضی میں مر چکا اسے بھول جاؤ!

آپ استغراق میں بیٹھ کر ہمیشہ یہی کہو گے کہ کیفیت طاری نہیں ہوتی' خیالات کی یلغار جاری رہتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خیالات کبھی اس طرح حملہ آور نہیں ہو سکتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کبھی آپ نے بھی ان کا پیچھا چھوڑا؟ آپ خود تو ہمیشہ خیالات میں غرق رہتے ہو' وہ کیسے قصوروار ہو سکتے ہیں؟ اگر ایک آدمی ایک کتا پالتا ہے' اس کو کھلاتا پلاتا ہے' اس کو گھر میں باندھ کر رکھتا ہے' اور ایک دن اچانک اسے کھول کر گھر سے باہر نکال دیتا ہے' پھر وہ بار بار اسکے پاس واپس آتا ہے تو کیا وہ کتا قصوروار ٹھہرایا جائے گا؟

آپ نے کب سے یہ کتا پالا ہوا ہے' اس کو سدھایا ہے' اس سے محبت کی ہے' اس کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں' اس کے گلے میں پٹا باندھ کر اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ پھر ایک دن اچانک آپ نے استغراق میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور کتے سے کہتے ہو دفع ہو جاؤ؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے' غریب کتے کے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا؟ لہٰذا وہ ادھر ادھر ایک چکر لگا کر پھر آپ کے پاس آ جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہے ہیں' لہٰذا آپ جتنا اس کو باہر بھگاتے ہیں اتنا ہی وہ اس کھیل میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور اتنا ہی وہ آپ کے پاس آتا رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے مالک کو کوئی نیا کھیل سوجھا ہے اس لیے وہ خوشگوار موڈ میں ہے' اس لیے وہ اس کھیل میں اور زیادہ دل چسپی لیتا ہے۔

آپ میرے پاس آ کر شکایت کرتے ہیں کہ خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ بھلا کیسے پیچھا چھوڑ سکتے ہیں؟ آپ نے اپنے خون سے ان کو پروان چڑھایا ہے۔ خود اپنے ساتھ ان کو باندھ کر رکھا ہے۔ اپنے نام کا پٹا ان کے گلے میں ڈالا ہوا ہے۔ کسی کو ذرا یہ کہہ دو کہ تم جو کچھ سوچ رہے ہو وہ غلط ہے...... وہ آپ کے اوپر الٹ پڑے گا...... کہ تمھارا کیا مطلب ہے؟ یعنی میری سوچ غلط ہے؟ میرے خیالات کبھی غلط نہیں ہو سکتے" لہٰذا تمھارے نام کا پٹا پہنے ہوئے تمھارے خیالات تمھیں ہی واپس مل جائیں گے۔ آپ کے خیالات کو کیسے معلوم ہوگا کہ آپ استغراق کی کوشش میں ہیں؟ ایسی صورت میں ان کو کہتے ہو کہ دفع ہو جاؤ؟ اس طرح تو وہ بھی دفع نہیں ہو سکتے۔

ہم خیالات کی پرورش کرتے ہیں' اور ماضی کے خیالات کو بھی پالتے رہتے ہیں۔ ان کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں' اور پھر ایک روز' اچانک' یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارا پیچھا

چھوڑ دیں؟ آپ ایک دن میں ان سے نجات نہیں پا سکتے' ان کو تقویت پہنچانے سے باز آنا پڑے گا۔ ان کا تعاقب چھوڑنا پڑے گا۔

اگر آپ اپنے خیالات سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انکو "میرا خیال" کہنا ترک کرنا پڑے گا' جس چیز کو آپ اپنا کہہ رہے ہیں اس سے دستبردار ہونا کیسے ممکن ہے؟ اگر آپ خیالات سے نجات چاہتے ہیں تو ان میں دلچسپی لینا چھوڑ دیجیے۔ جب تک آپ ان کی طرف توجہ دیتے رہیں گے تب تک وہ آپ سے دور کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان کو آپ کی تبدیلی کا علم کیسے ہوگا اور یہ کہ اب آپ کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ بات وہ کیسے جانیں گے؟

خیالات ہمارے ماضی کی یادیں ہیں' ان کا اپنا رابطے کا ایک نظام ہے' اور ہم ان کے تسلسل کو توڑنا نہیں چاہتے۔ آپ کو اپنے خیالات سے ترکِ تعلق کرنا پڑے گا۔ جو گذر گیا اس پر خاک ڈالو' ان کو زندہ رکھنے کی کوشش مت کرو' مگر اس کے برعکس ہم ان کو زندہ رکھنے پر مصر ہیں۔

یہ بھی مرنے کے ہنر کا ایک حصہ ہے۔ اس نکتے کو بھی ذہن میں رکھئے۔ اگر آپ مرنے کا ہنر سیکھنا چاہتے ہیں تو جو مر چکا اسے مر جانے دیں۔ جو گذر گیا وہ ماضی کا حصہ بن گیا' اسے ماضی ہی رہنے دیں' وہ اب موجود نہیں ہے' اسے جانے دیں۔ اس کو اپنے حافظے میں بھی جگہ نہ دیں۔ الوداع کہکر اسے رخصت کریں۔ گذشتہ کل گذر چکا ہے' اب اس کا کوئی وجود نہیں ہے...... مگر وہ اب تک ہم پر حاوی ہے۔

ایک مختصر سوال اور ہے: ایک دوست نے پوچھا ہے: "فریب میں مبتلا دماغ کونسا ہے؟ بہت الجھا ہوا دماغ کسے کہتے ہیں؟ دماغ کی صفائی سے کیا مراد ہے؟

اس کو سمجھنا ہوگا...... کیونکہ یہ استغراق کے لیے بھی مفید ہوگا اور مرنے کا ہنر سیکھنے کے لیے بھی۔ اس دوست نے بہت اہم سوال پوچھا ہے۔ اس نے پوچھا ہے "الجھا ہوا دماغ کونسا ہے"؟ مگر یہاں ایک غلطی کا احتمال ہے۔ ہم کہتے ہیں "منتشر دماغ" "الجھا ہوا دماغ" یہی غلطی ہے...... اور غلطی کیا ہے؟ غلطی یہ ہے کہ ہم دو الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ (الجھا ہوا) اور (دماغ) جبکہ درحقیقت الجھا ہوا دماغ نامی کوئی چیز موجود نہیں ہے' الجھن کی کیفیت بذاتِ خود دماغ ہے۔ الجھا ہوا دماغ نہیں ہے بلکہ دماغ ہی الجھن ہے۔

یہ بات نہیں کہ دماغ پرسکون ہو سکتا ہے' خلفشار ہی دماغ ہے۔ اور جہاں الجھن نہیں

وہاں یہ مطلب نہیں کہ دماغ کو سکون ہو گیا ہے...... پھر یہ ہے کہ دماغ لاپتہ ہو گیا ہے۔

مثلاً سمندر میں طوفان ہے لیکن سمندر پرسکون ہے۔ کیا آپ اس کو بے سکون طوفان کہیں گے؟ کوئی بھی اس کو بے سکون طوفان کہہ سکتا ہے؟ آپ اس کو صرف طوفان کہیں گے...... کیونکہ طوفان کا ہی دوسرا نام بے سکونی ہے۔ اور جب طوفان تھم جاتا ہے' کیا آپ کہیں گے کہ طوفان کو سکون آ گیا ہے؟ آپ یہی کہیں گے کہ طوفان تھم گیا ہے۔

دماغ کو سمجھنے کے لیے یہ بھی یاد رکھیے کہ الجھن کا ہی دوسرا نام دماغ ہے۔ سکون کم ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ذہن پرسکون ہو گیا' یوں سمجھئے کہ ذہن موجود ہی نہیں رہا' خالی الذہنی کے کیفیت نمودار ہو جاتی ہے۔ اور جب ذہن بالکل خالی ہو تو اس کیفیت کا نام ہے آتما۔ جیسے سمندر طوفان کے بغیر بھی موجود رہتا ہے۔ جب طوفان ختم ہو جاتا ہے تو خالی سمندر باقی رہ جاتا ہے۔ جب دماغ کی الجھنیں ناپید ہو جاتی ہیں تو جو کچھ باقی بچتا ہے وہ آتما یا آگہی ہوتا ہے۔

ذہن کوئی چیز نہیں ہے' یہ فقط الجھن کی کیفیت ہے' انتشار کی علامت ہے۔ ذہن کسی بات کا اہل نہیں ہے' یہ کسی صلاحیت کا حامل نہیں ہے۔ جسم ایک علیحدہ چیز ہے اور آتما علیحدہ' اور ان دونوں کے مابین انتشار اور الجھنوں کا نام ذہن ہے۔ سکون کی حالت میں جسم اور روح تو ہوتے ہیں' ذہن کہیں نہیں ہوتا۔

پرسکون ذہن نام کی کوئی شے موجود نہیں۔ اس بات کی ترجمانی کرنے میں ہماری ایجاد کی ہوئی زبان کا قصور ہے۔ ہم کہتے ہیں "صحتمند جسم" اور "غیر صحتمند جسم" یہ ٹھیک ہے۔ جسم صحتمند بھی ہوتا ہے اور غیر صحتمند بھی۔ لاغری' کمزوری یا بیماری دور ہو جانے کے بعد صحتمند جسم باقی رہ جاتا ہے۔ مگر اس نظریے کا اطلاق ذہن کے ضمن میں درست نہیں۔ کیونکہ صحتمند ذہن اور غیر صحتمند ذہن کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ذہن بذاتِ خود غیر صحتمند ہے' اس کا وجود ہی الجھن ہے' اس کا ہونا ہی ایک بیماری ہے۔

اس لیے اس کو الجھنوں سے بچانے کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ اس سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضرور امید افزا اور درست ہے۔ یہ جاننا چاہئے کہ یہ فنا کیسے ہوگا؟ اس سے نجات پانے کے کیا طریقے ہیں؟ یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ تمے کے لیے کیا تدبیر کی جائے؟

استغراق ایسا طریقہ ہے جو ذہن کو موقوف کرسکتا ہے' اس سے نجات دلاسکتا ہے' استغراق کے ذریعے ذہن سے باہر قدم رکھا جاسکتا ہے۔ استغراق کے ذریعے ذہن سے دور جانا ممکن ہے' استغراق کے ذریعے ذہن کو مفلوج کیا جاسکتا ہے' استغراق کا مطلب وہاں سے دور ہوجانا ہے جہاں الجھنیں ہیں' الجھنوں سے دور ہونا الجھنوں کو ساکت کردیتا ہے۔ کیونکہ ہماری موجودگی سے ہی الجھنیں جنم لیتی ہیں۔ اگر ہم وہاں سے دور ہوجائیں گے تو ان کا وجود بھی ختم ہوجائے گا۔

اس لیے ہم فرض کریں کہ دو آدمی جھگڑا کررہے ہیں۔ یا آپ مجھ سے جھگڑا کرنے کے لیے آئے ہیں اور لڑائی جاری ہے۔ اگر میں اس مقام سے ہٹ جاؤں تو جھگڑا کیسے جاری رہ سکتا ہے؟ جھگڑا ختم ہوجائے گا' کیونکہ وہ صرف اسی صورت میں جاری رہ سکتا ہے جب میں خود کو اس کا ایک حصہ بناؤں۔ ہم خود ذہنی الجھن میں گرفتار رہتے ہیں' ہم خود ہی وہاں موجود رہتے ہیں جہاں جھگڑا ہورہا ہے' جہاں بدامنی ہورہی ہے' ہم وہاں سے ہٹنا بھی نہیں چاہتے اور وہاں امن کے بھی خواہاں ہوتے ہیں۔ وہاں امن نہیں ہوسکتا' آپ بس یہ مہربانی کریں کہ وہاں سے ہٹ جائیں......اور بس!

جیسے ہی آپ وہاں سے ہٹ جائیں گے فضا پرسکون ہوجائے گی۔ استغراق آپ کے ذہن کو سکون بخشنے کا ذریعہ نہیں بلکہ آپ کو ذہن سے دور لے جانے کا طریقہ ہے۔ یہ الجھن کی لہروں سے بچ نکلنے کا طریقہ ہے۔

پچھلے سوال سے متعلق ایک ضمنی سوال اور ہے: بات سمجھنے کے لیے یہ بھی بہت معاون ہے: مستغرق ہونے اور استغراق میں کیا فرق ہے؟

اس میں وہی فرق ہے جو میں آپ کو سمجھاتا چلا آرہا ہوں۔ اگر کوئی شخص استغراق پر عمل کررہا ہے تو وہ اپنے منتشر دماغ کو پرسکون کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ وہ کیا کرے گا؟ وہ اپنے دماغ کو خاموش کرنے کی کوشش کرے گا' اور جب کوئی محوِ استغراق ہے تو وہ دماغ کو خاموش کرنے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ وہ اس کی پہنچ سے دور نکل جائے گا۔

اگر سورج اتنا گرم ہے کہ اس کی تپش جلائے دے رہی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص چھتری کھول رہا ہے ......اور چھتری کھلے آسمان کے نیچے دھوپ میں کھولی جاتی ہے۔ اور

پھر دھوپ سے بچنے کے لیے اس چھتری کے سائے میں یا کسی اور سایہ دار جگہ کھڑا ہوا جاسکتا ہے۔ دماغ کے اندر کوئی چھتری کھولنا ممکن نہیں' وہاں تحفظ کا طریقہ صرف خیالات ہیں' اور یہاں ان سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ایسا ہوگا کہ کوئی شخص آنکھیں بند کرکے دھوپ میں کھڑا ہو اور خیال کرے کہ وہ چھتری کے نیچے کھڑا ہے اور اب اس کو گرمی محسوس نہیں ہورہی۔ مگر گرمی تو اس کو بہرحال محسوس ہوگی۔ وہ شخص سورج کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ استغراق کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ایک اور آدمی دھوپ سے ہٹ کر گھر کے اندر جاتا ہے اور سکون میں آجاتا ہے۔ وہ سورج کو ٹھنڈا کرنے کی فضول کوشش نہیں کررہا' بس وہ اطمینان کے ساتھ گھر میں داخل ہوجاتا ہے......اور بس!

استغراق کا مقصد کوشش کرنا ہے۔ ذہن کو بدلنے کی کوشش ......اور مستغرق ہونے کا مطلب ذہن کو بدلنے کی کوشش نہیں بلکہ خاموشی کے ساتھ اس کے اندر داخل ہوجانا ہے۔

آپ کو ان دونوں کے مابین واضح فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا! اگر آپ مستغرق ہونے کی کوشش کریں گے تو استغراق کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ اگر آپ ایک شعوری کوشش کریں ...... بیٹھ جائیں ...... اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیں ...... اپنے آپ کو مجبور کریں ...... اپنے ذہن کو خاموش رہنے کی ترغیب دیں...... یہ سب بیکار جائے گا کیونکہ آخرکار یہ سب کون کررہا ہوگا؟ ترغیبات کون دے رہا ہوگا...... آپ کے علاوہ کوئی نہیں!

اور بات یہ ہے کہ آپ پہلے سے بے چین اور الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ اور خود کو پرسکون ہونے کی تلقین کررہے ہیں یعنی اپنے اوپر ایک اور سردرد مسلط کررہے ہیں! آپ ہر چیز سے بے نیاز' تن کر تیار بیٹھے ہیں۔ آپ جتنے اکڑتے جائیں گے اتنا ہی آپ کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور آپ اتنے ہی پریشان ہوتے جائیں گے۔ طریقہ یہ نہیں ہے! میں آپ کو استغراق کے لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ استغراق' سکون ہے۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا بس پرسکون ہونا ہے۔

بات سمجھنے کو یقینی بنائیں! ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعے کچھ اور وضاحت کا موقعہ دیں......اور اس کو حتمی معیار سمجھیں ایک شخص دریا میں تیر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ دوسرے کنارے پر پہنچنا چاہتا ہے۔ دریا میں دھار بہت تیز ہے' وہ اپنے بازو اور ٹانگوں کی مدد سے دریا پار کرنا چاہتا ہے۔ وہ تھک جاتا ہے' ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے ہیں' لیکن وہ تیرتا رہتا ہے۔ وہ شخص کوشش

کرر ہا ہے۔ تیرتے رہنا اس کی کوشش ہے' اسی طرح استغراق بھی ایک کوشش ہے...... پھر ایک ایسا آدمی ہے جو تیرنے کے بجائے بہہ رہا ہے۔ اس نے خود کو دریا کے حوالے کر دیا ہے' نہ وہ اپنے بازو چلا رہا ہے نہ ٹانگیں...... وہ تو بس دریا میں پڑا ہوا ہے۔ دریا بہہ رہا ہے اس لیے وہ بھی بہہ رہا ہے' وہ تیر نہیں رہا' بس بہہ رہا ہے' بہنے میں کوشش کو دخل نہیں' بہنا بلا کوشش کے بہنا ہے۔

میں جس استغراق کے بارے میں بات کر رہا ہوں وہ بھی بس بہنے کے مصداق ہے' جس میں تیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک آدمی کو تیرتے ہوئے اور ایک پتے کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھئے۔ بہتے ہوئے پتے کی خوشی و مسرت کا دنیاوی مسرت سے کوئی تعلق نہیں۔ پتے کو نہ کسی مزاحمت کا سامنا ہے' نہ کوئی پریشانی ہے' نہ کوئی رکاوٹ' نہ کوئی جھگڑا' اور نہ کوئی اور مشکل درپیش ہے۔ پتا بہت ہوشیار ہے...... اور اس کی ہوشیاری کیا ہے؟ اس کی ہوشیاری یہ ہے کہ اس نے دریا کو اپنی کشتی بنالیا ہے اور اب مزے کے ساتھ اس میں سواری کا لطف اٹھا رہا ہے۔ وہ پتا آمادہ اور تیار ہے کہ دریا اسے جہاں چاہے لے جائے۔ اس طرح گویا اس نے دریا کی قوت کو زیر کرلیا ہے۔ دریا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ وہ اس سے لڑ نہیں رہا' کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہا۔ بس بہے چلا جا رہا ہے۔

لٰہذا پتے نے دریا سے مکمل سمجھوتہ کرلیا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے......؟ ایسا اس لیے ہے کہ اب وہ کسی اور سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہے۔ محض بہے چلا جا رہا ہے' اور بس! دریا اس کو جہاں لے جانا چاہے' لے جائے۔ لٰہذا بہتے ہوئے پتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیا آپ اسی کی طرح زندگی کے دریا میں بہہ سکتے ہیں؟ ایک لحظہ کے لیے بھی تیرنے کا خیال نہیں آنا چاہیے' اس کا احساس تک نہیں' بلکہ ذہن ہی نہیں ہونا چاہیے۔

آپ نے ایک زندہ انسان کو تو دریا میں ڈوبتے ہوئے دیکھا ہوگا' جبکہ ایک مردہ انسان دریا کی سطح پر بہتا رہتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ ایک زندہ انسان ڈوب جاتا ہے لیکن مردہ انسان کبھی نہیں۔ وہ مرتے ہی سطحِ آب پر ابھر آتا ہے۔ فرق کیا ہے؟ ایک مردہ جسم مزاحمت نہیں کر سکتا۔ ایک لاش کچھ نہیں کرتی' اگر وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ سطح پر آجاتی ہے اور بہنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک زندہ انسان ڈوب سکتا ہے کیونکہ وہ زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ اسی کوشش میں وہ تھک جاتا ہے' اور جب وہ تھک جاتا ہے تو ڈوب جاتا ہے۔

اس کی جدوجہد اسے ڈبو دیتی ہے...... دریا نہیں۔ دریا ایک مردہ انسان کو نہیں ڈبوتی کیونکہ وہ کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ وہ چونکہ کوئی مزاحمت نہیں کرتا اس لیے اس کے ڈوبنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دریا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا' اس لیے وہ دریا کے ساتھ بہتا رہتا ہے۔

لٰہذا جس استغراق کی میں بات کر رہا ہوں وہ بہنے جیسی ہے' تیرنے جیسی نہیں۔ آپ کو صرف بہنا ہے۔ جب میں آپ کو جسم ڈھیلا چھوڑنے کے لیے کہتا ہوں تو میرا مطلب ہوتا ہے کہ جسم کو بہتا چھوڑ دو' پھر جسم پر قابو نہیں رہتا' پھر وہ اپنے آپ کو اپنے جسم کے ساتھ باندھ کر رکھنے کا پابند نہیں رہتا۔ آپ اس کو جانے دیں' بس آپ بہتے رہیں۔ پھر اسی طرح جب میں آپ کو سانسوں کو چھوڑ دینے کے لیے کہتا ہوں' پھر سانسوں کے ساحل پر پھٹکیں بھی نہیں۔ اسے بھی چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ بھی صرف بہتے رہیں۔ انجام کار کوئی کہاں پہنچے گا؟ جب آپ اپنے جسم پر سے اپنا اختیار ختم کر دیں گے تو خود اپنے اندر اتر جائیں گے' جسم پر اختیار حاصل کرلیں گے تو پھر سے باہر آجائیں گے۔

اگر کوئی کنارا پکڑے رہے گا تو دریا میں کیسے اترے گا؟ وہ تو کنارے پر ہی رہے گا۔ جو کنارا چھوڑے گا وہ سیدھا دریا میں چلا جائے گا۔ لٰہذا زندگی کا سرچشمہ' ایک آفاقی آگہی خود ہمارے اندر رواں دواں ہے' اور ہم کنارا پکڑے کھڑے ہیں...... اپنے جسم کا کنارا! اس سے پیچھا چھڑائیں......! تنفس سے پیچھا چھڑائیں......! خیالات سے پیچھا چھڑائیں...... پھر جب سب کنارے چھوٹ جائیں تو آپ کہاں جائیں گے؟ .... اب آپ آگہی کے اس چشمے پر بہنا شروع کر دیں گے جو آپ کے اندر بہہ رہا ہے۔ جو اپنے آپ کو اس چشمے پر بہنے کے لیے چھوڑ دے گا اس کی رسائی سمندر تک ہو جائے گی۔

یہ اندرونی چشمہ دریا کے مانند ہے' جو اس میں بہنا شروع کر دے وہ آخرکار سمندر تک پہنچ جائے گا۔ استغراق ایک اعتبار سے بہنا ہی ہے' جس کو بہنا آ گیا اس نے آفاق تک رسائی حاصل کرلی۔ تیرنا نہیں ہے! جو تیرے گا وہ بھٹک جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تیرنے والا اس کنارے سے اُس کنارے پر جا لگے گا۔ ایک غریب آدمی کافی دیر تک تیرنے کے نتیجے میں امیر تو ہو سکتا ہے...... اس سے زیادہ کچھ نہیں! بہت زیادہ تیرنے کے بعد' ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھنے والا

ممکن ہے کہ دہلی میں کسی اونچی کرسی پر جا بیٹھے......اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

دریا کے کنارے آپ کو دریا سے باہر لیجائیں گے، جو کہ کناروں کا کام ہے، دوارکا میں واقع کنارہ بھی دریا سے اتنا ہی باہر ہے جتنا کہ دہلی کے کسی دریا کا کنارہ! دونوں میں فرق کچھ بھی نہیں ہے! ایک تیرنے والا کنارے تک ہی جا سکتا ہے، لیکن بہنے والا کہاں جا سکتا ہے؟ کوئی کنارہ اس کو بہنے سے نہیں روک سکتا۔ کیونکہ اس نے خود کو موجوں کے حوالے کر دیا ہے۔ دھارا اس کو جہاں چاہے لیجائے۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ آخر کار وہ سمندر سے جا ملے گا۔

بنیادی مقصد بھی سمندر تک رسائی ہے۔ دریا سمندر کا روپ دھار لیتا ہے اور انسان کی آگہی آفاقیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ جب ایک قطرہ سمندر کی لامحدود وسعت میں گم ہو جاتا ہے، تو اس کو زندگی کے حقیقی معنیٰ، زندگی کی سچی خوشی اور زندگی کا لازوال حسن حاصل ہو جاتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مرنے کا ہنر ہی بہنے کا ہنر ہے، جو فنا ہونے کی خواہش رکھتا ہے وہ کبھی تیرتا نہیں......وہ کہتا ہے "میں تیار ہوں! مجھے جہاں چاہو لے جاؤ!"

چار دن تک جو کچھ میں نے کہا، اس کا حاصل یہی ہے۔ البتہ کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ میں صرف سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ انھوں نے بارہا اصرار کیا ہے کہ میں اپنے بارے میں بھی کچھ کہوں! صرف سوالوں کے جواب کافی نہیں! گویا سوالوں کے جواب کوئی اور دے رہا تھا۔

لٹکے ہوئے کپڑوں سے زیادہ کھونٹیاں اہم ہوتی ہیں۔ جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں کپڑے دکھائے جائیں، ان کو کھونٹیوں پر کیوں لٹکایا جا رہا ہے؟ مگر بھلا میں کھونٹیوں پر کیا لٹکا رہا ہوں؟ مجھے جو کچھ کہنا ہوگا میں اس کو آپ کے سوالات کی کھونٹیوں پر لٹکا دوں گا۔ لیکن کیا کریں کہ ہمارے ذہن ہی ایسے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ کسی سرکس کا مالک بندروں کو روزانہ چار کیلے صبح اور تین کیلے شام میں دیا کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز بازار میں کیلے مطلوبہ مقدار میں دستیاب نہیں ہو سکے، تو اس نے بندروں کو تین کیلے دیے۔ بندروں نے احتجاجاً تین کیلے لینے سے انکار کر دیا، اور چار کیلوں کا تقاضہ کرنے لگے۔ مالک نے کہا کہ ابھی وہ تین کیلے لے لیں، شام کو انھیں چار کیلے مل جائیں گے۔ بندر بدستور چار کیلوں پر اڑے رہے کیونکہ انھیں صبح کے وقت چار کیلوں کی عادت پڑی ہوئی

تھی۔ مالک نے زچ ہو کر کہا "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ میں بہر حال تمھارے سات کیلے پورے کر دوں گا۔

بندر بضد رہے اور کہنے لگے "ہمیں تمھارے حساب کتاب سے کوئی غرض نہیں، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم کو ہمیشہ چار کیلے دیے گئے اس لیے ہم کو ابھی اور اسی وقت چار کیلے درکار ہیں"۔

میرے دوست مجھ سے بار بار کہتے ہیں "مہربانی کر کے کچھ اپنے بارے میں بتائیں، سوالوں کے جواب مت دیں" میں ضرور کچھ کہوں گا" مگر میرے پیشِ نظر سوال یہ ہے کہ میں کیا کہوں؟ سوالات محض کھونٹیوں کے مانند ہیں، جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ ان کھونٹیوں پر لٹکا دوں گا۔ میں بولوں یا سوالوں کے جواب دوں آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ جو بولے گا وہ کون ہوگا؟ مگر وہ کہتے ہیں میں خود اپنے بارے میں کچھ بتاؤں، کیونکہ یہ وہ بندر ہیں جن کو چار کیلوں کی عادت پڑی ہوئی ہے۔

استغراق کے ہر دورانئے میں چار دور گفتگو کے اور چار سوال جواب کے ہوئے۔ اس بار یہ ہوا کہ آپ لوگوں نے گفتگو کے ادوار کو بھی سوال جواب کے دور میں بدل دیا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سات کیلوں کا حساب ذہن میں رکھیے، ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیں، ان کو علیحدہ علیحدہ گننے کی ضرورت نہیں کہ چار صبح ملے تین شام کو ملے یا اس کے برعکس؟ میں نے آپ کو سات کیلے دے دیے ہیں، اگر آپ ان کو گننے بیٹھ جائیں گے تو ممکن ہے کہ بنیادی نکتہ آپ کے ذہن سے نکل جائے۔ اس وجہ سے میں ایک بار آخر میں پھر کہوں گا کہ کیلے سات ہی ہیں۔

جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ سب میں نے کہہ دیا ہے۔

اوشو!

☆